خدا کہاں ہے؟

مرتبہ

منشی عبدالرحمن خان



عالمی ادارہ اشاعت علوم اسلامیہ۔ چہلیک۔ ملتان فون نمبر ۱۶۲۵

۷۸۶

سلسلہ تصنیف و تالیف ۴۵ء

خدا کہاں ہے؟

معلومات افزا اور بصیرت افروز مقالات
کا نادر مجموعہ

مرتبہ
منشی عبدالرحمٰن خان

شائع کردہ
عالمی ادارہ اشاعت علوم اسلامیہ۔ چہلیک ملتان۔
(فون نمبر ۳۱۶۷۵)

اشاعت اول . . . . اگست ۱۹۸۱ء

طابع . . . . روحانی پرنٹنگ پریس۔ ملتان

ناشر . . . . سعید احمد خان۔ ناظم ادارہ

تعداد . . . . گیارہ سو (۱۱۰۰)

قیمت . . . . ۱۴۵/- روپے [redacted]

انتساب

اُن کے نام

جو

دورِ جدید کے خداؤں

پر ایمان رکھتے ہیں۔

(منشی عبدالرحمٰن خان)

ترتیب

تفصیل

(۳)

ان دیکھی حقیقتیں عقائد اور سائنس

(۴)

وجودِ باری سائنس کی نظر میں

(۵)

صفاتِ ربانی سائنس کی نظر میں

(۱۱)

خدا، خلافت اور انسان

(۱۲)

خدا اور اس سے ہمارا تعلق

(۱۳)

دورِ جدید سے تازہ خدا

سے آپ اس کی اہمیت، افادیت کا بآسانی اندازہ لگا سکتے ہیں۔ اس کا مطالعہ نہ صرف آپ کے لیے بلکہ آپ کے اہلِ خانہ اور احباب وغیرہ کیلئے بھی مفید ثابت ہوگا۔ اسے خود پڑھنے کے علاوہ دوسروں کو پڑھا کر ثواب حاصل کریں۔ خواہشمند حضرات کو یہ سیٹ صرف قیمت لاگت پر مہیا کیا جائے گا۔

چہلیک - ملتان
۱۷ر جولائی ۱۹۸۱ء

احقر العباد
منشی عبدالرحمٰن خان

---

(۱)

کیا وجودِ باری ذہنی ارتقاء کی ایجاد ہے؟

(از ڈاکٹر میر ولی الدین ۔ پی ۔ ایچ ڈی)

تمہید یہ ایک مسلمہ حقیقت ہے کہ جب انسان کو کسی چیز کی حقیقت یا اس کے اسباب و محرکات کی کنہ معلوم نہ ہو تو وہ اس کے بارے میں قیاس آرائی شروع کر دیتا ہے اور اپنی عقل سے اس قیاس کو معقولیت کا جامہ پہنانے کی کوشش کرتا ہے اور اپنے اسی قیاس کو یقین باور کرنے پر اصرار بھی کرتا ہے اور جو شخص اس کے ایجاد کردہ قیاسی نظریہ کے خلاف لب کشائی کرتا ہے تو اسے نادانی یا کم عقلی سے تعبیر کرتا ہے ۔ یہی حال آج کل ان کور چشم نام نہاد فلاسفروں کا ہے جو ہستیٔ باری تعالیٰ کو بھی ارتقار ذہنی کا نتیجہ بتلاتے ہیں اور پھر لطف یہ ہے کہ اس بارہ میں ان کا کوئی متفقہ خیال نظر نہیں آتا ۔ بلکہ وہ مختلف قیاسات دوڑاتے ہیں ۔ گویا قیاسات اصولاً تو متفق نظر آتے ہیں کہ وجودِ باری کا یہ مسئلہ ذہنی ارتقار کا نتیجہ ہے مگر ارتقائی زاویہ فکر یعنی اس ترقی کے اسباب و منازل کی تفصیلات بالکل مختلف بلکہ بعض اوقات مخالف نظر آتی ہیں ۔ اس لیے اس کی جزئیات پر الگ الگ جرح تو محال ہے ۔ البتہ اجمالاً اصولی طور پر اس نظریہ کی تغلیط کے لئے مندرجہ ذیل دلائل کافی ہیں ۔

مسئلہ ارتقاء میں توسیع اس سے پہلے میں ان ارتقار والوں کی ایک لغزش کی طرف توجہ دلانا چاہتا ہوں اور وہ یہ کہ اوّل اوّل اس مسئلہ کو حیوانات کی مختلف انواع تک محدود رکھا گیا کہ یہ چیزیں اپنی ادنیٰ حالتوں سے

ترقی پاکر موجودہ صورتیں اختیار کئے ہوئے ہیں۔ مگر رفتہ رفتہ یہ ایک وسیع مسئلہ بن گیا ہے اور یہاں تک اس کو بڑھایا گیا کہ انسانی تاریخ و خیالات۔ توہمات و عقائد سب کے سب ارتقار کے ماتحت سمجھے جانے لگے اور اسی طرح وجود باری کے عقیدہ کی توجیہہ بھی مسئلہ ارتقار کے تحت ہونے لگی۔

ارتقار کے تین نظریات

چنانچہ بعض کا یہ نظریہ ہے کہ وجود باری انسان کے جذبۂ خوف کی ایجاد ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ جب انسان میں شعور پیدا ہوا۔ تو اس نے اپنے اردگرد ایک خوفناک ماحول پایا۔ ایک ایسا پر ہول۔ نیچر کہ مثلاً خونخوار درندے۔ خطرناک وبائیں اور قدرتی قحط۔ زلازل اور اسی طرح وہ فوق الفہم اور حیرت زا نظامِ شمسی جس نے انسان کے اندر حیرت و خوف کے جذبات پیدا کر دیئے اور ظاہر ہے کہ انسان ہمیشہ حیرت و خوف کے جذبات میں گھر کر زندگی بسر نہیں کر سکتا تھا۔ اسلئے اپنی ڈھارس و پناہ، سکون و اطمینان کے لئے اس کے نفس نے یہ تجویز کی ان خوفناک اور ڈراونی اشیاء کو لجاجت و خوشامد کے ذریعہ راضی کیا جا سکتا ہے۔ چنانچہ اس نے ان کی پوجا شروع کر دی اور پھر جوں جوں اس کا شعور ترقی کرتا گیا اور ذہنی رفعت اس کو حاصل ہوتی گئی۔ اسی نسبت سے وہ اپنے قدرتی جذبہ خوف سے پناہ ڈھونڈتا ڈھونڈتا ایک ایسے خدا کا قائل ہو گیا۔ جو تمام طاقتوں کا مالک ہے۔ اسی طرح ماہر نفسیات پروفیسر فرائیڈ کا ذہنی اختراع یہ ہے کہ چونکہ انسانی فطرت کی بنیاد نفسانیت و شہوت پر ہے اور ہر شخص اس دنیا میں آزادانہ طور پر ان خواہشات کو پورا نہیں کر سکتا اور جب دو افراد کی خواہش ٹکرا جائے تو لڑائی کی صورت پیدا ہو جاتی ہے۔ اسلئے وہ ان خواہشات

تکمیل صرف ایک ہی صورت میں کر سکتے تھے کہ جب افراد حتی الوسع ایک دوسرے سے امن رہتے ہوں اور امن کیلئے یہ امر ناگزیر ہے کہ انسان اپنی خواہشات کو دوسر کے لیے قربان کر دے اور یہ قربانی بھی اس وقت تک محال ہے جب تک کہ اس کا معاوضہ نہ ہو۔ لیکن چونکہ دنیا میں انسانی قربانی کا کوئی حقیقی معاوضہ نہ مل سکتا تھا اسلئے اس نے ایک خیالی معاوضہ (خدا) تجویز کیا اور یہی خیالی معاوضہ ارتقائی منازل طے ہوتا ہوا موجودہ صورت کو پہنچا اس سلسلہ میں تیرا نظریہ ماہرین اقتصادیات کی ایجاد ہے جو موجودہ تمدن سے سخت متنفر ہیں اور اس کی بنیادوں کو ہلا دینا چاہتے ہیں۔
ان کا کہنا یہ ہے کہ وجود باری دراصل امراء غرباء کی تمدنی کشمکش کا نتیجہ ہے کیونکہ ایک امیر اپنی امارت میں استقلال کے لئے یہی چاہتا ہے کہ غریب ہوشیار ہو کر اپنی حالت کو نہ بدلیں اور غرباء کو غافل رکھنے کیلئے ضروری ہوا کہ ان کے دل میں یہ خیال بٹھا دیا جائے۔ غربت و امارت وغیرہ امور مقدور سے تعلق رکھتے ہیں اور ایک نگران خدا ہے جو خوب جانتا ہے کہ نظام عالم کو چلانے کیلئے دولت کی تقسیم کس طرح ہونی چاہیئے۔ جو امیر و غریب میں تقسیم کر رکھی ہے۔ اور اسی تقسیم پر ہر انسان کو قانع رہنا چاہیئے۔
پس عدم مساوات کو قائم رکھنے اور امیر و غریب کی تفریق کے استحکام کی خاطر غرباء کو غافل رکھنے کیلئے امراء نے وجود باری کا یہ عقیدہ تجویز کیا ہے اور ابتداً یہ صرف خیالی تھا۔ لیکن بعد میں رفتہ رفتہ عادتاً و حقیقتاً انسانوں میں رائج ہو گیا۔

قیاسی نظریہ مندرجہ بالا تینوں نظریات پر یکجائی نظر ڈالنے کے بعد ناظرین نے محسوس کیا ہو گا کہ یہ صرف قیاسی نظریے ہیں۔ جن کا حقیقت سے کوئی تعلق نہیں۔ اس کی مثال ایسی ہی ہے۔ جیسے ایک شخص رات کے ایک دو بجے

گلی سے گزر رہا ہو۔ تو اس کے بارہ میں یہ قیاس کیا جاسکتا ہے کہ وہ کوئی ڈاکٹر ہے، یا سی۔ آئی۔ ڈی پولیس کا آدمی ہے۔ اور یہ بھی کہ وہ کوئی ایسا مریض ہو جو نیند کی حالت میں چلنا شروع کر دیتا ہے یا ممکن ہے۔ وہ کوئی ایسا شخص ہو جو گھر میں مریض کی حالت ناگفتہ بہ دیکھ کر ڈاکٹر کی امداد طلب کرنے جا رہا ہو۔ غرض مختلف قیاسات قائم کر کے بعض عقلی ثبوت بھی پیش کئے جاسکتے ہیں۔ اسی طرح ان ارتقاء والوں نے اپنے نظریات وقیاسات کے ثابت کرنے کے لئے ان لوگوں کے حالات زندگی سے استدلال کیا ہے۔ جن کا مذہب ایک مسخ شدہ حالت میں ہوتا ہے۔ ظاہر ہے کہ ایک بگڑے ہوئے مذہب پر قیاس آرائی شروع کر دی جاوے تو اس سے غلط نتائج اور فاحش نظریات ہی قائم کئے جاسکتے ہیں۔ اور یہی ان کی بنیادی لغزش ہے۔ ہاں اگر وہ اپنے نظریات کو انبیاء کرام کی زندگیوں پر چسپاں کر کے دکھلاتے جو دراصل مذہب کے بانی ہیں تو ایک حد تک قابل قبول ہوتے۔ مگر انہوں نے ایسا نہیں کیا اور اسی بنیادی غلطی کے باعث ان کے نظریات وقیاسات محض خیال آرائی ہی ثابت ہوتے ہیں اب میں اس اصولی غلطی سے آگاہ کرنے کے بعد مندرجہ بالا ہر سہ قیاسات پر الگ الگ مگر اجمالاً تنقیدی نظر ڈالوں گا

وجودِ باری اور خوف

جو لوگ یہ خیال کرتے ہیں کہ ہستی باری کا وجود جذبۂ خوف وحیرت کا نتیجہ ہے۔ اس لئے صحیح نہیں کہ اگر وجودِ باری کا عقیدہ خوف کا نتیجہ ہوتا ہے تو اس عقیدہ کے بانی انبیاء سب سے زیادہ بزدل ہوتے اور دنیا کی مادی قوتوں سے خوف کھاتے۔ لیکن کیا یہ حقیقت نہیں کہ وہ اس عقیدہ کی تبلیغ وتلقین اور اس کے قیام کے سلسلہ میں اپنی جان وآبرو کو خطرہ میں

ڈالتے رہے ہیں۔ اور دنیا کا کوئی خطرہ اور دنیا کا کوئی خوف ان کے پائے استقلال کو متزلزل نہ کرسکا اور اسی طرح اگر عقیدہ مختلف اوہام کی ایجاد ہے۔ تو انبیاء کرام کو سب سے زیادہ توہمات میں گرفتار ہونا چاہیئے تھا۔ اور سب سے زیادہ شکوک و شبہات کا شکار بننا چاہیئے تھا۔ مگر اس کے برعکس اشد ترین مخالف اور مذہب کا انکار کرنے والے بھی اس بات کی شہادت دیتے ہیں کہ ان کی زندگی حق الیقین کے اس بلند و بالا اور مستحکم چٹان پر قائم رہتی ہے جس سے دنیا بھر کی مخالفتیں، سارے خوف اور اوہام ٹکرا کر پاش پاش ہو جاتے ہیں۔ اسی طرح اگر یہ عقیدہ خوف کا لازمہ تھا۔ تو پھر عقل یہ کہتی ہے کہ جوں جوں ہم کسی نبی کے قرب زمانہ کی طرف قدم بڑھاتے جائیں۔ اسی نسبت سے اوہام گھٹتے ہوئے نظر آنے چاہئیں۔ مگر یہ امر واقعہ ہے کہ نبی کے اپنے زمانے اور نبی کے قریب زمانہ میں توہمات کا نام و نشان نہیں ہوتا بلکہ ہوتا یہ ہے کہ جوں جوں ایک نبی کے زمانے سے دور ہوتے جائیں گے اسی قدر توہمات اور شکوک و شبہات میں اضافہ ہوتا جائے گا۔ مثلاً آج مسلمانوں میں قبر پرستی۔ پیر پرستی۔ تعویذ پرستی اور جنتر پرستی پائی جاتی ہے۔ اسی طرح دوسرے مذاہب میں شجر پرستی۔ آفتاب پرستی اور ستارہ پرستی وغیرہ غلط اور خلاف مذہب عبادات رواج پذیر ہو گئی ہیں۔ تو ایسے مسخ شدہ مذہب اور گم گشتہ راہ اہل مذاہب کے خیالات و عقائد فاسدہ اور اوہام باطلہ سے استدلال کرنا عقل مندی کا مذاق اڑانا ہے۔ اور یہ نتیجہ نکالنا کہ اس طرح خدا پرستی بھی جذبۂ خوف کی ایجاد کردہ ہے۔ قرین انصاف نہیں۔ پس انبیاء جو وجودِ باری کا عقیدہ دنیا میں پھیلاتے ہیں۔ اگر جذبۂ خوف سے متاثر ہو کر اس کی تلقین کرتے ہوتے تو خود بھی بزدل ہوتے اور مختلف اوہام اور

شکوک و شبہات، توہمات میں سب سے زیادہ گرفتار رہتے اور ایسی باتوں کی اشاعت و رفعت پر زور دیتے اور پھر ان کے قریب زمانہ میں بھی ایسی باتیں رواج پذیر تھیں مگر واقعات اس کے بالکل برعکس ہیں نہ نبی کی زندگی ان چیزوں میں بسر ہوتی ہے اور نہ نبی کے فوراً بعد یہ چیزیں نظر آتی ہیں۔ بلکہ جن کے دل مذہب سے برگشتہ ہوتے ہیں۔ وہ ان توہمات میں گرفتار نظر آتے ہیں اور ایسے لوگوں کے طرزِ عمل سے استدلال کرتے ہوئے وجود باری کو بھی خوف کا نتیجہ قرار دینا انتہائی نادانی ہے۔

فرائیڈ کا نظریہ اسی طرح یہ قیاس کہ جذباتی کشمکش میں توازن برقرار رکھنے کا علاج اور دوسروں کی خاطر قربانی کرنے کا خیال معاوضہ خدا کی صورت میں تجویز کیا گیا ہے۔ بایں وجہ باطل ہے کہ اگر یہ خیال درست ہوتا تو سب سے زیادہ انقباض طبیعت اور جذباتی کشمکش انہی لوگوں میں نظر آتی جو وجود باری کے ناشر تھے۔ کیا کوئی کہہ سکتا ہے کہ انبیاء میں ان کی عمر کے کسی حصہ میں بھی ایسا انقباض یا ایسی کشمکش پائی جاتی ہے؟ ہرگز نہیں۔ بلکہ اس کے برعکس نبی اپنے بچپن و جوانی۔ ادھیڑ عمر اور بڑھاپے میں سکینت کی ایک حسین تصویر ہوتے ہیں۔ چنانچہ کسی بھی نبی کی زندگی پہ نظر ڈالو۔ سکینت ہی سکینت پاؤ گے۔ ان کو اپنی خواہشات سے کبھی جنگ نہیں کرنی پڑی اور بالفرض ایک نبی اپنے بڑھاپے میں وجود باری کے عقیدہ میں راسخ ہو کر انقباض طبیعت اور جذباتی کشمکش فرد کر چکا تھا تو کم از کم جوانی میں یہ باتیں اس میں موجود ہوتیں لیکن ایسا ہرگز نہیں ہوا۔ اور اسی طرح وجود باری انقباض و کشمکش جذبات کی ایجاد ہوتا تو ان انبیاء کی تعلیم میں کبھی کوئی ربط و نظم نہ پایا جاتا۔ اور ان کی ساری باتیں مجنونانہ ہوتیں لیکن معاملہ برعکس ہے۔ ان کی تعلیم اور ان کے احکام انتہائی

دانائی سے پُر ہوتے ہیں۔ حتیٰ کہ دنیا تمدنی و علمی اور سیاسی و معاشی امور میں اپنی ساری دانائی انبیاء سے ہی لیتی ہے۔

عدم مساوات کا نظریہ

اسی طرح ماہرین اقتصادیات کا یہ کہنا کہ وجود باری کا تصور عدم مساوات کو جاری و قائم رکھنے کیلئے معرض وجود میں آیا۔ مذہب پر صریح الزام ہے۔ کاش اگر وہ انبیاء کے حالات زندگی اور مخلوق کے ساتھ ان کے سلوک کو ایک ادنیٰ نظر سے بھی دیکھتے تو کبھی ایسا قیاس نہ کرتے اور اگر بالفرض ان کا یہ قیاس صحیح ہوتا تو پھر انبیاء کو سب سے زیادہ عدم مساوات کا حامی ہونا چاہیئے تھا کیونکہ وہ اس عقیدہ کے بانی تھے۔ مگر اس کے برعکس وہ عدم مساوات کے خلاف ایک زبردست محاذ قائم کر کے ایک ایسا معاشرہ قائم کر جاتے ہیں۔ جس میں دنیوی ثروت و امارت کو کوئی امتیاز حاصل نہ ہوتا۔ وہ ایسی تعلیم اور ایسے احکام پیش کرتے ہیں۔ جس کے نتیجہ میں امارت و ثروت کو استقلال و دوام حاصل ہو ہی نہ سکتا۔ اس سلسلہ میں میں انبیاء کی اقتصادی تعلیم سے درگزر کرتے ہوئے۔ اس نظریہ کے قائلین کی توجہ اسلام کے اقتصادی نظام اور معاشی اصول کی طرف دلانا چاہتا ہوں۔ ذرا غور فرمائیے کہ کیا اسلام نے اپنی عبادات اور تہذیب و تمدن کی بنیاد مساوات پر قائم نہیں کی۔

کیا اس نے معیار تکریم اور درجۂ تفوق امارت و ثروت اور دنیوی جاہ و حشمت کے بجائے تقویٰ و خدا ترسی کو قرار نہیں دیا؟

اسلام میں سود کا امتناع۔ ایتاء زکوٰۃ کا حکم جو دراصل سرمایہ پر مستقل بھاری ٹیکس ہے اور اسی طرح قانون وراثت جو دولت کو صرف ایک شخص کی تجوری میں بند

نہیں رکھتا اور اسی طرح نظام صدقہ وخیرات سے متعلق احکام، کیا عدم مساوات اور امیر وغریب کی تفریق کو مٹانے کے لئے کامیاب علاج اور یقینی تریاق نہیں۔

علاوہ ازیں اگر امرا ہی وجود باری کے موجد ہوتے تو کیا وجہ ہے کہ جب بھی خدا کی توحید کو قائم کرنے کیلئے کوئی نبی کھڑا ہوتا ہے تو امرا ہی سب سے زیادہ اس کی مخالفت پر تل جاتے ہیں۔ اور غربا اس کی تائید میں پیش پیش نظر آتے ہیں۔ حالانکہ ہونا یہ چاہیئے تھا۔ جب بھی کوئی خدا منوانے والی تحریک دنیا میں اٹھتی تو تمام امرا کی تائید اس کو حاصل ہوتی۔ مگر امر واقعہ یہ ہے کہ امرا تو پیچھے رہ جاتے ہیں اور غربا اس تحریک کی اشاعت میں تن من دھن سب کچھ نچھاور کر دیتے ہیں اور پھر لطف یہ کہ عام طور پر خدا منوانے کے لئے ایک غریب ہی مبعوث ہوتا ہے۔ جس کے پاس کوئی دولت و ثروت عموماً نہیں ہوتی۔ پس ماہرین اقتصادیات کا یہ کہنا کہ عدم مساوات اور امیر وغریب کی تفریق اور اقتصادی برتری کے قیام کی غرض سے امرا کی طرف سے وجود باری کا عقیدہ معرض وجود میں آیا۔ صریحاً غلط ہے۔

یہ عقیدہ الہامی ہے اب آیئے! میں آپ کو بتاؤں کہ یہ عقیدہ دنیا میں کیسے قائم ہوا۔ اور کن کے ذریعہ پھیلا؟ ناظرین نے محسوس کیا ہوگا کہ ان لوگوں کے ہر سہ قیاسات کتنے بودے اور کمزور ہیں جو تار عنکبوت سے زیادہ وقعت نہیں رکھتے۔ ان کی یہ لاحاصل کوشش اور بے جا اصرار ہے کہ وہ اس عقیدہ کو ذہنی ارتقار کی ایجاد ثابت کرنے کے درپے ہیں۔ اگر وہ قدیم سے قدیم اقوام کے عقائد اور بعد میں آنے والی قوموں کے عقائد کا موازنہ کریں تو ان کو معلوم ہو کہ ان میں کوئی نمایاں فرق نہیں۔ بلکہ ایسی مماثلت نظر آتی ہے جو ایک انسان کو ورطۂ حیرت

انسان ۔ جانور اور پودے بڑھتے ہیں ۔ لیکن ان میں وہ بڑھائی نظر نہیں آتی ۔ اسی طرح سورج موجود ہے ۔ لیکن انسان بغیر کسی چیز کا سہارا لیئے اس کی طرف نہیں دیکھ سکتا ۔ الغرض بہت ساری چیزیں ایسی ہیں جن کو انسان کے حواس خمسہ برداشت نہیں کر سکتے اور دیکھتے ! اس دنیا کے حواس خمسہ کے ذریعے تو صرف مادی اشیاء معلوم کئے جا سکتے ہیں ۔ خدا یا بعد از مرگ کے حالات معلوم کرنے کے لئے بعد از مرگ کی دنیا کی نظر کی ضرورت ہے ۔ جس طرح اس دنیا میں آنکھیں بہت ساری مخلوق کو دیکھنے سے عاجز ہیں ۔ لیکن خوردبین لگانے سے وہ ان کو دیکھنے کے اہل بن جاتی ہیں ۔ اس طرح خدا اور بعد از مرگ کے حالات دیکھنے کے لئے اس دنیا کی نظر اور ذہن درکار ہے اور بفرض محال اگر ان مادی آنکھوں کو خدا یا بعد از مرگ کے حالات دکھا بھی دیئے جائیں ۔ تو ان کی روشنی ختم ہو جائے گی ۔ یہی تو وجہ تھی کہ حضرت موسیٰ کو مشورہ دیا گیا تھا کہ وہ خدا کو نہیں دیکھ سکتے حضرت موسیٰ علیہ السلام کیا پہاڑ بھی خدا کے نور کی ایک جھلک برداشت نہ کر سکا ۔

مثال کے طور پر ایک ریڈیو اس طرح بنایا گیا ہے کہ وہ صرف ۹/۷ واٹ کی بجلی برداشت کر سکتا ہے ۔ اور اس سے وہ کام کرتا ہے ۔ اب اگر اس میں ۲۲۰ واٹ کی بجلی چھوڑ دی جائے تو ریڈیو کی ساری مشینری جل جائے گی ۔ یہی حال انسان کا بھی ہے ۔ وہ اپنی مادی قوتوں سے بہت ساری غیر مادی اشیاء معلوم نہیں کر سکتا ۔)

وزیر موصوف امام صاحب سے مخاطب ہو کر کہنے لگا ۔ تم اس کو درد

پس یہ شدت مخالفت خود ثبوت ہے اس امر کا اس عقیدہ کے ساتھ ارتقاد کا کوئی تعلق نہیں ذہنی ارتقاد نے اس مسئلہ کو ایجاد نہیں کیا۔ بلکہ بذریعۂ الہام انسانی ذہن میں اس کو بٹھایا گیا ہے۔ اور یہی وجہ ہے کہ وجود باری کا عقیدہ قدیم سے قدیم اور نئی سے نئی قوم میں پایا جاتا ہے۔ اور پھر من حیث المجموع اس کی ذات و صفات کے بارہ میں یکساں خیال موجود ہے۔ پس یہ ہم آہنگی اور اس عقیدہ کے قیام میں انبیاء کی شدید مخالفت اور ان سے یکساں سلوک اور ان دانا و فہیم اور پاک ہستیوں کی ثقہ شہادت اور اسی قسم کے شواہد و نظائر از قبیل نشانات و پیش گوئیاں مسئلہ وجود باری کے ارتقائی نہ ہونے اور الہامی ہونے پر کافی دلیل ہیں۔

واستعجاب میں ڈالنے کیلئے کافی ہے ۔ اور اس مماثل عقیدہ کو ہر دور میں بعض مخصوص و معین ہستیوں نے قائم کیا ۔ اور انہی پاک ہستیوں کی شہادت و تاثیر سے اس زمانہ کے لوگوں نے قبول کیا ۔ اور پھر حیرت یہ کہ ان معین و مخصوص ہستیوں کا زمان و مکان بالکل مختلف ۔ ان کی ایک دوسرے سے ملاقات کوئی ثابت نہیں کر سکتا ۔ الا ماشاء اللہ انہوں نے ایک ایسی مماثل اور متوازن تعلیم دنیا کے سامنے پیش کی جس نے بعد میں چل کر ایک عظیم انقلاب کی صورت اختیار کی ۔ ذرا غور فرمایئے کہ کیا کسی ذہنی اختراع سے پیدا شدہ عقیدہ جس کا حقیقت سے کوئی تعلق نہ ہو ۔ وہ عظیم انقلاب برپا کر سکتا ہے ۔ جو اس تعلیم نے برپا کر کے دکھلا دیا

بے شک انبیاء کی تعلیم ایک نئی چیز نظر آتی ہے ۔ مگر ان معنوں میں نہیں ۔ جس کو ہم ذہنی اختراع سے تعبیر کر سکیں ۔ دنیا میں کئی فلاسفر ایسے گزرے ہیں ۔ اور اب بھی موجود ہیں ۔ جو اپنے ذہن سے کئی نئے خیال پیدا کرتے ہیں ۔ اور پھر بعد میں اکثر غلط بھی ثابت ہوتے ہیں مگر کبھی ایسے فلاسفروں کی مخالفت نہیں کی جاتی جو بے سر و پا نظریات قائم کرتے ہیں اور اگر مخالفت کی بھی جاتی ہے ۔ تو نہایت معمولی لیکن کیا یہ حقیقت نہیں کہ انبیاء جو عقیدہ دنیا کے سامنے پیش کرتے ہیں ۔ اس کی کتنی شدید مخالفت کی جاتی ہے ۔ چھوٹا بڑا اور اپنا پرایا سبھی اس کی مخالفت پر تل جاتے ہیں ۔ اور انہی مخالف حالات میں کامیاب زندگی گزارتے ہوئے اپنا مشن قائم کر جاتے ہیں ۔ ہر نبی کا خطرناک مقابلہ کیا جاتا رہا ہے ۔ کیا کوئی بتا سکتا ہے کہ ارتقائی اشیاء و خیالات کی بھی کہیں اس درجہ مخالفت کی جاتی رہی ہے ؟ ہرگز نہیں ۔ مخالفت تو کجا ان کا احساس تک نہیں ہوتا کہ وہ چیزیں کب اور کس طرح اور کس کے ذریعہ معرض وجود میں آئیں ۔

وضع کئے جاتے ہیں اور معانی بعد میں ؟

تو اصلی بات یہ ہے کہ معانی پہلے وجود میں آتے ہیں اور الفاظ ان کے لیے بعد میں وضع کئے جاتے ہیں ۔

یہ بات اظہر من الشمس ہے کہ امور عدمیہ (وہ امور جن کا وجود نہیں ہوتا) کے لیے الفاظ وضع نہیں کئے جا سکتے ۔ مثلاً ٹیلیویژن ۔ فریج اور ٹیپ ریکارڈر جب ایجاد نہیں ہوئے تھے تو ان کے لیے نام بھی وضع نہیں ہوئے تھے ۔ ان چیزوں کی ایجاد کے بعد ان کے لیے مذکورہ نام تجویز کئے گئے ۔

ہم اپنی بات کی ثبوت میں یہ بھی کہہ سکتے ہیں کہ پہلے خدا نے فرشتوں کے سامنے اشیاء کو پیش کیا ۔ قرآن میں ہے ، وعلم آدم الاسماء کلہا ثم عرضہم علی الملٰئکۃ فقال انبئونی باسماء ھؤلاء ان کنتم صادقین قالوا سبحانک لا علم لنا الا علمتنا انک انت العلیم الحکیم ۔ قال یا آدم انبئھم باسمائھم (۲ : ۲۲) اور بعد میں حضرت آدم علیہ الصلوٰۃ والسلام کو ان کے نام بتا دیئے ۔ گویا کہ آیت کی روشنی میں معانی پہلے سے موجود ہوتے ہیں اور الفاظ یا نام ان کے لیے بعد میں وضع کئے جاتے ہیں ۔

اس تمہید کی روشنی میں اب اگر خدا پر ایمان نہ لانے والوں سے پوچھا جائے کہ لفظ اللہ ان کی زبان پر کہاں سے آیا اور یہ لفظ انسان کی لغت میں کیسے شامل ہوا ؟ اگر اللہ ایک امر عدمی ہے ۔ یعنی اس کا کوئی وجود نہیں ہے اور یہ بات ظاہر کہ جن اشیاء کا وجود نہیں ہوتا ان کے نام بھی نہیں ہوتے تو لفظ اللہ ساری لغتوں میں کیسے داخل ہوا ؟

(۲)

خدا کہاں ہے اور کس نے پیدا کیا ہے؟

ڈاکٹر سعید اللہ قاضی ۔ شعبہ اسلامیات ۔ پشاور یونیورسٹی

ضرورت و اہمیت

یہ مقالہ عبدالرحمٰن السنجری خطیب موصل (عراق) نے عربی میں ان لوگوں کے جواب میں لکھا ۔ جنہوں نے ان سے پوچھا: ابن اللہ ومن الذی خلقہ؟ اس کی اہمیت کے پیش نظر راقم الحروف نے مؤلف کی درخواست پر اس کا ترجمہ بمعہ ضروری کمی بیشی اردو میں کیا تاکہ خدا کے وجود کے بارے میں ذہنی کش مکش میں مبتلا طبقہ اس کو پڑھکر ذہنی سکون محسوس کر سکے ۔ دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ اس معمولی کوشش کے ذریعے خدا کے بارے میں ذہنی پریشانی میں مبتلا لوگوں کو ذہنی سکون نصیب کرے (آمین ثم آمین) ۔

الفاظ و معانی

الحمد للہ والصلوٰۃ والسلام علی رسول اللہ وآلہ واصحابہ اجمعین ۔

خدا پر ایمان لانا باعث راحت نفس ہے اور گمراہوں کے لئے سبب ہدایت ہے ۔ ناامیدوں کے لئے امید ہے ۔ اور ڈرنے والوں کے لئے اس میں امان ہے ۔ اگر آدمی کا خدا پر ایمان نہ ہوتا تو زندگی بہت پریشان کن ہوتی اور ناامیدی عام ہوتی ۔

ایمان باللہ عقلی، نفسی، اجتماعی، سیاسی اور لغوی ضرورت ہے ۔ لیکن یہ سوال بھی پوچھا جا سکتا ہے کہ ایمان باللہ لغوی ضرورت کیسے ہو سکتا ہے؟ تو سوال یہ ہے کہ معانی اوّل وجود میں آتے ہیں اور بعد میں ان کے لئے الفاظ وضع کئے جاتے ہیں یا الفاظ پہلے

میں اتنے مختلف اشیاء کو جنم دیتا ہے ؟ یہ صرف اللہ ہو سکتا ہے ۔ فتبارک اللہ احسن الخالقین ۔ یہ سب خدا کے کارخانے ہیں ۔ جن کے دروازوں پر مکتوب ہے ، صنع اللہ الذی اتقن کل شیئی ۔ (خدا کا صنع سب سے زیادہ مضبوط اور قوی ہوتا ہے)

مکھی

پھر اعجاز الٰہی دیکھئے فرماتے ہیں : ان الذین تدعون من دون اللہ لن یخلقوا ذبابا ولو اجتمعوا لہ وان یسلبھم الذباب شیئا لا یستنقذوہ منہ ۔ضعف الطالب والمطلوب ۔ ما قدروا اللہ حق قدرہ ۔ان اللہ لقوی عزیز ۔ (الحج ۔ ۴۰)

اللہ پاک نے ساری مخلوق کو چیلنج کیا کہ وہ ایک مکھی تو بنا دیں ۔ لیکن کوئی بھی ایک مکھی کی تخلیق نہیں کر سکتا ۔علم انسانی نے بڑے بڑے کارنامے انجام دیئے ۔یہاں تک کہ ستاروں پر بھی کمندڈالنے لگا ۔ اور انسان کو چاند پر قدم رکھنے کا اہل بنا دیا ۔ یہ بھی ممکن بنایا کہ کروڑوں لوگ گھروں میں بیٹھے ایک ہی آدمی کو ایک ہی وقت میں ٹیلیویژن کے پردے پر دیکھ لیں ۔ اسی طرح ایک ہی آدمی ایک ہی وقت میں ساری دنیا کے لوگوں کو ریڈیو کے ذریعے اپنی آواز پہنچا سکتا ہے ۔ اس سے بڑھ کر اور کیا علمی ترقی ہو سکتی ہے ۔علم انسانی نے ہر کام کو ممکن بنا دیا ۔ لیکن یہ حقیقت اب بھی اپنی جگہ موجود ہے کہ انسان ایک مکھی کو نہ بنا سکا ۔

خالق لایزال انسان کو یہ دکھانا چاہتا ہے کہ باوجود اس کے کہ اس نے اس کو بہت ساری نعمتوں سے سرفراز کیا ہے ۔لیکن وہ خدا کی قدرت کے سامنے پرکاہ کے برابر حقیقت نہیں رکھتا ۔ انسان کبھی بھی ایک گلاس پانی نہیں بنا سکتا ۔ دودھ سکا

توجواب یہ ہے کہ اللہ پاک نے پہلے انسان کو علم کی نعمت سے نوازا۔ پھر اس انسان نے ذات الٰہی سے انکار کر دیا اور یہ کس لئے ؟ اس لئے کہ لوگ عام طور پر اشیار محسوسہ کے ساتھ مانوس تھے اور غیر محسوس یعنی غائب اشیار کے ساتھ غیر مانوس اور یہ اس لئے کہ غائب یا غیر مانوس اشیاء اس کی نظروں سے غائب ہوتے ہیں ۔ اسی طرح دوسرے لغوی فلسفے میں کلمۂ کفر" دلیل مخالف کے طور پر بذات خود ایمان باللہ کی دلیل ہے ۔ کیسے ؟ لغت میں کفر کا معنی ستر یعنی چھپانا ہے ۔ جب کفر کے معنی چھپانا ہے ۔ تو ضرور کوئی ایسی شئے موجود ہے ۔ جس کو چھپایا جاتا ہے اور جس چیز کو چھپایا جاتاہے وہ ایمان ہے ۔

مطلب یہ کہ کلمہ" اللہ" اور کلمہ "کفر" دونوں ایمان باللہ پر دلالت کرتے ہیں ۔ اسی طرح نفس کفر بھی مؤمن ہے ۔ اس لئے کہ کفر کے معنی یہ ہیں کہ یہ کسی چیز کے وجود سے انکار ہے ۔ اور جب تلک کفر کا کلمہ" لا الٰہ" کے مفہوم کو ادا کرتا ہے ۔ اس کا مطلب یہ نکالا جائے گا کہ اللہ موجود ہے ۔ گویا کہ لفظ توحید ایمان باللہ پر دلالت کرتاہے ۔ اسی طرح اس کا مدمقابل لفظ" کفر" بھی ایمان باللہ پر دلالت کرتا ہے ۔

ایک دفعہ وجود باری تعالیٰ سے ایک انکار کرنے والے نے امام شافعیؒ سے پوچھا کہ خدا کے وجود کے بارے میں اس کے پاس کیا دلیل ہے ؟ امام صاحب نے جواب دیا کہ توت کے ورق کا ذائقہ ایک ہی ہوتا ہے ۔ اس کا رنگ بھی ایک، بُو بھی ایک، طبیعت بھی ایک، لیکن ریشم کا کیڑا اسے کھاتا ہے تو ریشم نکالتا ہے ۔ شہد کی مکھی کھاتی ہے تو شہد پیدا کرتی ہے ۔ جب اسے بکری کھاتی ہے تو دودھ دیتی ہے ۔ ہرن کھاتا ہے تو مشک نافہ بنتا ہے ۔ اب یہ کون ہو سکتا ہے ۔ جو توت کے ایک ورق

سے ایک گلاس پانی تو بناتا۔ لیکن ایسا کرنا اس کے لئے محال ہے۔ یہ کام صرف اور صرف خدا کر سکتا ہے۔

دیکھئے۔ انسانی علم کو دودھ کے اجزاء معلوم ہیں۔ وہ سارا مواد جانتا ہے جو دودھ میں موجود ہے۔ لیکن یہ جاننے کے باوجود کیا وہ دودھ کا ایک قطرہ بنا سکتا ہے؟ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں۔

نسقیکم مما فی بطونها ولکم فیها منافع کثیرۃ و منها تأکلون

(مومنون - ۲۲)

گویا کہ خدا انسان سے یہ کہتا ہے کہ انسان بہت عاجز ہے باوجود اس کے کہ اس کو بہت ساری قدرتیں دی گئی ہیں۔ اس لئے دودھ کا پیدا کرنا خدا کا دوسرا معجزہ ہے۔ اور یہ اس لئے کہ گائے بھینس کوئی مخصوص اشیاء نہیں کھاتے کہ آدمی کہے کہ ان سے دودھ بنتا ہے۔ وہ ساری چیزیں کھاتے ہیں اور ان ساری چیزوں سے دودھ ہی بنتا ہے۔ انسان کی بنیادی غذا دودھ ہے۔ لیکن علم انسانی اس کے بنانے سے عاجز ہے۔ علم انسانی دودھ کے اجزاء تو معلوم کرنے میں کامیاب ہوا۔ اپنے علم کی بدولت اچھی نسل کی گائے اور بھینس تو پیدا کیں۔ لیکن وہ اپنے علم کی بدولت دودھ کا ایک قطرہ پیدا کرنے میں کامیاب نہ ہو سکا۔

کہتے ہیں کہ ایک امریکی تجربہ گاہ میں دودھ بنانے کا تجربہ کیا گیا۔ تجربہ میں وہ سارا مواد اکٹھا کیا گیا جو دودھ میں موجود ہوتا ہے۔ ان سارے مواد کا مرکب بنا دیا گیا۔ جس کے نتیجے میں دودھ وجود میں آیا۔ پھر بیس چوہے لائے گئے۔ دس کو مصنوعی دودھ پلایا گیا اور دس کو اصلی۔ جن چوہوں کو مصنوعی دودھ پلایا گیا تھا۔ اگرچہ اس میں

ایک قطرہ نہیں بنا سکتا۔ مکھی نہیں بنا سکتا اور نہ مکھی کا ایک پر۔ مطلب یہ ہوا کہ یہ ڈینگیں مارنے والا انسان خدا کی قدرت کے سامنے بالکل عاجز ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں ؛

افرأیتم الماء الذی تشربون ۔ أأنتم انزلتموہ من المزن ام نحن المنزلون (الواقعہ۔۷۰)

پانی کا خالق

کہتے ہیں کہ ایک دفعہ نیویارک میں پانی کی سطح گر گئی۔ بارشیں بند ہو گئیں کنوئیں خشک ہو گئے اور پانی کا قحط پڑ گیا۔ لوگوں کو کہا گیا کہ پانی زیادہ استعمال نہ کریں۔ اس مسئلے کا حل ڈھونڈھ نکالنے کے لیے سائنسدان جمع ہو گئے اور مصنوعی بارش برسانے کی سکیم بنانے لگے۔ بہت سارے مصنوعی بادل بنائے گئے اور ان سے مصنوعی بارش برسانے کی حتی الوسع کوشش کی۔ لیکن کوئی مفید نتیجہ برآمد نہ کر سکے۔ اس سکیم پر دہ لاکھوں ڈالر خرچ کر گئے لیکن یہ ساری رقم ضائع ہو کر رہ گئی۔

دیکھئے ! پانی اکسیجن اور ہائیڈروجن کا مجموعہ ہے۔ یعنی وہ H_2O ۔ اکسیجن موجود ہے۔ ہائیڈروجن موجود ہے۔ اور ان دونوں کے ملنے سے پانی بنتا ہے اور یہ بہت معمولی عمل ہے۔ لیکن پھر بھی پانی کا خالق صرف خدا ہے۔ انسان اس کو نہیں بنا سکتا۔ مطلب یہ کہ علم انسانی قدرت الہیٰ کے سامنے عاجز ثابت ہوا۔

دیکھئے ! جو آدمی چاند پہ کمند ڈال گیا۔ وہ پانی کی ایک چھوٹی سی ندی نہیں بنا سکتا۔ آخر اتنا طاقتور انسان خدا کی قدرت کے سامنے کیسے بے دست و پا بن سکتا ہے۔ جب وہ یہ کہتا ہے کہ مجھے وقت دو تاکہ انسان بناؤں۔ حالانکہ وہ ایک گلاس پانی نہیں بنا سکتا۔ ہم چاہتے ہیں کہ انسان اپنے الیکٹرونی علم کے بموجب بشریت کے

چاک کرنے کی استطاعت دی ۔ اس کے بعد یہ کبھی بھی اس کے شایان شان نہیں کہ اپنے منعم حقیقی کے وجود سے انکار کرے ۔ اس لئے کہ اس کے وجود سے انکار درحقیقت اس کی نعمتوں سے انکار ہے اور اس کی توقع کسی بھی عاقل شخص سے محال ہے ۔

آئیے ان پانچ چیزوں کی طرف توجہ دیں ۔ جن کو اللہ پاک نے اپنے ساتھ مخصوص کر رکھے ہیں ۔ اللہ تعالےٰ فرماتے ہیں :۔

(۱) ان اللہ عندہ علم الساعۃ ۔ قیامت کا علم صرف خدا کو ہے ۔

(۲) وینزل الغیث ۔ بارش صرف وہ برساتا ہے ۔

(۳) ولیعلم مافی الارحام ۔ صرف وہی رحم مادر میں موجود شے کی حقیقت جانتا ہے ۔

(۴) وما تدری نفس ماذا تکسب غدا ۔ اور کوئی نفس نہیں جانتا کہ وہ کل کیا کرے گا ۔

(۵) وما تدری نفس بای ارض تموت ۔ اور کوئی نفس نہیں جانتا کہ وہ کہاں مرے گا ۔

مذکورہ بالا پانچ چیزیں ابھی تک علم خدا کے ساتھ مخصوص ہیں ۔ کسی بھی انسان نے ان کے بارے میں صحیح معلومات حاصل نہیں کی ہیں ۔

علم انسانی نے زمین و آسمان کی ابتدا کے بارے میں کچھ اندازے تو وضع کئے لیکن ان کی انتہا کے بارے میں اس کو کچھ پتہ نہ چل سکا ۔

قیامت کا علم صرف خدا کو ہے ۔ اسی طرح بارش کا علم بھی صرف خدا کو ہے ۔ کوئی بھی علم انسانی اس بادل کا رخ نہیں موڑ سکتا ۔ جس کے لئے اللہ تعالیٰ نے ایک خاص اندازہ مقرر کیا ہے ۔ جہاں بھی اللہ تعالےٰ نے بارش برسانے کا پروگرام بنایا ہے ۔ اس میں کوئی بھی شخص مداخلت نہیں کر سکتا ۔

علم نے ہر چند کہ ترقی کی ہے ۔ لیکن ابھی تک رحم مادر میں بچے کی حقیقت

دودھ کے سارے اجزا موجود تھے ۔ وہ سارے مرگئے اور جن دس کو اصلی دودھ پلایا گیا تھا ۔ وہ بڑھ گئے اور زندہ رہے ۔ اسی طرح علم انسانی بچوں کے لئے ایک قطرہ دودھ بنانے میں بھی ناکام ہوا ۔ ہاں جو دودھ آجکل بازاروں میں ملتا ہے ۔ یہ علم انسانی کا پیدا کردہ نہیں ہے ۔ وہ بھی خدا کے پیدا کردہ دودھ سے بنایا گیا ہے ۔ اس میں علم انسانی کا کوئی حصہ نہیں ہے ۔

یہ ساری چیزیں انسان کو بہانگ دہل یہ پتہ دیتی ہیں کہ اے انسان ! اپنے علم اور اپنی عقل پر اتنا نازاں نہ ہو ۔ تمہاری حقیقت کچھ بھی نہیں ۔ تم خدا کی قدرت کے مقابلے میں بہت ہی کمزور ہو ۔

علم انسانی نے ہر چند کہ ترقی کی ہے ۔ اس نے صرف خدا کی قدرتوں سے پردے چاک کئے ہیں اور اگر عقل سلیم موجود ہو تو اس انسان کا ایمان خدا پر اور بھی مضبوط ہو جاتا ہے ۔ اللہ پاک فرماتے ہیں :-

انما یخشی اللہ من عبادہ العلماء (فاطر ۔ ۲۸)

علم انسانی نے وہ حقائق اور قوانین واضح کر دیئے ۔ جو اللہ تعالیٰ نے اپنی کائنات میں ودلیعت کر رکھے ہیں ۔ علم نے کشش ثقل نہیں بنایا اور نہ اس نے آسمان اور زمین پیدا کئے اور نہ اس نے لوہے میں مقناطیسیت ودلیعت کر رکھا ہے اور نہ اس نے فضا کا وہ غلاف بنایا ہے ۔ جس میں ہم سانس لیتے ہیں ۔ اس نے نہ بجلی پیدا کی ہے اور نہ تیل اور نہ اس نے پانی میں بخارات بننے کا ملکہ رکھا ہے ۔ اس نے تو صرف وہ خاصیتیں اور قوانین ظاہر کئے ۔ جن کو اللہ تعالیٰ نے پیدا کیا ہے اور جن کی برکت سے انسان تسخیر کائنات میں مشغول ہے ۔ خدا نے انسان کو اشیاء کی حقیقتوں سے پردے

کہتے ہیں کہ لبنان کے ایک کروڑپتی امیل البستانی نامی ایک شخص نے اپنے لئے ایک مقبرہ بنایا۔ اپنی سالگرہ کے دن اپنے دوستوں سمیت وہاں جاتا۔ عیش و عشرت کرتا۔ کبھی کبھار دوستوں سے مذاق میں کہتا "میں آپ کے ساتھ بعد از مرگ بھی یہاں شراب پیوں گا۔ اور گپ شپ لگاؤں گا۔ لیکن اس کروڑپتی کی موت کیسی واقع ہوئی؟ ایک دن وہ ایک جہاز میں سفر کر رہا تھا کہ جہاز حادثے کا شکار ہو گیا اور سمندر میں گر کر تباہ ہو گیا۔ ساری سواریوں کی لاشیں ڈھونڈھ نکالی گئیں لیکن امیل البستانی کی لاش ہزاروں کوششوں کے باوجود ہاتھ نہ آسکی اور اس کی قبر ویسے خالی رہ گئی۔ گویا کہ اس کی قبر بزبان حال یہ کہہ رہی تھی کہ امیل البستانی!

لا تدری نفس بای ارض تموت۔ کوئی انسان نہیں جانتا کہ وہ کہاں مرتا ہے۔ دیکھئے عقل انسانی کا دائرہ کار بہت محدود ہے۔ ہم عقل سے یہ گزارش کرتے ہیں کہ اے عقل! ذرا عقل سے کام لو۔ تم تو ادراک کا ایک وسیلہ ہو۔ اسی طرح آنکھ بھی ادراک کا ایک وسیلہ ہے۔ اے عقل! دیکھئے۔ آپ کے معلومات کا دار و مدار تو صرف حواس خمسہ پر ہے۔ ان کے بغیر تو بہت کم کچھ کر سکتی ہے۔ اگر آنکھیں تم کو کسی چیز کے بارے میں معلومات فراہم نہ کریں تو پھر تم بے دست و پا ہو۔ پھر تو تو ان اندھوں کی عقل ہو۔ جنہوں نے ہاتھی نہیں دیکھا تھا۔ اور ان کے ہاتھ جب ہاتھی کے الگ الگ اعضاء پر لگے اور ان سے ہاتھی کے بارے میں پوچھا گیا۔ تو تُو نے معلوم ہے، ہاتھی کی کیا تعریف کی؟ تو نے اس کے کانوں کو ہاتھی کہا۔ اس کی ٹانگ کو ہاتھی کہا۔ اس کی سونڈھ کو ہاتھی کہا۔ یہ ہاتھی کی صحیح تعبیر تھی؟ ہرگز نہیں۔ جب حقیقت حال یہ ہے۔ تو پھر تو کیسے یہ دعویٰ کر سکتی ہے کہ جس چیز کا ادراک تو نہ کر سکو

سے غافل ہے۔

علم انسانی اپنے ارادے کے مطابق رحم مادر میں کسی قسم کا تصرف نہیں کرسکتا۔ کہتے ہیں کہ بوسٹن کے ایک ہسپتال میں بچے کی پیدائش سے پہلے اس کی نوعیت جاننے میں کامیابی حاصل کرلی گئی۔ مگر اس کے باوجود آیت کریمہ کا مطلب یہ ہے کہ رحم مادر میں بچے کے بارے میں صحیح معلومات صرف خدا کو ہیں اور اگر موجودہ سائنس کی روشنی میں نر یا مادہ کی پہچان ممکن ہو سکے تو یہ تو کبھی ممکن نہیں ہو سکتا کہ اس بچے کی شقاوت یا سعادت، نیکی و بدی کے بارے میں قطعی معلومات حاصل کر سکے۔

الازہر یونیورسٹی کے ایک شیخ " ویعلم ما فی الارحام " کی تفسیر میں لکھتے ہیں کہ اللہ تعالےٰ نے آیت میں لفظ " ما " استعمال کیا ہے۔ جو غیر ذوی العقول کے لیے استعمال ہوتا ہے۔ یعنی وہ کام جو بچے کا رحم مادر میں بننے سے پہلے یا رحم مادر میں نطفے کے قرار پانے کی ابتدا میں علم خدا کے ساتھ تعلق رکھتا ہے۔ اگر " ما " کی جگہ " من " استعمال ہو گیا ہوتا تو ملحدین کو اعتراض کا موقعہ ہاتھ آتا۔ لیکن خدا کو یہ معلوم تھا کہ علم انسانی ترقی کرے گا۔ اور " من " کے بارے میں معلومات حاصل کرتا رہے گا۔ لیکن " ما " کے بارے میں علم انسانی کچھ کام نہ کر سکے گا۔

اور " وما تدری نفس ماذا تکسب غدا " ابھی تک ایک حقیقت ہے علم ریاضی اور حساب نے اگرچہ بے انتہا ترقی کی ہے۔ لیکن رزق انسانی ابھی تک علم انسانی کی گرفت سے باہر ہے۔ اس پر صرف علم خدا محیط ہے۔

اسی طرح کسی بھی انسان کو یہ پتہ نہیں لگ سکتا کہ وہ کہاں مرے گا؟ اس کا پتہ صرف اللہ کو ہے۔ علم انسانی اس کے جاننے سے عاجز ہے۔

کائنات میں قدرت الہٰی کی بے انتہا نشانیاں موجود ہیں اور معدودے چند تک عقل انسانی کی رسائی ہے۔

ولعل فی النفس من آیاته
عجب عجاب لو تری عیناك

اور اگر عین انسانی میں دیکھنے کی استطاعت ہو تو نفس انسانی میں قدرت الہٰی کی عجیب عجیب نشانیاں ہیں۔

والکون مشحون باسرار اذا
حاولت تفسیرا انها اعیاك

اور سارا جہان پرازاسرار ہے۔ اگر تم اس کی تفسیر چاہتے ہو تو اس سے تم عاجز آ وگے۔

عقل انسانی مسلسل خدا کی سربستہ رازوں کو آشکارا کرنے میں لگی ہوئی ہے اس کی طرف قرآن کریم نے یوں اشارہ کیا ہے۔

سنریهم آیاتنا فی الافاق وفی انفسهم حتی یتبین لهم انه الحق اولم یکف بربك انه علی کل شیئ شهید۔ (فصلت - ۵۴)

مذکورہ آیت میں لفظ "سنریهم" کی تلاوت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی یونہی کی تھی۔ ہم بھی "سنریهم" پڑھتے ہیں اور ایک صدی بعد آنے والا شخص بھی اس کو "سنریهم" پڑھے گا۔ اس لفظ میں حرف "س" استقبال پر دلالت کرتا ہے جو لامتناہی ہیں۔ گویا کہ خدا کے سربستہ رازوں کا انکشاف تا قیامت جاری رہے گا۔ اس سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ ہر ایک عقل مند

اس کا سرے سے کوئی وجود ممکن نہیں ۔

اس لئے، اے انسان! جب تک عقل ادراک کا ایک وسیلہ ہے اور اس کی ادراک کا سارا انحصار حواس خمسہ پر ہے تو یہ اس بات کا ثبوت ہے کہ اس کا دائرہ کار بے حد محدود ہے اور اگر انسان عقل کی اس حقیقت کو ذہن میں رکھے تو یہ علم کی ایک بڑی مثال ہوگی ۔ اسلئے کہ علماء کہتے ہیں!

العجز عن الادراک الادراک ۔ جاننے سے عاجزی کا اظہار درحقیقت جاننا ہے

فلاسفہ یونان اپنی عقلوں کے فتنوں میں پھنس گئے ۔ انہوں نے کیا کیا؟ انہوں نے فلسفے کو دو حصوں میں بانٹ دیا ۔ مادی اور ماوراء مادی ۔ ماوراء مادی قسم کے فلسفہ سے تعلق رکھنے والے فلسفیوں نے بے انتہا بحث و مباحثے کئے ۔ لیکن ان سے کوئی خاص فائدہ برآمد نہ کر سکے ۔

ہم ان فلسفیوں سے کہتے ہیں ۔ آپ کو کس نے بتا دیا کہ ماوراء مادہ بھی کوئی شئے موجود ہے؟ آپ کو یہ اطلاع فطرت نے دی یا عقل صحیح نے ۔ تو ہم عقل سے کہتے ہیں کہ اے عقل! یہ اتنی لاف زنی کیوں کرتی ہو ۔ ہم آپ کی کمزوری پہلے ہی ثابت کر چکے ہیں ۔ ہم نے یہ بھی ثابت کیا کہ اگر کسی چیز کے بارے میں تم کو ادراک نہ ہو تو اس کا یہ مطلب نہیں کہ اس چیز کا سرے سے وجود نہیں ہے بلکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ اس چیز تک پہنچنے کے لئے تیرے پاس وسیلہ نہیں ہے ۔ کائنات پُر از اسرار ہے ۔ اور اسرار الٰہی کی کوئی انتہا نہیں ہے ۔ ایک شاعر نے کیا خوب کہا ہے ؎

لله فی الآفاق آیات لعل

اقلها هو ما الیه هداکا

پس ثابت ہوا کہ جب خدا کے وجود کا کوئی معارض نہیں ہے۔ تو وہ اصلی خالق ہے اور جب ان باطل خداؤں کے پاس کوئی پروگرام نہیں ہے تو یہ بہت سارے خداؤں کے وجود کی نفی کرتا ہے اور اس طرح بہت سارے معبودوں کا وجود باطل قرار پاتا ہے۔ یہ اس قوت کی بھی نفی کرتا ہے جو ماوراء ھذا الکون مانی جاتی ہے۔

آیئے۔ اب اس انسان کو مخاطب کرتے ہیں۔ جو خدا دیکھنا چاہتا ہے۔ یہ انسان بہت اچھی اچھی چیزیں بناتا ہے۔ یہ ساری اچھی اچھی چیزیں ضروریات زندگی قرار نہیں دی جاسکتیں۔ بلکہ یہ سامان تعیش ہے۔ خدا نے انسان کے ساتھ بہت ساری ضروریاتِ زندگی بھی پیدا کر دیں۔ ان میں سب سے زیادہ اہم ہوا۔ پانی اور خوراک ہیں۔

انسان جب چھوٹے چھوٹے گلاس بناتا ہے۔ تو کیا وہ اس بات کی استطاعت رکھتا ہے۔ کہ ان گلاسوں میں بڑھنے کی طاقت ودلیعت کر رکھے۔ ظاہر ہے اس کا جواب نفی میں ہے۔ اس لئے کہ انسان اپنی قدرت کے موافق عمل کرتا ہے اور خدا اپنی قدرت کے موافق۔ انسان یہ گلاس کیسے بناتا ہے؟ ضروری ہے کہ ریت موجود ہو۔ کارخانے موجود ہوں۔ اور پھر ریت یا مٹی میں پانی ڈال کر اس کا گاڑا بنا دیا جائے۔ ایک گلاس کے بنانے میں تو اتنے امکانات موجود ہیں۔ لیکن جب ہم اس کے سبب اول کی طرف متوجہ ہوتے ہیں تو ہم سبب کو بلا سبب پاتے ہیں۔ یہاں آکر ہماری عقل ماند پڑجاتی ہے۔ گلاس کے بنانے والے سے تو یہ سوال کیا جا سکتا ہے کہ گلاس کیسے بنتا ہے؟ وہ یہ جواب دے گا کہ صحرا سے ریت لانی پڑیگی۔ پھر اس کو کسی جگہ خمیر بنا کر رکھ دیا جائے گا۔ لیکن جب ہم صحرا چلتے ہیں اور ریت سے پوچھتے

آدمی کو چاہیئے کہ جب کبھی ایک ایسا نیا عمل وجود میں آتا ہے۔ جو اس کی درک میں نہیں آتا تو اس کے بارے میں وہ یہ رائے نہ دے کہ اس عمل کا سرے سے کوئی وجود نہیں ہے۔

قوت کی حقیقت

آیئے فلسفیوں کی طرف دوبارہ متوجہ ہوتے ہیں۔ فلسفیوں کو گویا کہ فطرت یا عقل سلیم سے یہ بات معلوم ہوگئی کہ ماورار مادہ بھی کوئی شئے موجود ہے۔ اگر وہ اس بات پر اکتفا کرلیں یعنی اگر فلاسفہ اس جہاں کے ماورار ایک قوت کے ماننے پر اکتفا کرلیں اور پھر اس قوت کو اجازت دیں کہ اپنے آپ کو ایک ایسے رسول کی وساطت سے آشکارا کرے جس کی تائید معجزات میں سے ایک معجزے سے ہوتی ہو تو اس کے نفس کو بھی آرام آگیا ہوتا اور ہمیں بھی اور اگر ایسا نہیں ہے تو پھر تو یہ بات ہوگی کہ قوت مثلاً فطرت (نیچر)، سورج اور وہ خدا جو لوگوں نے بزعم خود اپنے لئے بنا رکھے ہیں، نے اس جہاں کو جنم دیا ہے۔ اس قوت، جس نے اس دنیا کو جنم دیا ہے، نے کس طرح خدا کو یہ کھلی چھٹی دی کہ وہ اس کی پیدا کردہ جہاں پر ملکیت کا دعویٰ کرے۔ خدا اس "قوت" کو اپنے ہاتھ میں لیتا ہے اور کہتا ہے۔ "میں رازق ہوں اور میں معبود ہوں اور یہ "قوت" بالکل خاموش تماشائی بن بیٹھتی ہے۔ اس سے سب کچھ چھینا جاتا ہے۔ لیکن وہ بالکل بات نہیں کرتی۔ یہ "قوت" نہ اپنے کسی رسول کو بھیجتی ہے اور نہ خود حرکت میں آتی ہے۔ مدعی یعنی خدا کو اجازت دیتی ہے کہ وہ اس کی پیدا کردہ کائنات پر قابض ہوجائے۔ اب اس عاجز اللہ یعنی "قوت" کی کیا حقیقت رہ گئی کہ اس سے ہر چیز اس خدا نے لی۔ جس نے اس جہان کو پیدا نہیں کیا تھا۔ یہ "قوت" خاموش رہ جاتی ہے اور یہ نہیں کہتی کہ میں خالق ہوں۔

جسم انسانی میں خدا کی تخلیق کا اعجاز موجود ہے ۔ موت بھی ایک اعجاز ہے آیئے انسان کے دماغ سے ابتدا کر لیتے ہیں ۔

دماغ انسانی ہزار ملین خلیوں سے بنا ہے ۔ اس قدر معمولی جگہ ہزار ملین خلیوں کا تصور کر لیں ۔ اب یہ کون ہو سکتا ہے ۔ جو اس قدر معمولی جگہ پر اس قدر بڑی صنعت قائم کر لیتا ہے ؟

اگر ہم الیکٹرانی عقل بنانا چاہیں جو عقل انسانی کی قدرت میں ہو تو ہمیں ہزار ملین خلیوں کی ضرورت پڑے گی اور عقل انسانی اس کا تصور تک بھی نہیں کر سکتی انسانی عقل اس قدر وسیع نظام کو کیسے کنٹرول کر سکتی ہے ۔ اسی طرح انسان میں قوتِ ذائقہ ہے ۔ جو کسی چیز کے بارے میں دماغ کو اطلاع دیتی ہے کہ فلاں چیز میٹھی ہے ۔ کڑوی ہے یا کھٹی ہے وغیرہ ۔

69 اس طرح مختلف آوازوں کے سننے کیلئے دس ہزار ملین خلیے مصروف عمل ہیں ان خلیوں کی وساطت سے ہم ۔ انسان ۔ حیوان ۔ چھوٹے ۔ بڑے ۔ مرد اور عورت کی آوازوں میں تمیز کرنے کے اہل بن جاتے ہیں ۔

اسی طرح آنکھوں میں ایک سو تیس ملین خلیے کام کرتے ہیں ۔ اتنی سی چھوٹی سی چیز میں اللہ تعالےٰ نے اس قدر بڑی صنعت قائم کی ہے ۔ کیا یہ علمی حقائق اس بات کا تقاضا نہیں کرتے کہ ہم اس کے خالق حقیقی کے سامنے سربسجود ہوں ؟

مزید براں جب ایک گرم چیز جسم انسانی سے لگتی ہے تو بیس ہزار خلیے کام شروع کر دیتے ہیں اور انسان کی زبان گویا ہو جاتی ہے کہ یہ چیز جلاتی ہے ۔ یہ گرم ہے ۔ اس سے بچنے کی کوشش کرو ۔ وغیرہ وغیرہ ۔ اسی طرح کوئی ٹھنڈی

ہیں کہ وہ کہاں سے آئی ہے۔ تو اس کا جواب پھر کوئی بھی نہیں دے سکتا۔ یہاں سبب ختم ہوا۔ اس لیے جہاں کہیں انسان کی عقل رک جاتی ہے۔ وہاں خدا کا ہاتھ مصروفِ عمل ہو جاتا ہے۔

اس لئے جب اللہ نے ہمیں اشیاء کے بنانے کی اہلیت دی تاکہ وہ اس بات کی صداقت آشکارا کر لے کہ "ان الصنعۃ تدل علی الصانع" یعنی صنعت صانع پر دلالت کرتی ہے۔ لیکن صنعت صُنع سے معلوم ہو سکتی ہے کیا؟ مثلاً اگر چاہتے کے پیالے، میز یا مسکن سے پوچھا جائے کہ ان کو کس نے بنایا ہے تو وہ جواب دے سکیں گے؟ ہرگز نہیں۔ پس صنعت کبھی بھی صُنع سے معلوم نہیں ہو سکتی۔

شانِ عظمت

اے انسان! تم بھی اپنے آپ کو اسی پر قیاس کر لو جب تم صنعِ خدا ہو تو تم خدا کو معلوم نہیں کر سکتے اور یہ خدا کی بڑائی ہے کہ تم اسے معلوم نہیں کر سکتے اور اگر تم اس کا ادراک کر سکو تو پھر وہ خدا نہیں ہوگا۔ اور یہ اس لئے کہ جب عقل یا آنکھ کسی چیز کا ادراک کر لیتی ہیں تو وہ اپنا عکس لازم کرتی ہیں۔ مثلاً اگر انسان خالق کا ادراک کر لے تو پھر قادر مقدور اور مقدور قادر بن جائے گا۔ لیکن قادر مقدور اور مقدور قادر کبھی نہیں بن سکتا۔ پس یہ خدا کی عظمت کی نشانی ہے کہ اسکا ادراک نہیں کیا جا سکتا۔ اللہ تعالےٰ فرماتے ہیں:۔

لا تدرکہ الابصار وھو یدرک الابصار وھو اللطیف الخبیر۔

(الانعام - ۱۰۴)

آئیے اب خالق سے مخلوق کی طرف آتے ہیں۔ تاکہ خالق کی عظمت ذہن نشین ہو جائے۔

باہر معلوم ہوتا تھا۔ چیونٹی کی دنیا کسی کو معلوم نہ تھی۔ یہ بھی کسی کو معلوم نہ تھا کہ چیونٹی کی زبان بھی ہے اور یہ کہ وہ ایک دوسرے کے ساتھ بات چیت کرتی ہیں لیکن اب تو چیونٹیوں کی دنیا ہر ایک کو معلوم ہے اور بھی بہت سارے حیوان ہیں۔ جو علم انسانی کے احاطے میں داخل ہوگئے۔

چیونٹیوں کی اپنی ایک مخصوص زبان ہے۔ جس سے وہ ایک دوسرے کے ساتھ بات کرتی ہیں اور پھر چیونٹی ایک ایسا حیوان ہے۔ جو انسان کی طرح اپنے مُردے دفناتی ہیں اور ان کی کارکردگی سے تو ہر ایک آدمی واقف ہے۔

دیکھئے۔ چیونٹی موسم سرما کی ابتدا میں اپنے لئے خوراک ذخیرہ کرتی ہے۔ خوراک جمع کرنے اور اپنے گھر کی صفائی میں چیونٹی جس نظم وضبط اور اتحاد واتفاق سے کام لیتی ہے۔ اس کی نظیر انسانوں میں بھی ملنا محال ہے تو پھر چیونٹی کو یہ سب کچھ کس نے بتایا اور یہ اتنی زبردست سمجھ اس کو کس نے دی؟ یہ سب کچھ اس کو اللہ نے دیا ہے۔ فتبارک اللہ احسن الخالقین۔

دوسری طرف جب انسان سمندر پر نگاہ ڈالتا ہے تو اس میں اس کو ایک چھوٹی سی مچھلی نظر آتی ہے۔ یہ مچھلی کئی سال سمندر میں رہتی ہے اور پھر ایک خاص نہر میں باہر آتی ہے۔ آخر اس کو اپنی وہ خاص نہر یا مولد کی نشاندہی کس نے کی؟۔ خدا نے۔ فتبارک اللہ احسن الخالقین۔

اس طرح سمندر میں رہنے والے اژدہے ہیں۔ یہ اژدہے یورپ کے سمندر میں تھے۔ ہزاروں میل کا سفر طے کیا اور جنوبی برموڈا کے سمندر میں داخل ہوئے وہاں انڈے دیئے۔ بچے جنے۔ خود مر گئے لیکن وہ بچے کہاں چلے گئے؟ وہ بچے

چیز سے بچنے کی اطلاع دیتے ہیں ۔

یہ تو وہ چیزیں ہیں جو جسم انسانی میں بہت معروف ہیں اور جو غیر معروف ہیں وہ روح اور عقل باطنی ہیں اور ان کے ساتھ ہمارا کوئی سروکار نہیں ہے ۔ یہ عالم ہمارے لیے غیر معروف ہے ۔ ہم تو صرف اس کے ایک جز کے ساتھ متعلق ہیں ۔ جو مادی ہے ۔ اور یہ وہ چیزیں ہیں ۔ جو تجربہ گاہ میں خوردبین سے معلوم کیے جا سکتے ہیں ۔

مشہور فلسفی ہیگل نے کہا : میں انسان بنا سکتا ہوں ۔ مجھے صرف مادہ ، پانی اور وقت درکار ہیں ۔

کانٹ نے کہا : مجھے مادہ دیجیے ۔ پھر میں خوب جانتا ہوں کہ کائنات کو کیسے بنایا جاتا ہے ۔

لیکن ان کا یہ دعویٰ قطعی بے بنیاد ہے ۔ اگر وہ اپنے دعوے میں سچے ہوتے تو وہ نہ مرتے ۔ اس لیے کہ خالق کبھی نہیں مرتا ۔ ان کا یہ دعویٰ ہوا میں قلعے بنانے کے مترادف ہے ۔ اس کی کوئی حقیقت نہیں ۔

آئیے ! اب عالم انسان سے عالم حیوان کی طرف جاتے ہیں ۔ اللہ تعالیٰ سورۃ النمل میں فرماتے ہیں ؛

قالت نملة یا ایھا النمل ادخلوا مساکنکم ۔

لیکن یہ کیسی بات ہے ؟

کیا چیونٹی بھی بات کر سکتی ہے ؟

پھر یہ بات کس نے کی ؟

جس وقت قرآن نازل ہو رہا تھا ۔ چیونٹی کا بات کرنا عقل کے دائرے سے

جاتے ہیں اور انسان کی اصلی فطرت نمودار ہو جاتی ہے۔ ایک اعرابی سے کسی نے خدا کے بارے میں پوچھا۔ اس نے جواب دیا۔ مینگنی اونٹ کی موجودگی پر دلالت کرتی ہے اور پاؤں کی نشانی ایک جانے والے کی موجودگی پر۔ کیا یہ آسمان و زمین ایک خالق کی موجودگی پر دلالت نہیں کرتے؟

ایمان باللہ انسان کی فطرت ہے۔ اور خدا نے انسان کو اسی فطرت پر پیدا کیا ہے اور یہ ایک ضروری امر ہے۔ اور جب سختی کی گھڑی آتی ہے تو خدا کے وجود سے انکار کرنے والے خدا کی طرف متوجہ ہو جاتے ہیں اور ماسوائے خدا کے اور سارے معبودوں سے بیزاری کا اظہار کرنے لگتے ہیں۔

جب کشتی ڈوبتی ہے۔ یا آگ لگ جاتی ہے یا اور کوئی بڑا خطرہ اٹھ کھڑا ہوتا ہے یا سخت بیماری آتی ہے تو خدا کے وجود سے انکار کرنے والے دین کی طرف راجع ہوتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

فرعون کا اقرار

واذا مسکم الضر فی البحر ضل من تدعون الا ایاہ۔ (الاسراء-۶۷)

(اور جب آپ کو سمندر میں تکلیف پہنچتی ہے۔ تو سوائے خدا کے باقی آپ کے سارے معبود غائب ہو جاتے ہیں)۔

کہتے ہیں کہ جب ایک مادہ پرست کو موت آتی ہے تو پھر وہ صرف اللہ کو بلاتا ہے یہاں تک کہ لینن اور مارکس پر جب نزع کی حالت طاری ہوئی تو وہ بھی اللہ کو بلانے لگ گئے۔ لیکن ایسے وقت اللہ اللہ کہنا ان کے لئے سودمند ثابت نہیں ہو سکتا تھا۔

اسی طرح فرعون نے بھی خدائی کا دعویٰ کیا تھا۔ (انا ربکم الاعلیٰ) لیکن جب سمندر کی موجوں نے گھیر لیا تو کہنے لگا۔

وہاں چلے گئے جہاں سے ان کے والدین آئے تھے ان کا اپنا آبائی مسکن کس نے بنایا؟ —— خدا نے ۔ فتبارک اللہ احسن الخالقین ۔

فطری ضرورت

ایمان باللہ صرف فطری عزیزہ نہیں ہے ۔ بلکہ فطری ضرورت بھی ہے ۔ عقل کسی بھی فعل بلا فاعل ماننے کو تیار نہیں ۔ اسی طرح وہ صنعت بلا صانع کے ماننے کے لئے بھی تیار نہیں ۔

کہتے ہیں کہ چھاتہ بردار فوج کا ایک جوان ایسے گھر میں پروان چڑھا ۔ جس میں ذکر خدا نام کو بھی نہ تھا اور نہ کوئی خدا کے نام سے واقف تھا ۔ اس نے تعلیم بھی ایسے مدرسے میں حاصل کی تھی ۔ جہاں دینی تعلیم بالکل مفقود تھی یہ تو ان مکمل مادی فضا میں پروان چڑھا ۔

ایک دفعہ وہ ایک جنگ میں شامل ہوا ۔ جس وقت جہاز سے چھلانگ لگائی اور اس کی چھتری ابھی کھلی نہیں تھی کہ وہ یوں گویا ہوا ۔ یا اللہ ! یارب ! وہ صمیم قلب سے خدا سے دعا مانگ رہا تھا ۔ یہ نوجوان حیران ہوا کہ ایمان کا یہ جذبہ کہاں سے آیا؟

سٹالن کی لڑکی نے اپنا ایک انٹرویو نشر کیا ۔ اس میں اس نے وہ ساری تفصیل دی کہ وہ دین کی طرف کیسے آئی ۔ جبکہ اس کی پرورش خالصتاً لادینی ماحول میں ہوئی تھی ۔ وہ خود اس تبدیلی پر انگشت بدندان تھی ۔

لیکن یہ تعجب کی بات نہیں تھی ۔ ایمان باللہ ہر ایک انسان کے تحت الشعور میں موجود ہے اور یہ انسان کی اصلی فطرت ہے ۔ یہ اصلی فطرت ۔ ایمان باللہ ۔ شہوات نفسانی ۔ طمع اور دوسری کثیر خواہشات کے پردوں میں پوشیدہ پڑی رہتی ہے ۔ جب کبھی اس پر خطرات اور مشکلات آتی ہیں تو یہ پردے ہٹ جاتے

مادی کائنات وجود میں لائی ؟ لیکن یہ مادی کائنات تو جمادات ہے اور جمادات بلا عقل ہوتے ہیں ۔ لیکن وہ خود تو عاقل ہے ۔ کیا عقل اس بات کی اجازت دیتی ہے کہ ایک بے عقل چیز ایک عاقل چیز کو جنم دے ۔

نیچر پرستی

جمادات کے پشت پر ایک قادر مطلق موجود ہے ۔ وہ قادر مطلق یہ سارا کائنات وجود میں لے آیا اور یہ بے عقل مادہ پرست جب کہتے ہیں کہ یہ ساری کائنات بمعہ انسان الطبیعت (فطرت / نیچر) وجود میں لا چکی ہے اور انسان کو عقل بھی اس نے دی ہے ۔

اگر ان سے پوچھا جائے کہ یہ الطبیعة کیا چیز ہے ؟ تو جب ہم لغت کی طرف آتے ہیں ۔ تو کلمہ الطبیعة فعیلة کے وزن پر پاتے ہیں ۔ جس کے معنی مفعولة ہے ۔ جب یہ مطبوعہ کا معنی دیتا ہے ۔ پھر اس کو کس نے طبع کیا ؟ تو وہ کہتے ہیں کہ یہ ساری چیزیں (BY CHANCE) وجود میں آگئیں ۔ تو ان کو یہ کہا جائے گا کہ آپ کی مثال ان دو اشخاص کی طرح ہے ۔ جو ایک صحرا میں گم ہو گئے تھے ۔ وہ دونوں ایک عمدہ مکان سے گزرے جس کی دیواریں قیمتی تھیں ۔ اس میں قالین بچھے ہوئے تھے اور اس میں گھڑیاں بھی تھیں ۔

ایک آدمی نے کہا ، یہ مکان ایک آدمی نے بنایا ہے اور اس میں یہ قالین بچھایا ہے ۔ دوسرے نے کہا ، تم پاگل ہو ۔ یہ تو سارا الطبیعة کا کارنامہ ہے ۔

پہلے نے کہا ، یہ الطبیعة کا کام کیسے ہو سکتا ہے ؟

اس نے جواب دیا ، یہاں ایک پتھر تھا ۔ سیلاب ۔ آندھی اور دوسرے جوی عوامل اکٹھے ہو گئے ۔ ایک دوسرے کے ساتھ خلط ملط ہو گئے اور مرور زمانہ

امنت بالذی آمنت به بنواسرائیل

(میں بنی اسرائیل کے خدا پر ایمان لاتا ہوں)

خدا نے ہمیں اپنی کتاب میں تنبیہہ کی ہے کہ خدا کے وجود کی دلیل ہمارے اپنے نفسوں میں موجود ہے۔ اللہ تعالےٰ فرماتے ہیں۔

وفی انفسکم افلا تبصرون۔

اب کافر خدا کے وجود سے کیسے انکار کر سکتا ہے: جبکہ اس کے وجود کا ثبوت خود اس کے اپنے نفس میں موجود ہے۔

اگر اس کافر سے پوچھا جائے کہ اس نے اپنا نفس خود پیدا کیا ہے۔ کیا وہ رحم مادر میں خود داخل ہوا ہے۔ کیا اس نے اس عورت کو اپنی مرضی سے اپنی ماں بنا دیا ہے۔ کیا وہ خود ایک دائی کے پاس گیا ہے۔ تاکہ وہ اس کو بحفاظت رحم مادر سے نکالے؟

کیا یہ ممکن ہے کہ کسی کافر کو عدم سے بغیر کسی فاعل اور خالق حقیقی کے وجود میں لایا جائے اور کیا، اے انسان! یہ ساری مادی مخلوق آپ نے پیدا کی ہے؟

ڈیکارٹ نے جب تشکیک کا مذہب پھیلایا اور ہر ایک چیز میں شک کرنے لگا۔ تو اس سلسلے میں وہ اپنے نفس تک پہنچا۔ پھر وہ اپنے نفس میں شک نہ کر سکا۔ اس لئے کہ وہ خود بھی وہ نفس ہے جو شک کرتا ہے اور شک کے لئے شک کرنے والے کا وجود ضروری ہے۔ یہی وجہ تھی کہ اس کی یہ بات مشہور ہو گئی،

"میں سوچتا ہوں تو اس نتیجے پر پہنچتا ہوں کہ میں موجود ہوں"

اس کے وجود میں تو کوئی شک نہیں لیکن اس کو کون وجود میں لایا؟ کیا اس کو یہ

میں سخت طوفان میں بغیر کسی ناخدا کے آرام سے چلنا تو خلاف عقل معلوم ہوتا ہے۔ لیکن اتنی بڑی کائنات کا بغیر کسی خالق اور مدبر کے وجود میں آنا خلافِ عقل معلوم نہیں ہوتا۔ یہ سن کر وہ لوگ حیران ہو گئے۔

یہی وجہ تھی کہ جب بھی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم حیران ہو جاتے تھے تو یہ دُعا پڑھتے تھے:-

اللھم لك اسلمت وبك آمنت وعليك توكلت واليك انبت وبك خاصمت واليك حاكمت فاغفر لی ماقدمت وما اخرت وما اسررت وما اعلنت انت المقدم وانت المؤخر لا اله الا انت ۔

دہریوں سے مناقشہ

ایک دفعہ بغداد میں کافی علماء جمع ہو گئے تاکہ دہریوں کے ساتھ خدا کے وجود کے بارے میں مناقشہ کریں۔ ان علماء نے امام ابوحنیفہ کے استاد شیخ حماد کو اپنا نمائندہ منتخب کیا۔ اتنے میں امام ابوحنیفہؒ تشریف لے آئے اور کہا: میرے استاد خود اس لئے نہیں آئے اور مجھے بھیجدیا کہ یہ مسئلہ بہت معمولی ہے چنانچہ بحث شروع ہوئی۔

فریق مخالف:- تمہارا خدا کس سنہ میں پیدا ہوا ہے؟

امام صاحب:- خدا پیدا نہیں ہوا۔ اور کتاب اللہ میں ہے:

لم يلد ولم يولد (نہ اس نے کسی کو جنا ہے اور نہ اسکو کسی نے جنا ہے)

فریق مخالف:- تمہارا رب کس سال وجود میں آیا ہے؟

امام صاحب:- اللہ پاک وقت کی قیود سے آزاد ہے۔ وہ قدیم ہے۔ اس

کے ساتھ ساتھ ان سے یہ دیواریں بنیں ۔

پہلے نے کہا ، یہ قالین کیسے بنے ؟

دوسرے نے جواب دیا ، بھیڑوں نے اپنا اون گرا دیا ۔ وہ اُون اکٹھا ہوا ۔ پھر رنگ دار کانوں نے اسکو رنگ دیا اور یہ قالین وجود میں آگئے ۔

پہلے نے پھر پوچھا ، یہ گھڑیاں کیسے وجود میں آگئیں ؟

دوسرے نے جواب دیا ، لوہا جوی عوامل کے اثر سے گھس گیا ۔ توڑا گیا اور مرورِ زمانہ کے ساتھ اس سے خود بخود یہ گھڑیاں بن گئیں ۔

اس آدمی کو اگر دیوانہ نہ کہا جائے تو اور کیا کہا جائے گا ۔

بیسویں صدی کے دہریے

ایک عالم کو دہریوں نے آگھیرا ۔ وہ خدا کو نہیں مانتے تھے اور موت کا سبب وہ بڑھاپا اور جسم کے خلیوں کی ہلاکت سمجھتے تھے اور اس قسم کے دہریے بیسویں صدی میں بہت پائے جاتے ہیں ۔ یہ دہریے اس عالم کے پاس آگئے اور اس کو قتل کرنے کا پروگرام بنایا ۔ لیکن وہ عالم بہت ہوشیار تھا ۔ ان سے کہنے لگا ۔ مجھے پہلے ایک مسئلے کا جواب دو ۔ بعد میں جو کچھ کرنا چاہو کر لو ۔

عالم نے کہا : ایسے آدمی کے بارے میں آپ کی کیا رائے ہے جو کہتا ہے کہ اس نے ایک کشتی دیکھی جو بھری ہوئی تھی اور گہرے سمندر میں پہاڑ جیسی موجوں میں گھری ہوئی تھی ۔ طوفان زوروں پر تھا ۔ مگر یہ کشتی بغیر کسی ناخدا کے بڑے آرام سے چل رہی تھی ۔ کیا یہ بات آپ کی عقل میں آسکتی ہے ؟

دہریوں نے جواب دیا ، یہ تو بالکل خلاف عقل معلوم ہوتی ہے ۔

عالم نے کہا : سبحان اللہ ! سامان سے بھری ہوئی ایک کشتی کا گہرے سمندر

ہے۔ تو اس آسمانوں اور زمین کے نور یعنی خدا کے بارے میں کیا خیال ہے کہ وہ کس طرف منہ کرتا ہے؟

فریق مخالف:- ہمیں اپنے رب کے بارے میں یہ بتا دیں کہ وہ لوہے کی طرح سخت ہے۔ پانی کی طرح سیال یا دھوئیں اور بخار کی طرح اوپر اٹھنے والا۔

امام صاحب:- آپ کبھی ایسے مریض کے نزدیک بیٹھے ہیں۔ جو قریب الموت ہو یعنی اس پر نزع کی حالت طاری ہو؟

فریق مخالف:- ہاں۔

امام صاحب:- وہ آپ کے ساتھ بات کیا کرتا تھا لیکن موت کے بعد ساکت ہوا۔ وہ پہلے متحرک تھا۔ بعد میں ساکن ہوا۔ اس کی حالت کس نے بدل ڈالی؟

فریق مخالف:- روح کے نکلنے نے۔

امام صاحب:- اس کی روح نکل گئی اور آپ بیٹھے تھے؟

فریق مخالف:- جی ہاں۔

امام صاحب:- اس روح کی تعریف کیجئے۔ آیا یہ لوہے کی طرح سخت تھی یا پانی کی طرح سیال یا دھوئیں اور بخار کی طرح اوپر اٹھنے والا؟

فریق مخالف:- ہم روح کی تعریف نہیں کر سکتے۔

امام صاحب:- مطلب یہ کہ روح کی حقیقت تک تو آپ کی رسائی نہیں ہو سکتی پھر آپ مجھ سے ذات الٰہی کی حقیقت کیسے دریافت کرتے ہیں۔

فریق مخالف:- آپ کا رب کس جگہ موجود ہے؟

کے وجود کیلئے ابتدا نہیں ہے ۔
فریق مخالف :۔ ہمیں چند ایسے محسوس واقعے بیان کرو ۔ جن سے تمہارے جواب کی وضاحت ہو جائے ۔
امام صاحب :۔ چار سے پہلے کونسا عدد ہے ؟
فریق مخالف :۔ تین (۳)
امام صاحب :۔ تین سے پہلے ؟
فریق مخالف :۔ دو (۲)
امام صاحب :۔ دو سے پہلے ؟
فریق مخالف :۔ ایک (۱)
امام صاحب :۔ ایک سے پہلے ؟
فریق مخالف :۔ کچھ نہیں ۔
امام صاحب نے فرمایا : اچھا ۔ گنتی کے ایک سے پہلے تو کچھ نہیں ہو سکتا ۔ پھر واحد حقیقی یعنی خدا سے پہلے کیونکر کچھ ہو سکتا ہے ۔ خدا قدیم ہے ۔ اس کے لیے ابتدا نہیں ہے ۔
فریق مخالف :۔ آپ کا خدا کس طرف منہ کرتا ہے ؟
امام صاحب :۔ اگر ایک لالٹین ایک تاریک کمرے میں رکھدیا جائے تو اس کی روشنی کا منہ کس طرف ہوگا ؟
فریق مخالف :۔ سب اطراف کو ۔
امام صاحب :۔ یہ تو مصنوعی روشنی کا حال ہے کہ ساری اطراف میں پھیل جاتی

پہلا، آپ کہتے ہیں کہ خدا موجود ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ اسے دیکھ لوں۔

دوسرا، آپ کہتے ہیں کہ قیامت کے دن آگ کا عذاب دیا جائے گا۔ جن لوآگ سے پیدا ہوئے ہیں۔ پھر آگ کو آگ کی سزا کیسے دی جائیگی؟

تیسرا۔ آپ کہتے ہیں کہ ہر ایک چیز قضا و قدر کے مطابق وجود میں آتی ہے۔ اب اگر آپ کی بات ٹھیک ہے تو پھر انسان کو اس کے عمل کی سزا نہیں دی جانی چاہیے۔ اور حقیقت یہ ہے کہ انسان اپنے اعمال کا خالق ہے۔

امام صاحب نے کچھ نہیں کہا۔ البتہ مٹی کی ایک ڈکری لی اور ان تینوں کے چہروں پر ڈال دی اور فرمایا، یہ آپ کے سوالات کے جوابات ہیں۔

وزیر الدولہ کو امام صاحب کا یہ عمل پسند نہیں آیا۔ امام صاحب سے حادثے کا سبب دریافت کیا۔ امام صاحب نے جواب دیا:

ان کی عقلیں

ان کی آنکھوں میں مٹی ڈالنا میری طرف سے ان کے سوالات کا واضح جواب تھا۔ پہلے نے پوچھا تھا کہ میں اس کو خدا دکھاؤں۔ میں نے پوچھا، مجھے وہ درد دکھاؤ جو آپ نے مٹی کے ڈالنے سے محسوس کیا ہے۔ اس کے بعد میں آپ کو خدا دکھاؤں گا۔ (حقیقت یہ ہے کہ بہت ساری چیزیں ایسی ہیں جو نظر نہیں آتیں لیکن ان کا وجود ہے۔ مثلاً بجلی کے تار میں بجلی نظر نہیں آتی۔ لیکن وہ موجود ہوتی ہے اور اگر انکار کرنے والا اس کے باوجود سے اس بنا پر انکار کرتا ہے کہ وہ نظر نہیں آتی تو ذرا ہاتھ ڈال کر دیکھے۔)

اسی طرح عقل انسانی نظر نہیں آتی۔ لیکن اس کا وجود ہوتا ہے۔ رات کے وقت
۱۰ آسمان پر چمکتا ہوا۔ چاند حرکت کرتا ہے۔ لیکن انسان اس کی حرکت کو نہیں دیکھ سکتا

امام صاحب :۔ دودھ کے ایک بھرے ہوئے پیالے میں گھی کہاں ہوتا ہے؟

فریق مخالف :۔ گھی کسی خاص مقام پر نہیں ہوتا۔ سارے دودھ میں پھیلا ہوا ہوتا ہے۔

امام صاحب :۔ جب ایک تخلیق شدہ چیز کے لیے کوئی خاص جگہ متعین نہیں کی جا سکتی تو پھر ذات الہٰی کے لیے ایک مخصوص جگہ کا تعین کیونکر ممکن ہو سکتا ہے؟

فریق مخالف :۔ جب سارے امور کی تقدیر کائنات کی تخلیق سے پہلے مقرر کی جا چکی ہے تو پھر اس میں تمہارے رب کا کارنامہ کیا ہے؟

امام صاحب :۔ خدا امور کو ظاہر کرتا ہے۔ ان کی ابتدا نہیں کرتا۔ بعض قوموں کو اٹھاتا ہے اور بعض کو گراتا ہے۔

فریق مخالف :۔ جب دخول جنت کے لئے ابتدا ہے۔ پھر اس کے لیے انتہا بھی ضروری ہے۔ بلکہ جنتی تو جنت میں ہمیشہ رہیں گے۔

امام صاحب :۔ گنتی کے ہندسوں کے لیے ابتدا ہے۔ انتہا نہیں۔

فریق مخالف :۔ ہم جنت میں کھائیں گے۔ پئیں گے اور بول و براز نہیں کرینگے!

امام صاحب :۔ ہم، آپ اور سب مخلوق رحم مادر میں نو مہینے رہتے ہیں۔ کھاتے پیتے ہیں لیکن بول و براز نہیں کرتے۔

فریق مخالف :۔ جنت کی چیزیں خرچ کرنے سے کیسے بڑھتی ہیں۔ چاہیئے تھا کہ وہ خرچ کرنے سے گھٹ جائیں۔

امام صاحب :۔ علم جب خرچ کیا جاتا ہے۔ تو بڑھتا ہے۔ گھٹتا نہیں۔ آخر میں ان میں سے میں سے تین نے امام صاحب سے پوچھا۔

دکھا سکتے ہو ؟

امام صاحب نے جواب دیا۔ نہیں ۔

امام صاحب وزیر الدولہ سے مخاطب ہوکر کہنے لگا۔ اس جاہل کو کہہ دو کہ ہر موجود چیز دیکھی نہیں جا سکتی ۔ (مثلاً بجلی کے تار میں موجود بجلی یا عقل انسانی وغیرہ)

امام صاحب پھر وزیر موصوف سے کہنے لگے :۔ دوسرے نے پوچھا تھا کہ جن تو آگ سے پیدا ہوئے ہیں ۔ ان کو آگ کا عذاب کیسے دیا جائے گا ۔ یعنی آگ کو آگ سے تکلیف کیسے پہنچائی جا سکتی ہے ؟ اس کو بتاؤ کہ وہ بھی تو مٹی سے پیدا ہوا ہے ۔ پھر اس مٹی سے اس کو تکلیف کیوں پہنچی ؟

پھر تیسرے نے پوچھا تھا کہ میں ضرور بالضرور اس کی یہ منطق مان لوں کہ انسان اپنے اعمال پر مجبور ہے ۔ وہ یہ بھول گیا کہ انسان مختار بھی ہے جب میں ان کی آنکھوں میں مٹی ڈالنے پر مجبور تھا ۔ پھر اس نے آپ کو شکایت کیوں کی ؟

مجبور محض یا مختار کل

کہتے ہیں کہ حضرت علی کرم اللہ وجہہ سے کسی نے پوچھا کہ انسان مجبور محض ہے یا مختار کل ؟

آپؑ نے جواب دیا :۔

" نہ مجبور محض ہے اور نہ مختارِ کل "

پھر پوچھا گیا : اس کا کیا مطلب ہے ؟

آپؑ نے فرمایا :۔

"آؤ۔ میرے سامنے ایک پاؤں اٹھا کر کھڑے ہو جاؤ۔"
وہ آدمی ایک پاؤں اٹھا کر آپ کے سامنے کھڑا ہو گیا۔
حضرت علی کرم اللہ وجہہ نے پھر فرمایا:-
"دوسرا پاؤں بھی اٹھاؤ۔"
اس آدمی نے جواب دیا:-
"دوسرا پاؤں اٹھاؤں گا تو گر جاؤں گا۔"
آپؓ نے فرمایا:-
"انسان اس حد تک مختار ہے کہ وہ ایک پاؤں تو اٹھا سکتا ہے اور اس حد تک مجبور ہے کہ وہ دوسرا پاؤں نہیں اٹھا سکتا۔"
اس مکالمے کے بعد فریقِ مخالف کا سرغنہ مسلمان ہو گیا۔

واللہ اعلم بالصواب۔ وما علینا الا البلاغ۔ وما توفیقی الا باللہ علیہ توکلت والیہ انیب۔ وصلی اللہ تعالیٰ علیٰ خیر خلقہ محمدؐ وآلہ واصحابہ اجمعین۔

---

(۳)

ان دیکھی حقیقتیں عقائد اور سائنس

عقیدہ کی اہمیت اعتقاد وایمان انسانی زندگی کا محور، فکر وعمل کی بنیاد اور عبادات واخلاق کی اساس ہیں۔ دائرہ حیات کا یہی وہ نقطہ ماسکہ ہیں جس کے گرد انسانی افکار وتخیلات گھومتے رہتے ہیں اور اس سے انسانی عمل کا جو بھی خط نکلتا ہے وہ مختلف زاویے بناتا ہوا پھر اسی پر آکر ختم ہوجاتا ہے اعتقاد وایمان کے بغیر انسانی زندگی کی گاڑی نہیں چل سکتی جس طرح اقلیدس کی کوئی شکل چند اصولوں کو تسلیم کئے بغیر نہیں بن سکتی اور نہ ثابت ہوسکتی ہے اسی طرح انسانی عمل بھی اس وقت تک صحیح اور درست نہیں ہوسکتا جب تک کہ اس کے لیے چند مبادی اصول تسلیم نہ کر لیے جائیں۔ یہی مبادی واصول ایمان وعقیدہ کہلاتے ہیں یہ انسان کے دل ودماغ پر سوار ہوکر اسے اپنے تقاضوں کے مطابق چلنے پر مجبور کرتے ہیں۔ اس میں اعلیٰ درجہ کی قوت ارادی پیدا کرتے ہیں اس کی قوت فیصلہ کو مضبوط بناتے ہیں اس کی باطنی صلاحیتوں کو اجاگر کرتے ہیں۔ اور اسے جلوت وخلوت میں اپنی مرضی ومنشا کے مطابق چلا کر اس کی زندگی کو دوسروں کے لیے نمونہ عمل یا درس عبرت بنا دیتے ہیں اسی لیے کینیڈا کے مشہور ڈاکٹر سر ولیم اوسلر نے عقیدہ کی یہ تعریف کی ہے کہ:۔

"یہ ایک زبردست قوت محرکہ ہے جس کو نہ ہم ترازو میں تول سکتے ہیں اور نہ ہی کٹھالی میں ڈال کر پرکھ سکتے ہیں۔" (خدا موجود ہے ص۲۷)

عقیدہ اور سائنس

عقیدہ کا جتنا تعلق مذہب سے ہے اتنا ہی سائنس سے ہے۔ جس طرح مذہب کی دنیا میں ایمان وایقان کے بغیر انسان ایک قدم بھی نہیں چل سکتا اسی طرح بقول ماہر علوم طبعی اورنگ ولیم نابلاخ:۔

"سائنس بھی ایمان کے بغیر ایک قدم آگے نہیں بڑھا سکتی۔ اس میں ہمیں اپنے حواس۔ اپنے آلات۔ اور انفاقات پر ایمان لانا پڑتا ہے۔ اس نقطہ نظر سے اگر دیکھا جائے تو سائنس اور مذہب ایک ہی سطح پر ہیں البتہ سائنس کو یہ امتیاز ضرور حاصل ہے کہ وہ اپنے اعتقادات کو تجربہ اور مشاہدہ کی کسوٹی پر پرکھ سکتی ہے۔"

(ایضاً ص ۱۵۸)

مگر سائنس کا یہ امتیاز اس لیے قابلِ افتخار و اعتبار نہیں کہ اس کے تجرباتی یا مشاہداتی عقیدے آئے دن بدلتے رہتے ہیں۔ مولانا عبدالماجد دریابادی "کائنات کی تعمیر پیہم" کے نئے نظریہ کے سالیہ انکشافات پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ:۔

"سائنس کی تاریخ میں یہ نظریات کی توڑ پھوڑ اور مسلسل ترمیم و تنسیخ کوئی نئی بات نہیں سائنس کی ترقی تو نام ہی مسلسل تردید و تنسیخ کا ہے بڑے بڑے مضبوط نظریوں کا بھی یہی حال ہے سو برس

پہلے کون کہہ سکتا تھا کہ نیوٹن کا نظریہ ثقل بھی کبھی باطل ٹھہرے گا۔ اور پچاس برس پہلے کون اس دعویٰ کی جرأت کر سکتا تھا کہ آئن سٹائن کا نظریہ اضافیت بھی کبھی منسوخی کا منہ دیکھے گا۔" (صدق جدید ۲۶)

بخلاف اس کے اسلامی عقائد کی بنیاد وحی الٰہی پر ہے جو ہر قسم کے سہو و خطا سے پاک ہے یہی وجہ ہے کہ قرآن کے نظریات ہر زمانہ کا ساتھ دیتے چلے آ رہے ہیں اور سائنس کے آئے دن کے انکشافات اس کے نظریات کی صحت کا اعتراف کرتے چلے جا رہے ہیں۔

عقیدہ اور عقل

سائنسی عقائد کو دوام و ابدیت اس لیے حاصل نہیں کہ ان کی بنیاد مفروضات و قیاسیات پر ہے انسان عقل کُل نہیں رکھتا بلکہ عقل قلیل کا مالک ہے اس لیے جب وہ لامحدود الٰہیات کو عقلیات کے محدود پیمانے سے ناپنے میں ناکام رہتا ہے۔ تو وہ اپنی ناکامی اور خفت پر پردہ ڈالنے کے لیے سرے سے ان حقائق کا ہی انکار کر دیتا ہے جن کی الٰہیات نشاندہی کرتے ہیں جس کا امریکہ کے مشہور ماہر انسانیات ڈاکٹر لورین آئزلے نے ان الفاظ میں اعتراف کیا ہے:۔

"ہم وقت پسند لوگ ہیں۔ ناپ تول اور منطق والے لوگ ہیں ہم ان باتوں سے گھبراتے ہیں اور انہیں رد کر دیتے ہیں جن کی ہم تشریح نہیں کر پاتے۔" (وقت کا آسمان صد ۲۱۳)

اسی لیئے سائنٹیفک دماغ رکھنے والے ابن خلدون نے لکھا ہے کہ:۔

" اپنے ذہن کے اس دعویٰ پر کبھی اعتماد نہ کرنا کہ وہ کائنات، اور

اسبابِ کائنات کا احاطہ کر سکتا ہے اور پورے وجود کی تفصیل پر اس کو قدرت ہے۔"

"عقل ایک صحیح ترازو ہے اس کے فیصلے یقینی ہیں جن میں کوئی جھوٹ نہیں۔ لیکن تم اس ترازو میں امورِ توحید۔ امورِ آخرت۔ حقیقت نبوت۔ حقائق صفات الٰہی اور وہ تمام امور و حقائق جو ماورائے عقل ہیں تول نہیں سکتے۔ یہ لاحاصل کوشش ہوگی۔ اس کی مثال ایسی ہے کہ ایک شخص نے ایک ترازو دیکھی جو سونے کا وزن کرنے کے لیے ہے اسے اس ترازو میں پہاڑوں کے تولنے کا شوق پیدا ہو گیا جو ناممکن ہے۔ اس سے ترازو کی صحت پر کوئی حرف نہیں آتا۔ لیکن اس کی گنجائش کی ایک حد ہے اس طرح عقل کے عمل کا بھی ایک دائرہ ہے جس سے وہ باہر قدم نہیں نکال سکتی۔ وہ اللہ اور اس کی صفات کا احاطہ نہیں کر سکتی اس لیے کہ وہ اس کے وجود کا ایک ذرہ ہے۔"

(منقول از مذہب و تمدن صد ۲۰-۱۹)

اسی لیے ماہر عضویات و حیاتی کیمیا والٹر آسکر لنڈبرگ کے قول کے مطابق:۔

"سائنس کی ساری ترقیوں کے باوجود ابھی انسان کی رسائی اسرارِ کائنات کے مبادیات تک ہی ہو سکی ہے۔ . . . . وہ زندگی کو ایک حقیقت کی حیثیت سے تو دیکھتا اور سمجھتا ہے لیکن ابھی تک اس کی سائنٹیفک اصل و حقیقت کو نہیں پا سکا۔ اس کا محدود علم زیادہ سے زیادہ اسے جو کچھ بتا سکا ہے وہ یہ ہے کہ وہ حقائق

سے بحر بیکراں کے کنارے کھڑا ہے ایسے حقائق جن میں نظم وحکمت کارفرما ہے اور جن کے پیچھے اسباب وعلل کام کر رہے ہیں

(خدا موجود ہے صدا ۱)

عقیدہ اور قرآن

قرآن کریم نے ساتویں صدی عیسوی میں ہی ان اسباب وعلل کی نشاندہی کر دی تھی ان میں سے جو باتیں اس انسان کے لیے جاننی ضروری تھیں ان کو تو قرآن نے کھول کر بیان کر دیا اور جو اس کی محدود عقل وفکر میں سمانے والی نہ تھیں ان پر ایمان بالغیب لانے کی تاکید کی مگر سائنس دانوں نے قرآنی نظریات پر حصر کرنے کی بجائے خود سولہویں صدی عیسوی سے کائنات کا جگر چیر کر اندر جھانکنا شروع کیا کہ یہ نظام کائنات کس طرح چل رہا ہے کائنات کی عمر کے مقابلہ میں انسان کی عمر چونکہ بہت قلیل تھی اس لیے ہر سائنسدان اپنی قلیل عمر میں اس کی صرف ایک ہی جھلک دیکھ سکا کسی نے روشنی کی رفتار کو ناپا کسی نے سیاروں کی چال کو جانچا کسی نے ان کا درمیانی فاصلہ معلوم کیا کسی نے شمسی توانائی کا حساب لگایا اور کسی نے سالمات کا پتہ لگایا۔ وقس علی ہذا چونکہ جملہ امور حقائق کائنات کا احاطہ کرنے کے لیے ہر ایک کے پاس وقت اور وسائل نہ تھے اس لیے ہر آنے والے سائنسدان کو اپنے پیشرو سائنسدانوں کے تجربات واکتشافات پر ایمان واعتماد لانا پڑا۔ انہیں ہی زینہ بنا کر اپنی لیبارٹریوں میں داخل ہونا پڑا اور انہی کی بنا پر اسرار کائنات کی سراغ رسانی کی مہم کو جاری رکھنا پڑا۔ اس طرح سائنسدانوں نے جو چیزیں خود نہ دیکھی اور نہ جانچی تھیں ان پر ایمان لا کر ان دیکھی حقیقتوں پر ایمان بالغیب لانے کے فرائض کے

اصول کو تسلیم کر لیا۔ اور صدیوں کی تگ ودو کے بعد نتائج کے لحاظ سے وہ حقائق کی انہی سرحدوں تک پہنچ سکے۔ جن کی قرآن آج سے پونے چودہ سو سال قبل نشاندہی کر چکا تھا۔ اور جن پر ایمان واعتقاد لانے کی دعوت دے چکا تھا۔

ذاتِ باری تعالیٰ

سب سے بڑی ان دیکھی حقیقت خود ذات باری تعالیٰ کی ہے ایک طبقہ سرے سے خدا کے وجود کا منکر ہے اس کا اعتقاد ہے کہ یہ جو کچھ نظر آ رہا ہے مادہ کی کارفرمائی ہے جو خود بخود معرضِ وجود میں آکر ضروری ارتقائی منازل طے کرتا چلا جا رہا ہے ؛ دوسرے طبقہ کا خیال ہے کہ خداوند تعالیٰ ایک بار ہی اپنی خلاقی اور فعالی کا جلوہ دکھا کر اب دنیا سے بے تعلق و بے نیاز ہو گیا ہے۔ اور اس نے سارا انتظام غیر اللہ یا ارباب من دون اللہ یا چھوٹے چھوٹے خداؤں میں تقسیم کر رکھا ہے اس لیے وہ اللہ کو چھوڑ کر غیر اللہ کی عبادت و پرستش کرتے ہیں تیسرا طبقہ اللہ جل شانہ کو خالقِ اکبر اور قادر مطلق سمجھتا ہے۔ اور اس کی ذات وصفات کے متعلق قرآنِ کریم نے جو اطلاعات بہم پہنچائی ہیں ان کی صداقت پر ایمان واعتقاد رکھتا ہے جس کا اب سائنس نے بھی اعتراف کر لیا ہے جس کی تفصیل اس سلسلہ کے مقالہ "خدا اور سائنس" میں پیش کی جا چکی ہے۔

جدید تحقیقات کی رو سے سائنس کے ارتقا کی آخری منزلِ معلومہ قوت یا انرجی ہے اور اسی پر مشہور سائنسدان نیوٹن نے اپنے نظریات کی بنیاد رکھی تھی۔ نیوٹن کا کلیہ یہ ہے کہ ہر بے جان چیز کی اصل سکون ہے وہ صرف قوتِ عمل سے ہی متحرک ہوتی ہے اور جب کسی خارجی قوت سے کوئی بے جان چیز متحرک ہو جائے تو

پھر وہ ساکن نہیں ہوتی بلکہ ہمیشہ متحرک رہتی ہے تاوقتیکہ کوئی دوسری خارجی قوت اسے روک نہ دے یا اس کا رخ کسی دوسری طرف نہ پھیر دے۔

جہاں تک سائنس کی موجودہ تحقیقات کا سلسلہ پہنچ سکا ہے۔ اس کی رو سے سورج اور نظام شمسی کے جملہ ستارے اور چاند وغیرہ آج سے کروڑوں برس قبل سب کے سب جلتی ہوئی گیس کا ایک ہی جسم عظیم تھے۔ اس جسم عظیم کو ایک قوت نے متحرک کیا جس کی بنا پر یہ جسم عظیم ایک ہوشربا سرعت کے ساتھ حرکت میں آیا اس جسم عظیم کی قوت جاذبہ (ATTRACTIV FORCE) اتنی زیادہ تھی کہ جسم عظیم کی گیسیں ایک دوسرے سے جدا نہیں ہو سکتی تھیں لیکن اس سے زیادہ ایک بے پناہ قوت نے اس کی قوت جاذبہ پر غلبہ پا کر اس جسم عظیم کے ٹکڑے کر دیے جنہوں نے سیاروں کی شکل اختیار کر لی مگر انہیں یونہی آزاد چھوڑ دیا گیا کہ وہ پھر ایک دوسرے سے مل جائیں یا ایک دوسرے سے ٹکرا کر پاش پاش ہو جائیں بلکہ اس عظیم قوت نے ہر سیارہ کو اپنے اشارہ پر خاص خاص سمت فاصلے اور مقام پر روک کر اسے اپنے علیحدہ علیحدہ محور پر گردش کرنے پر مجبور کر دیا جو روز اول سے آج تک پورے نظم و ترتیب کے ساتھ گردش میں ہیں۔ اور جن کی رفتار اور منزل میں آج تک کوئی فرق نہیں آیا۔

صدیوں کے تجربات کے بعد سائنس نے ایک بے پناہ قوت (Force) یا عظیم توانائی کلی (ENERGY) کا تو پتہ چلا لیا مگر اس بات کا پتہ نہ چلا سکی کہ اس کا خالق یا مالک کون ہے؟

اس کا سراغ ہمیں صرف قرآن سے ہی ملتا ہے کہ :-

(۱) اِنَّ رَبَّكُمُ اللّٰهُ الَّذِیْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ فِیْ سِتَّةِ اَیَّامٍ
(اعراف)
(۲) وَالشَّمْسَ وَالْقَمَرَ وَالنُّجُوْمَ مُسَخَّرٰتٍۭ بِاَمْرِهٖ اَلَا لَهُ الْخَلْقُ وَالْاَمْرُ
(ایضاً)
اِنَّ اللّٰهَ قَوِیٌّ

بے شک تمہارا پروردگار وہی اللہ ہے جس نے چھ دنوں میں آسمانوں اور زمین کو پیدا کیا اور اسی نے سورج اور چاند اور ستاروں کو پیدا کیا اور سب اسی کے حکم کے تابع ہیں یاد رکھو کہ اسی کا کام ہی پیدا کرنا اور حکم فرمانا ہے اللہ ہی بڑی قوت والا ہے۔

اللہ کی مخفی مخلوق

اللہ جل شانہ نے جس طرح اپنی ذات کو اپنی صفات کے پردوں میں چھپا رکھا ہے اسی طرح اس نے کچھ ایسی مخلوق بھی پیدا کی ہے جو جسم و جان رکھنے کے باوجود ہمیں نظر نہیں آتی۔ جیسے فرشتے۔ ہم اپنی طبعی کثافت کی بنا پر سب کو نظر آتے ہیں اور وہ اپنی طبعی لطافت کی بنا پر کسی کو نظر نہیں آتے ان کے نظر نہ آنے کی وجہ سے بعض حضرات جنوں اور فرشتوں کے وجود کے منکر ہیں لیکن سائنس نے ایک اور مخفی مخلوق معلوم کر کے اس حقیقت کا انکشاف اعلان کر دیا ہے کہ اس کائنات میں بے شمار ایسی مخلوق موجود ہے جو جسم و جان رکھنے کے باوجود ہمیں نظر نہیں آتی۔

جدید سائنسی تحقیقات کی رو سے کائنات کی تمام موجودات عناصر یا مادہ سے بنی ہیں مادہ جوہر سے بنا ہے جو ہر برقیوں کے منفی ذرات (الیکٹروں) اور مثبت ذرات (پروٹون) کے اختلاط سے پیدا ہوا ہے ان منفی و مثبت ذرات کے اختلاط سے جو حیوانی یا نباتاتی عنصر پیدا ہوتا ہے وہ خلیہ (cell)

یا جرثومہ کہلاتا ہے یہ خلیے یا جرثومے بے جان نہیں ہوتے بلکہ جاندار اور بڑے حساس ہوتے ہیں جسامت رکھتے ہیں تیز حرکت کرتے ہیں اور اپنی بقا کے لیے کوشاں رہتے ہیں مگر انسانی نظر ان کو نہیں دیکھ سکتی وہ صرف مشینی نظر یعنی خوردبین کی مدد سے ہی دیکھے جا سکتے ہیں۔ یہ بہت خفیف ہوتے ہیں سر چارلس ڈاردن کے بیان کے مطابق بیکٹیریا — (BACTERIA) جرثومے اتنے چھوٹے ہوتے ہیں کہ:۔

"ایک پن کی نوک پر ایسے ایسے لاکھوں ذی حیات ناچتے نظر آتے ہیں"

خود حضرت انسان دو ہزار کروڑ خلیوں (CELLS) کا مرکب ہے اور اس کائناتِ اکبر میں کائناتِ اصغر کی حیثیت رکھتا ہے۔

ان سائنسی انکشافات سے یہ امر پایۂ ثبوت کو پہنچ جاتا ہے کہ اس کائنات میں کچھ ایسی مخلوق بھی موجود ہے جو وجود رکھنے کے باوجود اپنی طبعی لطافت کی وجہ سے نظر نہیں آتی۔ اس لیے جنوں اور فرشتوں کے وجود سے انکار نہیں کیا جا سکتا کیونکہ سائنس ان کے وجود کے اصول کو تسلیم کرتی ہے۔

کائنات کی تعمیر پیہم

بعض لوگوں کا عقیدہ ہے کہ اللہ تعالیٰ تخلیق کائنات کے بعد اس کا انتظام "چھوٹے خداؤں" کے سپرد کر کے خود بے فکر ہو کر بیٹھ گیا ہے ہر چیز موت و حیات کی طبعی منزلیں خود بخود طے کرتی چلی جا رہی ہے اور لوگوں کی حاجات و ضروریات ارباب من دون اللہ پوری کرتے رہتے ہیں۔ سائنس کے جدید انکشافات نے اس غیر اسلامی عقیدہ کی بھی تردید کر دی ہے کیمبرج یونیورسٹی کے نامور ماہر ریاضیات

وطبیعات ڈاکٹر نارلیکر نے فروری ۱۹۶۵ء کے اوائل میں یہ انکشاف کیا ہے:

"سائنس کا یہ اصول ہے کہ جب بھی نئے مفروضات بنتے ہیں پرانے نظریات کو رد کر دیا جاتا ہے آئن سٹائن کے نظریہ اضافیت نے نیوٹن کے نظریہ ثقل کو رد کر دیا تھا لیکن آئن سٹائن کا نظریہ اضافیت بھی ان دور دراز اثرات کا احاطہ نہ کر سکا جواب معلوم ہوئے ہیں۔ میں نے ڈاکٹر ہوائل کی شرکت وامداد سے جس نئے فلکیاتی نظریہ کو دریافت کیا ہے وہ کائنات کی تعمیر پیہم یا تخلیق مسلسل کا نظریہ ہے اس کی پہلی جھلک ہم کو جرمن فلسفی ماخ کے نظریات میں ملی تھی۔ (منقول از صدق جدید مورخہ ۲۶ $\frac{3}{65}$)

اس جدید نظریہ کے مطابق تخلیق وتکوین کا سلسلہ ہر لمحہ اور ہر لحظہ جاری رہتا ہے۔ اس میں تعطل پیدا نہیں ہوتا۔ اور نہ ہی خالق کائنات تخلیقی امور میں تساہل وتغافل سے کام لیتا ہے بلکہ اس کے تصرفات ہر وقت جاری رہتے ہیں اس نظریہ کی تائید برطانوی سائنٹسٹ نیو کاسل ...... یونیورسٹی کے پروفیسر ڈاکٹر کمہ تیرا CRAER کے اس انکشاف سے ہوتی ہے جس کا ذکر انہوں نے اپنے مقالہ مطبوعہ نیچر (NATURE) میں کیا ہے سمندر سطح زمین کے ۷۱ فیصد رقبہ پر پھیلا ہوا ہے یعنی دسیع وعریض زمین صرف ۲۹ فیصد ہے مگر اب ڈاکٹر موصوف کے انکشاف کے مطابق:۔

"یہ زمین پراسرار طریقہ سے بڑھتی جارہی ہے چنانچہ اب یہ اپنی جسامت سے تقریباً دوگنی ہو گئی ہے۔ اور ساحل سمندروں سے اب اتنا

ہٹ گیا ہے کہ خشکی کا حصہ سطح زمین پر اب کل ۳۰ فیصد رہ گیا ہے"

(بحوالہ صدر)

گویا یجرو بریں بھی "تخلیق مسلسل" کا عمل جاری ہے نظریات کی تاریخ میں کائنات کی تعمیر پیہم کے نظریہ کا نمبر گو سب سے آخری ہے۔ مگر قرآن نے اس کی خبر سب سے پہلے دی تھی کہ:-

کل یوم ھو فی شان (رحمٰن ع۲) وہ (اللہ) ہر وقت کسی نہ کسی کام میں لگا رہتا ہے

ہسٹری شیٹ کی تیاری

جس طرح ہر حکومت اور ہر محکمہ میں ملازمین کی سروس بک ہوتی ہے جس میں اس کی ملازمت کے زمانہ کا ہسٹری شیٹ یا نامہ اعمال تیار ہوتا رہتا ہے جس سے اس کی ترقی و تنزلی میں مدد ملتی ہے۔ اسی طرح فرشتوں کی ایک جماعت جو کراماً کاتبین کہلاتی ہے ہر انسان کا یوم پیدائش سے یوم آخر تک کا اعمال نامہ تیار کرتی رہتی ہے۔ وہ چوبیس گھنٹہ میں جو کچھ کرتا ہے اس کی پوری کارکردگی کو وہ لکھتے رہتے ہیں علماء سائنس کا اس بات پر اتفاق ہے کہ ائیر جو برق اور نور سے زیادہ لطیف ہوتا ہے۔ ایک جسم رکھتا ہے جسے ائیری جسم کہتے ہیں وہ ہر اس آواز یا حرکت کا نقش اور عکس تیار کر کے محفوظ کر لیتا ہے جو کرۂ ائیری میں پیدا ہوتی ہے یہ ائیری جسم ایک انتہائی نازک قسم کے خودکار کیمرہ کی مانند ہوتا ہے جس کی تفصیل بعنوان "خدا اور سائنس" میں آ چکی ہے

اس ائیری پلیٹ کی عکاسی اتنی اعلیٰ درجہ کی ہوتی ہے کہ وہ خیال تک کی تصویر لے لیتی ہے اس طرح عالم ائیر میں انسان کی ہر ظاہری و باطنی

بات کی فلم تیار ہوتی رہتی ہے اور جب روح انسانی رجوانیر سے زیادہ لطیف ہوتی ہے پرواز کرتی ہے تو یہ اثیری فلم ہمراہ لے جاتی ہے آگے کیا ہوتا ہے اس کا ابھی تک سائنس کو علم نہیں ہوسکا۔ مگر قرآن کریم سے پتہ چلتا ہے کہ قیامت کے دن اسی ہسٹری شیٹ یا نامہ اعمال کی بنا پر انسان کی ساری زندگی کی کارکردگی کا محاسبہ یعنی آڈٹ (Audit) ہوگا

اگر آپ کے نزدیک ایتھر یا انیر کوئی ٹھوس اور محسوس چیز نہیں محض ایک خیال یا مفروضہ ہے تو ہمارے پاس ایک ایسی ٹھوس اور محسوس ایجاد موجود ہے جس کی کارکردگی سے اعمال نامہ کی ترتیب و تکمیل کے قرآنی نظریہ کی تائید ہوتی ہے اسے راڈار سسٹم کہتے ہیں جو ریڈیو اور ٹیلیویژن کے بعد برقیات کی جدید ترین اور حیرت انگیز ایجادات میں سے ہے۔ ریڈیو اور ٹیلی ویژن "ہز ماسٹرس وائس" کی حیثیت رکھتے ہیں جن کے لیے نشرگاہ ضروری ہے وہاں سے جو چیز نشر ہوگی وہی آپ کی دید و شنید میں آئے گی۔ مگر راڈار اس سے بے نیاز ہے۔ وہ بذاتِ خود عکس گاہ بھی ہے اور نشرگاہ بھی۔ اس سے برق پاروں کی تیز شعاعیں نکل کر سینکڑوں میل کے دائرہ پر چھا جاتی ہیں۔ اور فضا و خلا کے گوشہ گوشہ کو اپنی لپیٹ میں لیکر اس کے اندر کی ہر چیز کا عکس لے کر راڈار کے پردہ پر (جو ٹیلیویژن سکرین جیسا ہوتا ہے) منعکس کردیتی ہیں۔ جہاں سے بھی یہ برقی شعاعیں گزرتی ہیں وہاں کی ہر سیاہ و سفید چیز کی ہو بہو تصویریں لے لیتی ہیں۔ اسی طرح مغربی جرمنی کی پولیس نے ارتکاب جرائم کے وقت غیر مرئی شعاعوں کا استعمال شروع کردیا ہے جن کی بدولت پولیس تاریکی میں نین سو گز تک دیکھ سکے گی لیکن مجرم پولیس کو نہ دیکھ سکیں گے یہ شعاعیں ساتھ ساتھ

وقوعہ کی تصاویر بھی لیتی رہیں گی جو مجرموں کے خلاف عدالت میں بہ طور شہادت پیش کی جائیں گی۔

جس طرح انسان کا خودساختہ راڈار سسٹم فضاو خلاء سے سینکڑوں میل کے اندر کی ہر چیز کو دیکھ لیتا ہے اور اس کی تصویر کھینچ لیتا ہے اس طرح خالق کی یہ مخفی مخلوق یعنی فرشتے انسان کے ہر فعل کو دیکھتے اور لکھتے رہتے ہیں جن کی فلم بروز حشر اسے دکھلادی جائے گی۔

قیامت کا تصوّر

قرآنی اطلاعات کی بناء پر یہ مادی دنیا ایک دن فنا ہو جائے گی۔ بساطِ کائنات الٹ دی جائے گی اور نیک و بدلوگوں کی آبادکاری شروع ہو جائے گا۔ نیکوں کو "راحت کالونی" میں بسایا جائے گا۔ اور بدوں کو "معذب کالونی" میں آباد کیا جائے گا۔ زندگی کا یہ دور دائمی اور ابدی اور لامتناہی ہوگا۔ پیرپرست اسے بھی ایک شاعر کا تخیل سمجھتے ہیں لیکن سائنسدان اپنی لیبارٹریوں کے روزنوں سے اس کائنات کی زوال پذیری کا بچشم خود مشاہدہ کر رہے ہیں۔

برطانوی ماہر طبیعیات وفلکیات سرجیمز جینس (SIR JAMES JEANS) کے قول کے مطابق طبیعات جدید کی رو سے ساری کائنات مادی لہروں کا مجموعہ ہے جو دو قسم کی ہیں۔ کچھ لہریں منجمد ہیں جنہیں ہم مادہ کہتے ہیں کچھ غیر منجمد ہیں جنہیں شعاع یا نور کہا جاتا ہے۔ جدید سائنس کی رو سے مادہ کی تعریف بدل گئی ہے پہلے مادہ اسے کہتے تھے جو جسم و حجم رکھتا ہو مگر اب :-

---

لے اسرار کائنات صد ۱۲۳

"مجموعہ جسم و حجم (مادہ) اپنی بساطتِ جوہری میں چند قسم کی شعاعوں کا مجموعہ ہے اور تمام کائنات ایک مستقل، ہمہ گیر قوت کے مظاہر گوناگوں کا غیر مستقل مجموعہ ہے" (حیات مابعد صہ ۴۴)

تخلیق جدید کی رو سے یہ "غیر مستقل مجموعہ" مندرجہ ذیل صورتوں میں اپنی "مستقل منزل" کی طرف رواں دواں ہے۔

۱۔ سورج آگ کا ایک ایسا گولہ ہے جسے باہر سے ایندھن سپلائی نہیں ہوتا ہارورڈ یونیورسٹی کے ماہر فلکیات ایچ شیپلے (H-SHAPLEY) کے اندازہ کے مطابق سورج شعاع افگنی کے ذریعہ ہر منٹ میں ۲۵ کروڑ ٹن کے لگ بھگ اپنا وزن کھو رہا ہے جس کی وجہ سے اس کی فطری استعداد میں تدریجاً کمی واقع ہو رہی ہے اور ماہر فلکیات جارج گیمو (GEORGE GAMOW) کے اندازہ کے مطابق:-

"سورج اپنے آخری لمحات میں چاند کو اتنی قلیل روشنی دے گا کہ وہ بمشکل نظر آسکے گا۔ زمین کا درجہ حرارت نقطہ انجماد سے دو سو درجے نیچے گر جائے گا (۳۲۸ ف) لیکن یہ تیرگی اور خنکی ہمارے لیے کوئی اہمیت نہیں رکھتی کیونکہ سورج کے آخری بار سکڑنے اور موت سے ہم آغوش ہونے سے بہت پہلے ہی اس کی شدید گرمی کے باعث نسلِ انسانی جل کر راکھ ہو چکی ہوگی (سورج کی موت و پیدائش صہ ۲۱۳)

۲۔ حرکیاتِ حرارت کے اصول ثانی کے مطابق کائنات میں قوت کی جتنی مقدار ہے وہ تیزی سے حرارت میں بدل رہی ہے تبدیلی کے اس مسلسل عمل کے طور پر ایک وقت ایسا آئے گا کہ جب تمام قوت حرارت میں بدل جائے گی

اور قوت کی کوئی مقدار کائنات کے پاس باقی نہ رہے گی جس کی وجہ سے وہ اپنی موت آپ مرجائے گی۔

۳۔ حرکیات کے بے رحم قوانین، دنیا کو سورج سے لمحہ بہ لمحہ دور پھینک رہے ہیں اور وہ مسلسل دوری کی وجہ سے ایک دن اتنی سرد ہو جائے گی کہ حیات اس پر جم کر رہ جائے گی۔

۴۔ علم کیمیا کی رو سے بھی مادہ بتدریج فنا ہو رہا ہے گو اس کی بعض انواع کے معدوم ہونے کی رفتار انتہائی سست ہے

۵۔ کائناتِ اصغر یعنی حضرتِ انسان کی طرح کائناتِ اکبر یعنی یہ مادی دنیا بھی ایک زندہ جسم واحد ہے جس کا ہر ذرہ اور ہر جزو متحرک و زندہ ہے جس طرح ہر انسان موت یا قبر کی طرف تیزی سے دوڑ رہا ہے اسی طرح اس مادی کائنات کی طبعی عمر بھی روز بروز گھٹتی جا رہی ہے۔ اور ایک دن یہ بھی انسان کی طرح فنا ہو جائے گی۔ مشہور سائنسدان سر جیمز جینیس اپنی کتاب (MYETERIOUS UNIVERSE) یعنی پراسرار کائنات میں امور بالا پر طویل بحث کرنے کے بعد ہمیں اس نتیجہ پر پہنچاتے ہیں۔

"علم حرکیاتِ حرارت نے واضح کیا ہے کہ فطرت اپنی آخری حالت پر پہنچنے سے پہلے ایک ایسے عمل سے گزرتی ہے جسے اضافہ نارگی (IN (CREASE OF ENTROPY) کہتے ہیں یہ ضروری ہے کہ ناکارگی برابر بڑھتی رہے وہ کسی نقطہ پر خاموش ہو کر نہیں رک سکتی اسے برابر بڑھتے رہنا چاہیئے۔ تا اینکہ وہ مرحلہ پیدا ہو جائے جب مزید اضافہ کا امکان

ہی نہ رہے سبب بہ منزل آباد ہے کی نو مزید ارتقا ممکن ہو جائے گا اور کائنات مردہ ہو کر رہ جائے گی علم حرکیات حرارت کسی قیام کسی سکون کی اجازت نہیں دیتا سوائے ایک قیام اور سکون کے وہ قیام و سکون قبر کا قیام اور سکون ہے" (پراسرار کائنات ص ۲۰۹)

اس لیے قیامت اب شاعری نہیں رہی بلکہ ایک سائنٹیفک حقیقت بن گئی ہے جس کی قرآن نے ان الفاظ میں خبر دی ہے کہ:۔

ان الساعة لاٰتیة لاریب فیہا ولکن اکثر الناس لا یومنون ۔ (مومن ۶/۲۴)	قیامت ضرور ہی آکر رہے گی اس میں کوئی شک نہیں لیکن اکثر لوگ نہیں مانتے۔

محاسبۂ آخرت

بعض کو آخرت کے حساب کتاب کا بھی یقین نہیں حالانکہ جس طرح زندگی یا ملازمت کے دوران میں ہر بالا دست اپنے زیردستوں کا محاسبہ کرتا رہتا ہے اسی طرح وہ مالک حقیقی بھی بروز حشر انسان سے زندگی بھر کا حساب لے گا۔ اس روز وہ اسی انکم ٹیکس گذار کی طرح پریشان ہوگا جو حساب میں ہیر پھیر کے باعث اپنی سالانہ آمدنی کا انکم ٹیکس آفیسر کو حساب دیتے وقت پریشان ہوتا ہے انسان انسان کو تو دھوکا دے سکتا ہے۔ مگر خدائے علیم کو دھوکا نہیں دے سکتا کیونکہ اس وقت انسان کا اپنا نامہ اعمال اس کے اپنے سامنے کھلا ہوگا اور اس کے اپنے اعضا یعنی آنکھیں۔ کان۔ زبان اور ہاتھ پاؤں اس کے خلاف اسی طرح گواہی دے رہے ہوں گے جس طرح گراموفون کا ریکارڈ فلم کی ریل اور ٹیپ ریکارڈر کی

کیسٹ بے جان مادہ ہونے کے باوجود کسی کا کلام پیش کررہی ہوتی ہے اور اس وقت ہم اپنی ساری عمر بھر کی کارکردگی اسی طرح اپنی آنکھوں سے پردۂ حشر پر دیکھ لیں گے جس طرح ایک اداکار کی کئی سالوں کی کارگزاری کو ہم چند گھنٹوں میں پردۂ سکرین پر دیکھ لیتے ہیں۔

محاسبہ کی افادیّت

قیامت اور محاسبہ کا عقیدہ ہی ایک ایسا مؤثر عقیدہ ہے جس سے انسان کے اعمال واخلاق براہِ راست متاثر ہوتے ہیں اس کی وسعت و اہمیت کے علماً اخلاق بھی معترف ہیں "تاریخ اخلاقِ یورپ" کے مصنّف ولیم لیکی لکھتے ہیں :-

"اگر انسان واقعی یہ سمجھ لے کہ اسے اپنے اعمال کا معاوضہ ایک دائمی عذاب یا ایک دائمی ثواب کی صورت میں کسی ہمہ دان اور ہمہ بین حاکم کی عدالت میں ملے گا۔ تو یہ خیال نیک کرداری کا ایک ایسا زبردست محرک ہوگا جس کے سامنے ارتکاب معصیت کی کوئی نادیل چل نہیں سکتی" (صد ۱۳)

سائنس کی اہمیّت

سائنس فی الحقیقت آیات اللہ میں سے ہے جس نے فرعنۂ مصر کے ہاں جنم لیا۔ منکرین وملحدین کے ہاتھوں پرورش پائی۔ دنیا کو جنت کی راحت دوزخ کے عذاب اور قیامت کے قیام کا نمونہ دکھایا۔ خدادوستی وخدا شناسی کو دعوت دی قرآنی نظریات کی صحت کا اعتراف کرایا۔ اوران کے لیے اتمام حجت بن کر رہی جنھوں نے اپنے کفر وانکار پر اصرار کیا۔ بروز حشر ان کی اپنی سائنسی ایجادات واختراعات ہی انہیں جھٹلانے کے لیے کافی ہوں گی۔

منشی عبدالرحمٰن خاں

(۴)

وجودِ باری سائنس کی نظر میں

(از ڈاکٹر کریسی موریسن صدر نیویارک اکیڈمی آف سائنس)

ہمارا دور ابھی تک زمانہ سائنس کی جمع کا دور ہے اور جوں جوں اجالا بڑھتا جارہا ہے۔ توں توں ایک ذہین خالق کے دستِ قدرت کی نیرنگیوں کا زیادہ سے زیادہ انکشاف ہوتا جارہا ہے۔ ڈارون سے نوے برس بعد ہم حیرت انگیز انکشافات کر چکے ہیں۔ سائنس کی عاجزانہ اسپرٹ اور علم کی چکی میں پسے ہوئے ایمان کے ساتھ ہم خدا کی معرفت کے مقام کے بہت قریب پہنچ چکے ہیں۔ جہاں تک میری ذات کا تعلق ہے۔ خدا پر میرے ایمان کی بنیاد سات باتوں پر ہے۔

اوّل ۔ ریاضی کے غیر متزلزل قانون کے ذریعے ہم ثابت کر سکتے ہیں کہ ہماری اس کائنات کے مدبر معمار اعلیٰ پائے کی ایک انجنیری کی ذہانت رکھنے والی ہستی ہے فرض کیجئے کہ آپ دس پیسوں کو ایک سے دس تک کے نشانات لگا کر جیب میں ڈال لیتے ہیں اور ان کو خوب ہلا جلا کر چھوڑ دیتے ہیں۔ اب اگر آپ کو یہ کہا جائے کہ ان پیسوں کو نشانات کی ترتیب کے مطابق جیب سے نکالیے اور پھر واپس ڈالتے جائیے اور ہر مرتبہ جیب میں ان کو ہلا جلا دیجئے تو ریاضی کی رو سے ہمیں معلوم ہے کہ آپ کا پہلی مرتبہ صحیح نشان والے سکے کو نکال لینے کا امکان ۱/۱۰ ہے۔ بالترتیب پہلے اور دوسرے نشانات والے پیسوں کے صحیح نکال لینے کا امکان ۱/۱۰۰ ہے۔ پہلے دوسرے اور تیسرے نشانات والے پیسوں کو بالترتیب صحیح نکال لینے کا امکان ۱/۱۰۰۰

اور اسی طرح بڑھاتے چلے جایئے۔ یہانتک کہ پہلے سے لیکر دسویں نمبر تک کے پیسوں کو اسی ترتیب کے ساتھ صحیح نکال لینے کا امکان ایک ناقابل یقین تک پہنچا ہوا حصہ یعنی $\frac{1}{10,000,000,000}$ ہوگا۔ اس دلیل کے مطابق زمین پر زندگی بسر کرنے کے واسطے بہت سی لازمی شرائط کا ہونا ضروری ہے۔ اور ان کا مناسب حد تک موجود ہونا کسی اتفاقی امر پر موقوف نہیں ہے۔ زمین اپنے محور کے گرد ... ہزار میل فی گھنٹہ کی رفتار سے گردش کر رہی ہے۔ اگر یہ رفتار ۱۰۰ میل فی گھنٹہ رہ جائے تو ہمارے دن رات کی لمبائی آج کی نسبت سے ۱۰ گنا بڑھ جاتے۔ اور سورج کی گرمی اس طویل دن کے اندر سبزیوں اور دیگر نباتات کو جھلسا کر رکھ دے۔ ادھر لمبی لمبی راتوں میں نئی نئی کونپلیں یخ بستہ ہو کر رہ جائیں۔ زمین کا ترچھا پن جسے ہم ۲۳ درجے کا زاویہ کہتے ہیں ہمارے موسموں کا باعث بنتا ہے۔ اگر اس کے اندر یہ ٹیڑھ نہ ہوتی تو سمندر کے بخارات شمال جنوب کی طرف چلے جاتے اور ہمارے لئے کئی برفانی براعظم تیار کرتے چلے جاتے۔

اگر ہمارا چاند فرض کیجئے کہ اپنے حقیقی فاصلے کے بجائے زمین سے ۵۰ ہزار میل دور ہوتا تو سمندر کی لہریں اتنی زیادہ ہوتیں کہ ہمارے تمام براعظم دن میں دو مرتبہ زیر آب آجایا کرتے۔ یہاں تک کہ پہاڑ بھی آہستہ آہستہ کٹ کٹ کر ریزہ ریزہ ہو جاتے اگر سطح زمین اپنی موجودہ موٹائی سے صرف ۱۰ فٹ اور زیادہ موٹی ہوتی تو آکسیجن پیدا ہی نہ ہوسکتی۔ جس کے بغیر حیوانی زندگی کا خاتمہ ہو جاتا۔ اگر سمندر چند فٹ اور گہرے ہوتے تو کاربن ڈائی اکسائڈ اور آکسیجن جذب ہو کر رہ جاتیں اور نباتات کا وجود باقی نہ رہتا یا اگر ہماری فضا لطیف تر ہوتی تو لاکھوں ٹوٹنے والے ستارے جو روزانہ خلا میں جل کر رہ جاتے ہیں۔ زمین کے ہر حصے سے ٹکراتے اور ہر جگہ آگ لگا دیتے۔ ان وجوہ

ہے اور ان جیسی کئی اور مثالوں سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ ایک کے کروڑویں حصے میں بھی اس امر کا امکان نہیں پایا جاتا کہ ہمارا سیارہ (زمین) ایک اتفاقی حادثہ کا نتیجہ ہے۔

دوم حصولِ مقصد کیلئے زندگی کا پُر از وسائل ہونا ایک عقلِ کُل کی شہادت دیتا ہے۔ زندگی بجائے خود ہے کیا؟ کسی نے اس بات کی گہرائی کا اندازہ نہیں لگایا زندگی نہ تو وزن رکھتی ہے نہ جسامت، البتہ یہ قوت رکھتی ہے۔ ایک ابھرتی ہوئی جڑ چٹان میں شگاف کر دیتی ہے۔ زندگی نے پانی اور زمین اور ہوا کو مسخر کر لیا ہے۔ عناصر پر قابو پا کر انہیں پگھلنے اور اختلاط کی باہمی اصلاح پر مجبور کر دیا ہے۔ اب ذرا چمکدار جیلی نما۔ ہلنے والے پروٹوپلازم قطرے کو ملاحظہ کیجئے۔ جو سورج سے قوت حاصل کرتا ہے اور جو تقریباً ناقابل دید ہوتا ہے۔ یہ ایک ننھا سا واحد اور ایک ذرا سی چمکدار دھندیالی بوند یا اپنے اندر زندگی کا ایک جرثومہ رکھتی ہے۔ اور چھوٹی بڑی ہر جاندار شے تک زندگی کو پہنچا دینے کی طاقت بھی رکھتی ہے۔ اسی ننھی سی بوند کی طاقتیں ہماری نباتات اور جانوروں اور انسانوں کی طاقتوں سے زیادہ ہیں کیونکہ تمام زندگی اسی کی طرف سے آتی ہے۔ قدرت نے زندگی پیدا نہیں کی آگ سے جھلسی ہوئی چٹانیں اور بے نمک سمندر ضروریات کو پورا نہیں کر سکتے تھے۔ پھر وہ کون ہے۔ جو انہیں یہاں لے آیا ہے۔

سوم عقلِ حیوانی بلاشبہ ایک بہترین خالق کی شہادت دیتی ہے۔ جس نے اس بے سہارا مخلوق کی ذات کے اندر یہ مادہ ودیعت کیا ہے۔ چھوٹی سالمن مچھلی کئی سال سمندر میں بسر کرنے کے بعد اپنے دریاؤں میں واپس آتی ہے۔ اور دریا کی اسی جانب کو سفر کرتی ہے۔ جہاں وہ نالہ آکر گرتا ہے جس میں اس کی پیدائش ہوئی تھی۔ کون

ہے؟ جواب ٹھیک اسی مقام پر واپس لاتا ہے؟ اگر آپ اسے کسی دوسرے نالے میں منتقل کر دیں تو اسے فوراً پتہ چل جائے گا کہ وہ اپنے راستے سے دور جا پڑی ہے لہٰذا وہ واپس دریا کی طرف جا کر پھر اپنا راستہ تلاش کرنے کیلئے جدوجہد کرے گی اور بہاؤ کے خلاف تیر کر اپنی قسمت کو بہترین انجام تک پہنچائے گی۔

ایل (Eel) مچھلی کے راز کو سمجھنا اور بھی مشکل ہے۔ یہ حیرتناک مخلوق بلوغ کی عمر پہنچتے ہی ہر جوہڑ، تالاب اور دریا سے ہر جگہ سے یورپ کے ہزار ہا میل کے سمندر کا سفر طے کر کے برمودہ کے قریب اتھاہ سمندری گہرائیوں میں پہنچ جاتی ہے۔ وہاں بچے دیتی اور مر جاتی ہے۔ اس کے بچے جن کے پاس بظاہر کوئی ذریعہ نہیں ہوتا، کسی بات کے جاننے کا سوائے اس کے کہ وہ پانی کی بے پناہ وسعتوں میں ہیں، اس کے باوجود وہ واپس چل پڑتے ہیں۔ اور نہ صرف اسی ساحل کا راستہ اختیار کرتے ہیں جہاں ان کے والدین آئے تھے۔ بلکہ وہاں سے وہ ان آبائی دریاؤں جھیلوں اور چھوٹے چھوٹے جوہڑوں تک پہنچ جاتے ہیں اور یوں پانی کا ہر خطہ ہمیشہ ایل مچھلی سے بھرا رہتا ہے

ایک بھڑ ایک پتنگے کو بے بس کر لیتی ہے۔ پھر زمین میں ایک سوراخ کھودتی ہے۔ پتنگے کو ٹھیک جگہ پر ڈنک مارتی ہے تاکہ وہ مر نہ جائے بلکہ صرف بے ہوش ہو اور محفوظ گوشت کی صورت میں زندہ رہے پھر بھڑ سلیقے کے ساتھ انڈے دیتی ہے تاکہ اسکے بچے جب انڈوں سے نکل آئیں تو پتنگے کو مارے بغیر اسے کھا سکیں۔ ان کے واسطے مرے ہوئے پتنگے کا گوشت مہلک ہوتا ہے۔ پھر ماں وہاں سے اڑ جاتی ہے اور باہر جا کر مر جاتی ہے۔ اور واپس آ کر کبھی اپنے بچوں کو نہیں دیکھتی۔ یہ پراسرار ترکیبیں سیکھنے سکھانے سے نہیں آئیں بلکہ یہ فطرت میں سمودی جاتی ہیں۔

چہارم ۔ انسان کو عقل حیوانی سے بڑھکر قوت استدلال بھی عطا ہوئی ہے۔ کسی دوسرے حیوان نے اپنی قابلیت کا کبھی اتنا ریکارڈ بھی نہیں چھوڑا ہے کہ وہ دس تک گن سکا ہو یا دس کے معنی ہی جانتا ہو۔ جہاں عقل حیوانی بانسری کی ایک دھن کی مانند ہے خوبصورت لیکن محدود وہاں انسانی دماغ آرکسٹرا کے ہر ساز کی ہر دھن کا حامل ہے۔ اس چوتھے نکتے کی زیادہ وضاحت کی ضرورت نہیں ہے۔ انسانی استدلال کی بدولت ہم اس بات کے امکان کو جان سکتے ہیں کہ ہم وہی کچھ ہیں جو کچھ کہ ہم ہیں۔ کیونکہ ہمیں اس عقل کل سے ایک روشنی کی کرن حاصل ہوئی ہے۔

پنجم ۔ تمام جانداروں کے وجود کے انتظار کا انکشاف ایک فطری اصول کے ذریعے ہوا ہے۔ جیسے ڈارون نہیں جانتا تھا لیکن جیسے آج ہم جانتے ہیں مثلاً جینز (Genes) کی حیرتناکیاں۔ یہ چیز اتنی ننھی سی مخلوق ہے کہ اگر دنیا کے تمام ذی حیات انسانوں کے جینز کو ایک جگہ جمع کر لیا جائے تو وہ سب زیادہ سے زیادہ درزی کی انگشتری میں سما جائیں گے۔ تاہم یہ صرف خوردبین سے نظر آنے والی مخلوق اور ان کے ساتھی کروموسومز (Chromosomes) ہر زندہ جسم میں وجود رکھتے ہیں اور تمام انسانی، حیوانی، اور نباتاتی مخلوق کی اصل ہیں۔ یہ جینز ان تمام مختلف آباؤاجداد کی وراثت کو کیونکر محفوظ کر لیتے ہیں۔ اور ہر ایک کی تعینات کو اتنی بے حقیقت جگہ میں کیسے سمو لیتے ہیں۔ حقیقتاً ارتقا یہیں سے شروع ہوتا ہے۔ جسم کے اس خانہ کے اندر سے جو جینز کو لئے ہوئے چلتا ہے۔ لاکھوں ایٹم خوردبینی جینز کی صورت میں بند ہو کر قطعی طور پر کرۂ ارض کی پوری زندگی پر کیسے حکمرانی کرتے ہیں؟ یہ ایک مثال ہے۔ اکمل ترین ہوشیاری کی اور ایک ایسا انتظام ہے کہ جو فقط ایک خالق ذہن ہی کر سکتا ہے۔ یہاں

دوسرا کوئی قیاس کام نہیں دے سکتا۔

ششم۔ قدرت کی کفایت شعاری سے ہم یہ سمجھنے پر مجبور ہیں کہ صرف ایک لامحدود عقل ہی اس کی پیش بینی کر سکتی ہے اور ایسی تیز فہمی کے ساتھ کفایت شعاری سے کام لے سکتی ہے۔ کئی سال کی بات ہے کہ آسٹریلیا میں تھوہر کا ایک پودا لگا یا گیا چونکہ آسٹریلیا میں اس کے دشمن کیڑے موجود نہیں تھے۔ اس لئے وہ وہاں پر جلد ہی غیر معمولی طور پر بڑھنے لگا۔ اس کی چونکا دینے والی کثرت نے یہاں تک طول کھینچا کہ اس پودے نے انگلستان جتنا لمبا چوڑا رقبہ گھیر لیا۔ باشندے شہروں اور دیہاتوں سے نکلنے پر مجبور ہو گئے۔ ان کے کھیت برباد ہو گئے۔ یہاں تک کہ کیڑوں مکوڑوں کے ماہرین دنیا میں اس کا علاج دریافت کرنے کے لئے نکل کھڑے ہوئے۔ بالآخر انہوں نے ایک کیڑا پا ہی لیا کہ جس کی زندگی کا انحصار فقط تھوہر کے کھانے پر ہے اور دوسری کوئی چیز نہیں کھاتا۔ وہ آسٹریلیا میں آزادی کے ساتھ کھا سکتا تھا۔ جہاں اس کا کوئی دشمن بھی نہیں تھا۔ پس حیوان نے نباتات پر فتح پائی اور آج تھوہر کی بیماری کو ختم کر دیا گیا ہے۔ اور اس کے ساتھ ہی اس کیڑے کو بھی صرف اس کی تھوڑی سی تعداد کو رکھ لیا گیا ہے۔ تاکہ وہ ہمیشہ کے لئے تھوہر کو قابو میں رکھ سکے۔ اس قسم کی روک اور توازن کے انتظامات عالمی اور آفاقی درجے میں کئے گئے ہیں۔ جلد جلد پیدا ہونے والے کیڑے مکوڑے روئے زمین کو بھر کیوں نہیں دیتے؟ اس لئے کہ ان کے پھیپھڑے نہیں ہوتے جیسے کہ آدمی کے ہوتے ہیں۔ وہ نالیوں کے ذریعے سانس لیتے ہیں۔ لیکن جب کیڑے بڑے ہو جاتے ہیں تو ان کی نالیاں ان کی جسامت کے مطابق نہیں بڑھتیں۔ یہی وجہ

ہے کہ کوئی کیڑا بڑے قد کا نہیں ہوتا۔ نشوونما کی اس تحدید نے انہیں محدود کر رکھا ہے۔ اگر جسمانی تحدید و بندش کا یہ انتظام نہ ہوتا تو انسان ہرگز زندہ نہ رہ سکتا۔

ہفتم ۔ یہ حقیقت کہ خدا کا تصور انسان کے قیاس میں آسکتا ہے۔ بجائے خود ایک بے نظیر ثبوت ہے۔ خدا کا تصور انسان کی ایک روحانی قوتِ ذہنی میں سے ابھرتا ہے۔ وہ قوت جسے ہم قیاس کہتے ہیں۔ اس کی طاقت سے انسان اور صرف انسان ہی ان دیکھی اشیاء کا ثبوت پا سکتا ہے۔ یہ طاقت جس راستے کی طرف رہنمائی کرتی ہے۔ وہ لامحدود ہے۔ بلاشبہ انسان کا تکمیل یافتہ تصور ایک روحانی حقیقت بن جاتا ہے۔ پھر وہ اس تدبیر اور مقصد کے حق میں تمام شہادتوں کو شناخت کر سکتا ہے۔ اور ہر جگہ اور ہر شے میں اس عظیم آسمانی سچائی کو دیکھ سکتا ہے۔ اور یہ کہ خدا ہر جگہ ہے۔ اور ہر شئے میں ہے۔ لیکن کہیں بھی وہ ہم سے اتنا قریب نہیں ہے۔ جتنا کہ وہ ہمارے دل میں ہونے سے ہے۔

---

(۵)

صفاتِ ربانی سائنس کی روشنی میں

از منشی عبد الرحمن خاں

مذہب اور سائنس

جب سے مغرب کی مادی اور میکانکی تہذیب کی شعاعوں نے عالم اسلام کو منور کرنا شروع کیا ہے اس کے "روشن خیال" طبقہ میں یہ عقیدہ روز بروز زور پکڑتا جا رہا ہے کہ سائنس مذہب کی مخالف ہے۔ مگر واقعات اس نظریہ کی تائید نہیں کرتے۔ کیونکہ سائنسدان تو شب و روز

ویتفکرون فی خلق السمٰوٰت والارض (آل عمران ۱۹۱/۳) — آسمانوں اور زمین کی پیدائش میں غور کرتے رہتے ہیں۔

سائنس تمام مادی علوم کا سرچشمہ معلومات کا خزینہ اور معرفتِ الٰہی کا گنجینہ ہے اس کا کام مادیات کے پرپیچ راستوں کے ذریعہ انسان کو حق و صداقت تک پہنچانا اور علم کیمیا۔ طبعیات۔ طبیعیات، حیاتیات، نباتات، حیوانیات، ریاضیات، حرکیات، شماریات ارضیات۔ اور فلکیات کے ذریعہ اسرار فطرت کا سراغ لگانا ہے اس لیے مذہب و سائنس دو مخالف قوتیں نہیں بلکہ بقول علامہ اقبال:۔

"سائنس اور مذہب" حقیقت تک پہنچنے کے دو مختلف

راستے ہیں:

فرق صرف اتنا ہے کہ مذہب کی بنیاد الہٰیات پر ہے جو قطعی اور حتمی ہیں اور جن میں غلطی، ترمیم یا تنسیخ کا کوئی امکان نہیں اور سائنس کی بنیاد عقلیات پر ہے جس میں ہر وقت غلطی اور تبدیلی کا امکان رہتا ہے اسی لیے سائنس کے نظریات ونتاسبات ہر دور میں بدلتے رہے مگر مذہب کا کوئی اصول ونظریہ آج تک نہیں بدلا

خدا اور سائنسدان

ہمارا وہ نو تعلیم یافتہ طبقہ جو خدا کی بجائے سائنس پر ایمان بالغیب رکھتا ہے اس غلط فہمی میں مبتلا ہے کہ سائنسدان خدا کے منکر ہیں۔ ماہر عضویات انڈریو کان وے کے قول کے مطابق :-

"یہ سائنسدانوں پر محض اتہام ہے سائنس کی دنیا میں جتنے نامور لوگ گزرے ہیں ان کی عظیم اکثریت خداوندتعالیٰ کے وجود کی قائل ہے انکار خدا تو اس اندازِ فکر کے ہی منافی ہے جس کے مطابق ایک سائنسدان سوچتا اور تحقیقات کے میدان میں آگے بڑھتا ہے وہ اپنے کام کا آغاز اس بنیادی تصور سے کرتا ہے کہ کوئی مشین بھی مشین ساز کی قوتِ فکر وعمل کے بغیر معرضِ وجود میں نہیں آسکتی علت ومعلول کا اصول ہی دراصل اس کی اساس ہے ......

یہ قول کہ خدا موجود ہے اس کو جھٹلایا نہیں جاسکتا کارل مارکس اور لینن کی طرح بہت سے ملحدین نے باری تعالیٰ کے وجود کی نفی تو کی لیکن اس کے انکار کے لیے وہ آج تک کوئی عقلی ثبوت

فراہم نہیں کر سکے'' (خدا موجود ہے ص ۳۷۳ ص ۸۵-۳۸۴)

اَن دیکھی حقیقتیں

منکرین و ملحدین کا یہ عقیدہ کہ ہر وہ چیز جو تجربہ و مشاہدہ میں نہیں آسکتی تسلیم نہیں کی جاسکتی محض ایک عذر لنگ اور خود فریبی ہے کسی چیز کا علم و مشاہدہ میں نہ آنا اس کے عدم کی دلیل نہیں ہو سکتی جس پر خود انسان کا اپنا وجود اور اس کا علم شاہد عدل ہے کوئی شخص خود کو باپ کے نطفہ سے بنتے اور ماں کے پیٹ سے نکلتے نہیں دیکھ سکتا۔ اسے سماج اور ماحول بتلاتا ہے کہ الف تمہارا باپ اور بے تمہاری ماں ہے تو وہ دید کی بجائے شنید پر ایمان لے آتا ہے۔ حالانکہ یہ بات غلط بھی ہو سکتی ہے۔ کہ وہ فی الحقیقت الف کے نطفہ سے نہ ہو بلکہ ج کے نطفہ سے ہو۔ یا ن بیاہی ماں کے سوشل اختلاط کا نتیجہ ہو اور یہ اولاد جوڑے کے گھر میں روز اول سے پرورش پا رہا ہو (جیسا کہ مغربی دنیا میں عام رواج ہے) مگر سماعی شہادت کی بنا پر وہ الف کو اپنا باپ اور بے کو اپنی ماں تسلیم کرنے پر مجبور ہوتا ہے۔ زندگی کے مختلف مظاہر سے پتہ چلتا ہے کہ انسان کے اندر روح، عقل اور شعور کار فرما ہے انسان ان کو نہیں دیکھ سکتا۔ مگر ان کے وجود سے انکار بھی نہیں کر سکتا۔ جیسے وہ اپنی نظر سے سب کو دیکھتا ہے مگر اپنی نظر کو خود نہیں دیکھ سکتا اس لیے انسان کی خشت اول ہی اس نہج پر رکھی گئی ہے کہ وہ ان دیکھی حقیقتوں پر ایمان لا سکے بقول سید صدیق حسن آئی سی ایس:۔

''بہت سی وہ باتیں جو پہلے ایمانیات میں داخل سمجھی جاتی تھیں اور جن کا انکار صرف اس وجہ سے کیا جاتا تھا کہ وہ سائنس کے تجربات

کی گرفت میں نہیں آئیں۔ اب ان کے بنیادی مسلمات سائنس کی جدید ترین انکشافات سے ثابت ہوتے چلے جا رہے ہیں"۔
(صدق جدید ۸ مئی ۱۹۶۴ء)

تخلیقی عناصر

جدید سائنسی تحقیقات کی رو سے اس کائنات کی تخلیق و ترتیب میں مختلف عناصر کا حصہ ہے یونانی حکما فیثا غورث اور ارسطو کا خیال تھا کہ یہ دنیا اربعہ عناصر یعنی مٹی، پانی ہوا اور آگ سے بنی ہے۔ حکمائے عرب کا خیال تھا کہ یہ چار چیزوں سے نہیں بلکہ سات چیزوں سے بنی ہے مذکورہ بالا چیزوں کے علاوہ اس میں گندھک، پارہ اور نمک بھی شامل ہے تجربات و مشاہدات رفتہ رفتہ ان عناصر میں اضافہ کرتے چلے گئے یہاں تک کہ انیسویں صدی عیسوی میں ان عناصر کی تعداد ۹۲ تک پہنچ گئی۔ اور بیسویں صدی کے انکشافات و اکتشافات نے ان کی تعداد ۱۰۲ تک پہنچا دی یعنی اس دنیا کو ۱۰۲ اجزا نے مل کر وجود بخشا ہے ان ۱۰۲ اجزا میں سے ہر ایک کی صفت جدا جدا ہے جس سے ثابت ہوتا ہے کہ یہ کارخانہ عالم ایک ایسی ہستی کا تیار کردہ ہے جو ۱۰۲ صفات کمالیہ رکھتی ہے اور ان کے انفرادی اور اجتماعی ظہور پر قادر ہے۔ قرآن کریم کی رو سے یہ جامع الصفات ذات بابرکات صرف باری تعالیٰ کی ہے:۔

اَللّٰہُ خَالِقُ کُلِّ شَیْءٍ (زمر ۶۲) اللہ ہی ہر چیز کا پیدا کرنے والا ہے

عناصر کا ماخذ

سائنس کی جدید تحقیقات کی رو سے تمام کے تمام ۱۰۲ عناصر جن سے تمام مادی اشیاء بنی ہیں اولاً بشکل نورانی

کی شکل میں تھے۔ برقی توانائی سے برقیے بشکل الیکٹرون و پروٹون خارج ہوئے برقیوں سے گیس پیدا ہوئی۔ گیس سے سیال بنا اور سیال نے جامد کی صورت میں قرار پایا۔ یہ مادہ دراصل توانائی کی کثیف ترین شکل ہے اس میں جوں جوں لطافت بڑھتی جاتی ہے اس کی ہیت کم ہوتی چلی جاتی ہے اور اس کی توانائی، بڑھتی جاتی ہے گویا مذکورہ بالا ۱۰ عناصر کا پانچ صورتوں میں ظہور ہوا۔ اور یہی پانچ چیزیں سائنس کی ایجانیات میں سے ہیں۔ مشہور عالم جریدہ "سائنس" نے ان پانچ چیزوں کی ذات وصفات پر ان الفاظ میں روشنی ڈالی ہے:۔

۱۔ جامد (SOLID) اس کی جسمیت کا احساس نمایاں اور مستقر ہے اپنی ذات سے پہچانی جاتی ہے بہت کثیف ہے اور وزن رکھتی ہے۔

۲۔ سیال (LIQUID) اس کی جسمیت کا احساس نمایاں ہے۔ مگر جسمیت غیر مستقر ہے تاہم اپنی ذات سے پہچانی جاتی ہے وزن رکھتی ہے اور ٹھوس کی نسبت لطیف ہے۔

۳۔ گیس (GASE) اس کی جسمیت کا احساس نہ نمایاں ہے اور نہ مستقر ہے نہ اپنی ذات سے پہچانی جاسکتی ہے نہ صفات سے بلکہ آثار سے صفات کا علم ہوتا ہے اور صفات سے ذات کا۔ وزن یہ بھی رکھتی ہے مگر سیال سے زیادہ لطیف ہے۔

۴۔ برقیے (الیکٹرون ELECTRON اور پروٹون PROTON) ان میں برائے نام جسمیت ہے جو نہ ہونے کے برابر ہے۔ نہ اپنی ذات سے پہچانے جاتے ہیں نہ صفات سے بلکہ آثار سے پہچانے جاتے

ہیں۔ یہ وزن تو رکھتے ہیں مگر اتنا کہ اس وزن کا تصور کرنا مشکل ہے مثلاً ایک الیکٹرون کا وزن ہائیڈروجن گیس کے ایک جوہر کا دو ہزارواں حصہ ہے۔ یہ نفیس گیس سے زیادہ لطیف ہوتے ہیں۔

۵۔ برق (ELECTRICITY) یہ مادہ نہیں بلکہ قوت یا توانائی (ENERGY) ہے اس میں نہ جسمیت ہے نہ اپنی ذات سے پہچانی جاتی ہے۔ اور نہ اپنی صفات سے بلکہ آثار سے پہچانی جاتی ہے صفات کے جو اثرات اشیا پر پڑتے ہیں۔ ان سے صفات کا علم ہوتا ہے اور صفات سے ذات کا علم ہو جاتا ہے۔ برق برقیوں سے بھی زیادہ تر لطیف ہوتی ہے۔"

ایمان بالغیب

غرض کہ سائنس کی رو سے لطافت جب اپنے وجود سے جتنی کٹتی اور بٹتی چلی جاتی ہے تو وہ کثافت پر پہنچ کر دم لیتی ہے اور اپنی جسمیت کی وجہ سے نظر آنے لگتی ہے کثافت جوں جوں اپنے منبع و ماخذ کی طرف لوٹتی ہے تو لطافت میں بدلتی جاتی ہے اور برق یا نور۔ قوت یا توانائی کی سرحد پر پہنچنے کے بعد اپنی جسمیت بالکل کھو بیٹھتی ہے اور اس کا نظر آنا ناممکن ہو جاتا ہے اس وقت اس کی ذات کو اس کے اثرات اور صفات کے ذریعہ پہچانا جاتا ہے۔ مثلاً بجلی کی ایک صفت مقناطیسیت ہے بجلی کسی تار سے گزر رہی ہے یا کسی دوسری چیز میں چھپی ہوتی ہے آپ کا ہاتھ نادانستہ طور پر اس تار یا چیز سے چھو جاتا ہے تو وہ آپ کے ہاتھ کو کھینچ کر شاٹ مارتی ہے اس وقت آپ کو اس کی اس صفت اور آثار کی بنا پر اسکی

ذات کا علم ہوتا ہے گویا:۔

۱۔ جس طرح اسلام کے بنیادی عقائد پانچ ہیں یعنی خدا پر۔ خدا کے فرشتوں پر۔ خدا کے رسولوں پر۔ خدا کی کتابوں پر اور قیامت پر ایمان لانا ضروری ہے اسی طرح سائنس کی رو سے بھی پانچ چیزوں یعنی جامد۔ سیال گیس۔ برقیے اور برق کے وجود کو اس کائنات کی بنیاد سمجھا جاتا ہے۔

۲۔ جس طرح سائنس کی رو سے خدا کے رسول اور خدا کی کتابیں نظر کی گرفت میں آسکتی ہیں اسی طرح سائنس کی رو سے صرف دو چیزوں یعنی جامد اور سیال کو ان کی جسمیت کی وجہ سے دیکھ سکتے ہیں۔

۳۔ جس طرح عقائد اسلام کی رو سے ہمیں خدا اور فرشتے اور روز حشر جسمیت نہ رکھنے کی وجہ سے نظر نہیں آتا۔ اسی طرح سائنس کی رو سے گیس۔ برقیے اور برق جسمیت نہ رکھنے کی وجہ نظر نہیں آتی

۴۔ جس طرح ہم خدا۔ فرشتوں۔ اور روز حشر کو آثار وصفات سے مانتے اور پہچانتے ہیں اسی طرح سائنس کی رو سے گیس۔ برقیوں اور برق کو اس کے آثار وصفات سے پہچانا جاتا ہے۔

۵۔ جس طرح اسلام میں بعض ان دیکھی حقیقتوں کو تسلیم کرنا۔ اور ان پر ایمان بالغیب لانا ضروری ہے اسی طرح سائنس کی رو سے بھی ان دیکھی چیزوں کے وجود کو تسلیم کرنا اور ان پر ایمان بالغیب لانا پڑتا ہے

خدا کی عدم جسمیت

سائنس نے دنیا کے سامنے یہ اصول پیش کر کے کہ مادہ کا منبع و ماخذ لطیف ترین قوت

یا توانائی ہے جو نہ جسم رکھتی ہے اور نہ نظر آسکتی ہے بلکہ صرف اپنی صفات و اثرات سے جانی پہچانی جاتی ہے۔ ثابت کر دیا ہے کہ اس لطیف ترین توانائی کا خالق بھی اپنی ناقابلِ تصور انتہائی لطافت کی وجہ سے نہ جسم رکھ سکتا ہے اور نہ نظر آسکتا ہے۔ اس سے نہ صرف منکرین و ملحدین کے اس عقیدہ کی تردید ہوتی ہے کہ اگر خدا ہوتا تو نظر آتا۔ بلکہ قرآن کریم کی بیان کردہ مندرجہ ذیل صفات الٰہیہ کا بھی اعتراف ہوتا ہے:۔

۱۔ اِنَّ اللّٰہَ لَطِیفٌ (لقمٰن ۱۶/۲۱)	بالتحقیق اللہ لطیف ہے
۲۔ اِنَّ اللّٰہَ قَوِیٌّ (انفال ۵۲/۱۰)	بالتحقیق اللہ بڑی قوت والا ہے۔
۳۔ اَللّٰہُ نُورُ السَّمٰوٰتِ وَالاَرضِ (نور ۳۵/۱۸)	اللہ ہی آسمانوں اور زمین کا نور ہے
۴۔ وَالظَّاھِرُ وَالبَاطِنُ (حدید ۳/۲۷)	وہ (صفاتاً) ظاہر ہے اور (ذاتاً) اند
وَکَانَ اللّٰہُ بِکُلِّ شَیئٍ مُّحِیطًا (نساء ۱۲۶/۱۸)	اللہ تعالیٰ تمام چیزوں کو احاطہ فرمائے ہوئے ہیں۔
۵۔ لَا تُدرِکُہُ الاَبصَارُ وَھُوَ یُدرِکُ الاَبصَارَ (انعام ۱۰۳/۷)	آنکھیں اس کو نہیں دیکھ سکتیں اور وہ آنکھوں کو دیکھتا ہے۔

تھیوری آف ایتھر

آج سے دو سو سال قبل ہالینڈ کے ایک سائنسدان نے ایتھر جسے عربی میں اثیر کہتے ہیں کی دریافت کر کے بہت سے قرآنی حقائق کی تائید کا مزید سامان پیدا کر دیا ہے علماءِ سائنس کا اس بات پر اتفاق ہے کہ اثیر نے روزِ اوّل سے اس کائنات کو ایک لطیف ترین اور ناقابلِ دید غلاف یا بادل کی طرح اپنی لپیٹ میں لے رکھا

ہے۔ یہ عرش سے فرش تک ہر جگہ موجود ہے اس میں نہ کوئی خلا ہے نہ روزن اور نہ ہی اس میں خلا یا روزن پیدا کیا جا سکتا ہے یہ نور سے زیادہ لطیف ہے دو چیزوں کے درمیان واسطہ کا کام دیتا ہے لہریہ وجود رکھتا ہے یہ کرہ ہوا کے اندر بھی موجود ہے۔ اور کرہ ہوا کے اوپر خلا میں بھی پھیلا ہوا ہے اثیری امواج ایک سیکنڈ میں ۰۰۰،۸۶،۱ میل سفر طے کرتی ہیں اس کی لہریں یا امواج بھی پانچ قسم کی ہیں۔ ۱۔ آواز کی لہریں ۲۔ عکس کی لہریں۔ ۳۔ روشنی کی لہریں۔ ۴۔ بجلی کی لہریں۔ ۵۔ خیال کی لہریں۔ یہ لہریں ہر وقت اثیری سمندر میں متلاطم رہتی ہیں اور چشم زدن میں ایک لہر تمام کرۂ ارض کا چکر ختم کر لیتی ہے۔ آواز کی لہر خواہ وہ کہیں سے پیدا ہو یعنی ایک سیکنڈ کے آٹھویں حصہ میں کرۂ اثیر کے چاروں طرف اپنا چکر ختم کر لیتی ہے۔ عکس کی لہریں بھی اسی رفتار سے چلتی ہیں۔ مگر بجلی کی لہریں ان سے بھی تیز رفتار ہوتی ہیں۔ وہ کرہ اثیر کا پورا ایک چکر ایک سیکنڈ کے ہزارویں حصہ میں ختم کر لیتی ہیں۔ اور خیال کی لہر تو چشم زدن میں پورے کرۂ اثیر کا چکر لگا لیتی ہیں۔

تھیوری آف ایتھر کے تحت سوئی کو مقناطیس تک۔ روشنی کو آنکھوں تک آواز کو کانوں تک۔ اشکال کو کیمرہ تک۔ مناظر کو خیال تک ایتھر کھینچ لاتا ہے اگر ایتھر نہ ہوتا تو سورج۔ چاند اور ستاروں کی روشنی ہم تک نہیں پہنچ سکتی۔ کیونکہ روشنی خود نہیں چلتی ایتھر اسے چلاتا ہے۔ یہ اثیری واسطہ کا کرشمہ ہے کہ ہم وائرلیس کے ذریعہ بلا تار و سلسلہ آن واحد میں ہزاروں میل تک اپنا پیغام پہنچا سکتے ہیں ریڈیو کے ذریعہ دور دراز ملکوں کی نشریات گھر بیٹھے اور راہ چلتے سن سکتے ہیں۔ ٹیلیویژن ریڈیو کے ذریعہ ہزاروں میل دور ہونے والے پروگرام بچشم خود دیکھ سکتے

ہیں اور ہوا باز کے بغیر ہوائی جہاز۔ خلائی جہاز اور مصنوعی سیارے اڑا سکتے ہیں

وجود باری تعالیٰ

غرض کہ سائنس کی رو سے کائنات میں ایتھر نامی ایک ایسا لطیف مادہ بھی موجود ہے جس نے کائنات کی ہر چیز کو محصور کر رکھا ہے۔ جو ہر جگہ موجود ہے اور ہر جسم میں داخل ہے۔ ہر حرکت ہر صدا۔ ہر آہٹ اور ہر جنبش اس کے وجود میں تموج پیدا کر دیتی ہے۔ جس سے چشم زدن میں سارا کرہ ایتھر آگاہ و خبردار ہو جاتا ہے کہ فلاں نے یہ کیا فلاں نے یہ کہا۔ اس طرح سائنس نے ان صفاتِ خداوندی کا عملی نمونہ دنیا کے سامنے پیش کر دیا۔ جو قرآن کریم آج سے پورے چودہ سو سال قبل بیان کر چکا ہے۔

۱۔ وَهُوَ اللّٰهُ فِی السَّمٰوٰتِ وَفِی الْاَرْضِ یَعْلَمُ سِرَّكُمْ وَجَهْرَكُمْ وَیَعْلَمُ مَا تَكْسِبُوْنَ (انعام ۱/۱)	وہی ایک اللہ آسمانوں میں ہے اور زمین میں بھی وہ تمہارے پوشیدہ یا مخفی (حال) کو بھی جانتا ہے اور ظاہری (حال) کو بھی اور جو کچھ تم کرتے رہتے ہو اسے بھی وہ جانتا ہے۔
۲۔ اِنَّ اللّٰهَ لَا یَخْفٰی عَلَیْهِ شَیْءٌ فِی الْاَرْضِ وَلَا فِی السَّمَآءِ (آل عمران ۱/۲)	ارض و سماء کی کوئی چیز اللہ تعالیٰ سے چھپی ہوئی نہیں ہے۔
۳۔ اِنَّ اللّٰهَ سَمِیْعٌ بَصِیْرٌ (مجادلہ ۱/۲۸)	وہ ہر بات سنتا اور دیکھتا ہے
۴۔ فَاِنِّیْ قَرِیْبٌ (بقرہ ۲۳/۲)	میں تمہارے بالکل قریب ہوں۔
۵۔ وَنَحْنُ اَقْرَبُ اِلَیْهِ مِنْ حَبْلِ الْوَرِیْدِ (ق ۲/۲۶)	ہم تو اس کی رگ جاں سے بھی زیادہ اس کے قریب ہیں۔

گویا اثیر کی طرح خدا بھی ہر جگہ موجود ہے ہر انسان کے تخیل سے بھی زیادہ قریب ہے وہ ہر بات خواہ وہ چھپی ہوئی ہے یا ظاہر جانتا ہے اس کے احاطہ علم سے اس کائنات اور اس کی موجودات کا کوئی راز اور دلوں کا کوئی بھید تک مخفی نہیں جس طرح آپ ریڈیو کے ذریعہ ہزاروں میل دور کی نشر بات بلا توقف ثانیہ گھر بیٹھے سن رہے ہوتے ہیں۔ اسی طرح خدا بھی ہماری باتیں سنتا رہتا ہے جس طرح ٹیلیویژن ریڈیو کے ذریعہ دور دراز ممالک کے نشری پروگرام آپ گھر بیٹھے بچشم خود دیکھ لیتے ہیں۔ اسی طرح خدا بھی ہر وقت ہماری حرکات و سکنات دیکھتا رہتا ہے۔ گویا سائنس کی ایجادات و انکشافات ذات و صفات خداوندی کے متعلق قرآن کے نظریات کی صداقت کا بزبان حال اعتراف کر رہی ہیں ماہر حیوانیات وحشریات ایڈورڈ لوتھر لیبل لکھتے ہیں کہ :-

"اگر کھلے دل و دماغ کے ساتھ سائنس کا مطالعہ کیا جائے تو انسان کے لیے خدا پر ایمان لانے کے سوا اور کوئی چارہ کار باقی نہیں رہتا۔"

یہی رائے ماہر حیوانیات البرٹ میکومبس ونچسٹر کی ہے کہ :-

"سائنس کا مطالعہ خداوند تعالیٰ کی عظمت اور قدرت کے متعلق گہری بصیرت پیدا کر دیتا ہے اور یہ بصیرت سائنس کی ہر انکشاف کے ساتھ مضبوط ہوتی جاتی ہے۔"

دنیا کے نامور ماہر طبیعیات لارڈ کیلون بھی اسی نتیجہ پر پہنچے ہیں کہ :-

"آپ جتنا زیادہ غور و فکر سے کام لیں گے اتنا ہی سائنس آپ کو خدا کے ماننے پر مجبور کرے گی۔"

علّت و معلول کا چکر

اس بات میں تو اب شک و شبہ کی کوئی گنجائش نہیں رہی کہ منکرین و ملحدین جس سائنس پر ایمان رکھتے ہیں۔ اس سائنس کے اصول و مسلمات خدا کی ذات و صفات کی تائید و تصدیق کرتے ہیں اب لے دے کے ان کا ایک طفلانہ مگر وسوسہ خیز سوال یہ باقی رہ جاتا ہے کہ جب یہ ساری کائنات علت و معلول کے چکر میں گرفتار ہے۔ ہر چیز دوسری کے واسطہ اور ذریعہ سے معرض وجود میں آتی ہے۔ تو پھر خدا کو کس نے پیدا کیا ہے؟ بظاہر یہ سوال بڑا وزن دار معلوم ہوتا ہے۔ اس سوال کا ہمارے پاس معقول جواب موجود ہے مگر سائنس یا سائنسدانوں کے پاس ایسے سوال کا کوئی جواب موجود نہیں۔

ماہرین سائنس کا عجز

تازہ ترین انکشافات و اکتشافات کی رد سے موجودہ سائنس کی سدرۃ المنتہیٰ انرجی یا توانائی ہے اس سے آگے ابھی تک سائنس کو معراج حاصل نہیں ہوئی سائنس کی رو سے یہ سارا کارخانہ عالم اسی انرجی یا توانائی سے چل رہا ہے لیکن جب ہم منکرین و ملحدین یا مفکرین و ماہرین سے یہی سوال کرتے ہیں کہ یہ انرجی اور توانائی اور اس میں یہ حرکت و حیات کہاں سے آئی؟ تو وہ بغلیں جھانکنے اور منہ تکنے لگ جاتے ہیں۔ اس سوال نے بڑے بڑے ماہر سائنسدانوں کو نہ صرف لاجواب کر دیا ہے بلکہ انہیں کھلے بندوں اپنی عاجزی و بے بسی، کم فہمی۔ لاعلمی کا اعلان کرنا پڑا ہے۔ ماہر حیاتی طبیعیات پال کلیرنس ایبر سولڈ لکھتے ہیں کہ:۔

"سائنس کا منتہا اس کے سوا کچھ نہیں کہ وہ یہ بتادے کہ یہ سب کچھ

"کیسے" ہوا لیکن اس سے آگے بڑھ کر اس حقیقت کی نقاب کشائی کہ یہ سب کچھ "کیوں" ہوا۔ نہ حضرتِ انسان کے بس میں ہے اور نہ سائنس ہی اس کی عقدہ کشائی پر قادر ہے۔ اور نہ اس کے پاس اس سوال کا کوئی جواب ہے۔ کہ آخر یہ مادہ، یہ توانائی کہاں سے وجود میں آگئی۔ اور اس کائنات میں یہ نظم وحسن ترتیب کس طرح قائم ہو گیا؟"

سرجے سالے ٹامسن جن کا شمار دنیا کے بڑے ماہرین حیات میں ہوتا ہے آغاز حیات سے متعلق اپنی کتاب میں لکھتے ہیں کہ:۔

"اس بارہ میں ہم کو اپنی لاعلمی کا اعتراف کرنا پڑتا ہے اور ہم یہ کہنے پر مجبور ہو جاتے ہیں کہ "ہم نہیں جانتے"۔

اشتراکی ماہر حیات اے اوپیرن اور فسکور (AOPARINYV-FES E NKOV) اپنی مشہور کتاب "دی یونیورس" میں آغاز حیات کے نظریات پر تبصرہ کرنے کے بعد اسی نتیجہ پر پہنچا ہے کہ:۔

"اگر یہ مان بھی لیا جائے کہ زندگی کا آغاز بجائے زمین کے سیارں وغیرہ پر ہوا تب بھی ہم یہ نہیں بتا سکتے کہ ان سیاروں پر زندگی کیسے وجود میں اور اس مخصوص ماحول میں اس نے کس طرح نشوونما پائی؟"

ان اعترافات کے علی الرغم ماہر ریاضی وطبیعیات ڈانلڈ ہنری پورٹر نے منکرین وملحدین کے سوال کا یہ جواب دیا ہے:۔

"برطانیہ کے ریاضی دان اور فلسفی برٹرینڈرسل نے خدا کے وجود کو تسلیم کرنے سے محض اس بنا پر انکار کر دیا کہ وہ اس سوال کا کوئی جواب

نہ پا سکا۔ کہ اگر خدا اس کائنات کا خالق ہے تو (نعوذ باللہ) خدا کا خالق کون ہے۔؟ اس میں شبہ نہیں کہ برٹرینڈرسل علت و معلول کی بحث میں بڑی گہرائیوں تک جا پہنچا لیکن جب سائنس کے تقریباً ہر کلیے کا یہ حال ہو کہ اس سے پیدا ہونے والے بے شمار سوالوں کا کوئی جواب ہمارے پاس نہ ہو تو آخر اس کی کیا تُک ہے کہ ہم وجود باری کے سلسلہ میں ایک سوال کا جواب نہ پا سکنے پر سرے سے اس حقیقت سے ہی انکار کر دیں: "خدا موجود نہیں ہے" جسے سائنس بزبان حال تسلیم کر رہی ہے۔

عقل و فکر کی کمی

حیات و کائنات کے راز و محرکات کی سراغ رسانی میں مفکرین عالم جس ناکامی سے دوچار ہو رہے ہیں اس کی وجہ ان کی عقل قلیل اور فکر محدود ہے جو بے پیدا کنار اور لامحدود حیات و کائنات کا احاطہ کرنے سے عاجز اور بے بس ہے جس کا مشہور سائنسدان نیوٹن نے ان الفاظ میں اعتراف کیا ہے:۔

"میری مثال اس بچے کی ہے جو ایک سمندر کے کنارے کھڑا چند جان دار سیپیوں اور گھونگھوں کے بے جان (SHELLS) خول جمع کر رہا ہے۔"

اس عقلی و فکری کمی کو پورا کرنے کے لیے قرآن نازل ہوا اور اس نے زمین کی گہرائیوں سمندروں کی پہنائیوں میں غوطے لگانے اور فضا و خلاء میں پرواز کرنے والے انسان کو کھول کر بتلا دیا کہ :۔

یَعْلَمُ مَا بَیْنَ اَیْدِیْہِمْ وَمَا — وہ اللہ ہی جانتا ہے جو کچھ مخلوقات

خَلْفَهُمْ وَلَا يُحِيطُوْنَ بِشَيْءٍ مِّنْ عِلْمِهٖٓ اِلَّا بِمَا شَآءَ (البقرہ ۲۵۵)

کے سامنے ہے اور جو کچھ ان کے پیچھے ہے اس سب کو اور وہ اس کی معلومات میں سے کسی چیز کا بھی احاطہ نہیں کر سکتے سوا اس کے کہ جتنا وہ خود چاہے۔

کسی چیز یا حقیقت کے متعلق سوال یا اعتراض کر دینا اس کے وجود کے ابطال کی دلیل نہیں ہوتی اس کے لیے ٹھوس اور قطعی دلائل و براہین کی ضرورت ہوتی ہے جس طرح ہر شخص اپنی ذات وصفات کے متعلق دوسروں کی نسبت بہتر جانتا ہے یا جسطرح ایک اجنبی اور ناواقف شخص اپنی ذات وصفات کے متعلق جو کچھ بتلاتا ہے تاوقتیکہ شواہد وقرائن اس کے بیان کی تردید وتکذیب نہ کریں اس کی بات کو درست تسلیم کرنا پڑتا ہے اسی طرح باری تعالیٰ نے بھی اپنے وجود کوائف کے متعلق قرآن مجید میں یہ بیان دیا ہے کہ نہ کوئی مجھ سے پہلے تھا اور نہ کوئی میرے بعد ہوگا نہ میں کسی کی اولاد ہوں نہ کوئی میری اولاد ہے میں نے سب کچھ پیدا کیا ہے مجھے کسی نے پیدا نہیں کیا

هُوَ الْاَوَّلُ وَالْاٰخِرُ (حدید ۳/۵۷)

وہی سب سے پہلے ہے اور وہی سب سے پیچھے ہے

لَمْ يَلِدْ وَلَمْ يُوْلَدْ (اخلاص ۳/۱۱۲)

اسکے اولاد نہیں نہ وہ کسی کی اولاد ہے۔

خالق کے اس بیان پر کسی قسم کے شک وشبہ کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا کیونکہ اس بیان خداوندی کو آجتک حقائق کی بنا پر نہ کوئی جھٹلا سکا ہے اور نہ کوئی اس کی تردید میں کوئی بیّن ثبوت پیش کر سکا ہے بلکہ سائنس کے جن آئمہ پر ملحدین ومنکرین تکیہ کیے ہوئے تھے وہی خدا کے مذکورہ بالا بیان کی تائید وتصدیق کر رہے ہیں اسی لیے نالق

کے اس بیان پر کسی قسم کے شک و شبہ کی گنجائش باقی نہیں رہتی کہ وہ وحدہ لاشریک ہے۔

باقی رہا یہ سوال کہ ان کا نقطۂ آغاز کیا ہے؟ علت و معلول کی سرحد کہاں ہے؟ سو واضح رہے کہ جس طرح اقلیدس کی اشکال کا ایک نقطۂ آغاز ہوتا ہے جس سے مختلف زاویوں کے خطوط کھینچے جا سکتے ہیں اور جو سب اسی نقطہ پر واپس آ کر ختم ہوتے ہیں یا جیسے سائنس کی رو سے توانائی سے ہی مادہ مختلف اشکال میں خارج ہو کر منصۂ شہود پر آتا ہے اسی طرح علت و معلول کی گاڑیوں کا بھی ایک نقطۂ آغاز اور ابتدائی اسٹیشن ہے جہاں سے توانائی کا ایندھن لے کر علت و معلول کی گاڑیاں مختلف سمتوں میں دوڑتی ہیں اور پھر وہیں واپس آ کر منتہی ہوتی ہیں یا جیسے علم ہندسہ کی رو سے اکائی یا ایک سے پہلے کچھ نہیں اعداد و شمار کا سارا چکر ایک سے شروع ہوتا ہے اور اس کے بعد دو تین چار وغیرہ کے ہندسے آتے ہیں۔ اس طرح کائنات کی منصوبہ بندی بھی ایک ہی منصوبہ ساز کی رہین منت ہے ایک ہی خالق کی تخلیق کا عظیم شاہکار ہے۔ ایک ہی مالک کی مرضی و منشا کا مظہر اتم ہے۔ وہی سب قوتوں اور توانائیوں کا سرچشمہ ہے۔ کوئی اس کی مشیت و ارادہ کے بغیر نہ اس کی دنیا میں قدم رکھ سکتا ہے اور نہ اس کی مملکت سے بھاگ سکتا ہے سب اسی کے قبضہ قدرت میں ہیں جس وقت چاہتا ہے موت کی نیند سلا دیتا ہے جس کو چاہتا ہے۔ عزت کے تخت پر بٹھا دیتا ہے جس کو چاہتا ہے ذلت کے گڑھے میں دھکیل دیتا ہے۔ وہ سب سے پوچھ سکتا ہے۔ اس سے کوئی پوچھنے والا نہیں اس لیے بقول سینٹ آگسٹائن:

"حقائق کو دیکھتے ہوئے بھی انہیں تسلیم نہ کرنا محض حماقت اور ہٹ دھرمی ہی نہیں "گناہ" بھی ہے۔"

سُبْحَانَ اللّٰہِ وَبِحَمْدِہٖ

(۶)

خدا نہیں ہے

تو

یہ کون کرسکتا ہے؟

(از ڈاکٹر سیّد زاھد علی واسطی)

فعال ایقان | اگر سچ پوچھیں تو مشرکین و منافقین جن میں ریاکاری۔ خباثت۔ حُبِ جاہ رعونت و کبر و نخوت کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا ہے۔ بڑی شوخ چشمی سے نصوص دین سے استہزا کرتے ہیں۔ جہاں ایقان کی رمق سے ضوفشانی نہ ہو وہاں ایمان کا گذر کہاں؟

جس مظہر کا ہم تجزیہ کرنا چاہتے ہیں۔ وہ فعال ایقان ہے۔ جس کے ذریعہ ہم ایمان تک جا پہنچتے ہیں۔ اعتقادات۔ نظریہ علم اور مابعد الطبیعات سب کے سب ایمان کے گرد چکر کاٹتے ہیں۔ نظریہ علم کی اتھاہ گہرائیوں میں ان رموز کی پنہائیاں موجود ہیں۔ جن میں اعتقادات و مابعد الطبیعات صیقل ہوجاتے ہیں۔ باری تعالیٰ کی وحدت الوجود ہستی پر صرف یقین ہی نہیں بلکہ اسکی تعلیمات کی روشنی میں اپنے مافی الضمیر کو پرکھنے ہی سے ان اسرار غوامض کی نقاب کشائی ہوسکتی ہے۔ جہاں ایقان اور نظریہ علم کی پگڈنڈیاں ملتی ہیں اور ایمان کا راستہ عیاں ہوتا ہے۔

رب جلیل کی وسعت تخلیق یا حکمت آفرینش پر نگاہ ڈالیں تو ہر جگہ تدبیر و تجویز۔ مطابقت و ترتیب اور بے پایاں کمال ہستی کا عقیدہ ہمارے قلوب کی

گہرائیوں میں جاگزیں ہو جاتا ہے کہ وہی ان سب کا خالق اور مجوّز حکمت کا سرچشمہ ہے۔ ذرا چشم بصیرت کو کھولیں تو محسوس ہوگا کہ یہ علم و حکمت۔ ربط باہم اور رشتہ دوام۔ طبع غوّاص۔ نگاہ ژرف اس موجد باری کے علاوہ کسی بھی عقیل اور حکیم ہستی کے بس کی بات نہیں۔ یوں اس جہان رنگ و بو میں ہر ذرہ اس کی صنعت بے مثل کا منہ بولتا ثبوت ہے۔ کس میں قدرت ہے کہ اس کی صنعتوں کا احاطہ کر سکے۔ کوئی بھی اسکے سر دامن کو نہیں چھو سکتا۔

ظہور جلوہ باری کے ایوان رفیع الشان میں انسان کو شرف بخشا گیا۔ اس کو اشرف المخلوقات گردانا گیا۔ اس کے جسم میں حاکم مطلق کبیر المتعال نے خون کو دوڑایا بقائے حیات کی منصوبہ بندی کے لئے خون میں ممد حیات سامان مہیا کئے۔ ان سامانوں میں ہر شئے اپنی تعین شدہ حدود سے تجاوز نہیں کرتی۔ پھر خون کو جسم کے گوشہ گوشہ میں رواں دواں رکھنے کے لئے ایک دل فراہم کیا۔ آیئے! اس موجب تکوین و موجد الباری کی انہی تخلیقات کا بالتفصیل مطالعہ کریں۔

دل کے کرشمے

یہ حقیقت تو ہر پڑھے لکھے کو معلوم ہے کہ دل ایک عضو ہے جو چھاتی کے مرکزی حصّہ میں تھوڑا بائیں جانب واقع ہوتا ہے۔ جو حیران کن طریقہ سے سارے جسم میں خون کو لگاتار گردش میں رکھتا ہے۔ ایک طرف تو صاف خون کو یہ دوران خون میں دھکیلتا ہے۔ دوسری جانب ناصاف خون کو آکسیجن کے ذریعہ دوبارہ قابل استعمال بنانے کے لئے واپس اپنے اندر لاتا ہے۔ مگر کیا آپ کو یہ بھی معلوم ہے کہ خون کی اس گردش کو برقرار رکھنے کے لئے دل کو کتنی طاقت صرف کرنی پڑتی ہے؟ اس کا اندازہ کام کی اس بے تحاشا مقدار اور مپ

کی نوعیت سے لگایا جا سکتا ہے جو عمر بھر دل کو لگا تار کرنا پڑتا ہے۔

آئیے ہم آپ کو بتائیں کہ رب السموات والارض نے اس ایک مٹھی کے برابر گوشت کے لوتھڑے کو کتنی عظیم قوت عطا فرمائی ہے۔ جس کی کارکردگی دیکھکر دنیا کے بڑے بڑے سائنسدان ورطہ حیرت میں غرق رہتے ہیں۔

دل کی مصروفیات

صانع عظیم کا تیار کردہ دل ایک منٹ میں ۷۲ مرتبہ دھڑکتا ہے۔ اس طرح ایک گھنٹہ میں ۴۳۲۰ مرتبہ اور ایک دن میں ۱۰۳۶۸۰ مرتبہ اور ایک سال میں ۳،۷۸،۴۳،۲۰۰ مرتبہ دھڑکتا ہے۔ اگر ایک انسان کی زندگی کا تخمینہ آپ پچاس سال ہی لگالیں تو گن کر دیکھ لیں کہ ایک ارب نواسی کروڑ اکیس لاکھ ساٹھ ہزار مرتبہ دل دھڑکتا ہے یا نہیں؟

چلیئے آگے چلیئے! دل ایک دھڑکن میں تقریباً اڑھائی اونس خون بدن میں دھکیلتا ہے۔ یوں خون دھکیلنے کی استعداد ۱۱،۷۵ اونس فی منٹ یا ۶۵۴۶۵۰ پونڈ فی گھنٹہ ہے یا سات میٹرک ٹن روزانہ ہوتی ہے۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ پچاس برس کی تخمیناً زندگی میں ایک لاکھ ستائیس ہزار سات سو پچاس ٹن خون کو بفضل ربی ایک دل اِدھر سے اُدھر دھکیلتا ہے۔ اگر میکانیات کی رو سے اسی طاقت کا اندازہ کرنا ہو تو آپ حیران رہ جائیں گے کہ دل کی روزمرہ کی استعدادی قوت (سات ٹن) ایک ٹن وزن کو ۱۲۲ فٹ زمین سے اونچا اٹھانے کے مساوی ہے۔

یہ سب قوتیں کہاں سے مہیا کی گئیں۔ ذرا سوچیے! بغور سوچیے! بے شک انسان اپنی قوت فاعلہ سے چاند تک پہنچ گیا۔ ہزارہا میل کے فاصلہ سمیٹ کر چند ساعتوں سے بھی کم وقت میں آواز اور تصویر کو ٹیلی وژن میں منعکس کر لینے کی استعداد

کو پالیا۔ بچوں کو بہلانے کے لیے سکس ملین ڈالرمین اور بائی اونک ودمن کے کارنامہ دکھاکر سرخروئی حاصل کرنے میں کامیابی حاصل کرلی۔ مگر دل اور خون کے اسرار سے ہنوز نابلد ہے۔ مصنوعی دل بے شک بناکر خدا کی خدائی کو چیلنج کرنے کے دعویدار یہ نہیں سوچتے کہ دل تو صرف بطور پمپ کے ہی کام نہیں کرتا۔ بلکہ یہ تو سیرت انسانی کی بھی آماجگاہ ہے۔ مصنوعی دل میں ولولے۔ جذبے۔ وسوسے کہاں سے لاکر بھرے جاسکتے ہیں۔ ذرا مشرکین و ملحدین اپنے گریبانوں میں جھانک کر سوچیں کہ کیا وہ مصنوعی دل میں ایسی صناعی کا مظاہرہ کرسکتے ہیں۔ وہ ایسا کیا کریں گے۔ انہیں خود کو بھی اپنے دل کے وسوسوں تک سے واقفیت نہیں۔ جبکہ رب العرش العظیم فرماتا ہے۔

وَلَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ وَنَعْلَمُ مَا تُوَسْوِسُ بِهٖ نَفْسُهٗ (ق۔ ۱۶)

ہم نے انسان کو پیدا کیا اور اسکے دل میں ابھرنے والے وسوسوں تک سے واقف ہیں۔

خون کے اجزائے ترکیبی

اللہ سبحانہ کی ذات قیومیت کے بدیہی صفات تو احاطہ تحریر سے باہر ہیں۔ یہ نباتات۔ جمادات۔ حیوانات۔ ارض وسما۔ اطراف وجوانب کے نظرافروز۔ حیات بخش۔ روح پرور۔ دلکش۔ دلفریب۔ دلنشین مناظر سب اسی کی بدیہی صفات کی نمود ہیں۔ جسم انسانی میں نظام استخوان۔ اس پر گوشت۔ گوشت پر پوست۔ ان سب کو حیات بخشنے کے لیے وریدوں اور شریانوں کا عطیہ بے بہا۔ ان میں خون کا سیل رواں۔ خون میں ان گنت مختلف النوع اقسام کے ذرات۔ ان ذرات پر زندگانی کا مدار۔ خون میں کیمیاوی تغیر تبدل جس پر صحت وعلالت کا انحصار۔ آخر یہ سب کیا ہیں؟

ءَاَنْتُمْ تَخْلُقُوْنَهٗۤ اَمْ نَحْنُ الْخٰلِقُوْنَ ۝ (الواقعہ)

ترجمہ: کیا تم اسکو بناتے ہو یا ہم یہ بناتے ہیں۔

آئیے اب ہم آپ کو خون کے اجزائے ترکیبی کے بارے میں بتائیں۔ خون انسانی جسم کے مجموعی وزن کا تقریباً بارہواں حصہ ہوتا ہے۔ گویا اگر کسی آدمی کا وزن ساٹھ کلوگرام ہو تو اس میں پانچ لٹر خون ہوتا ہے۔ فربہ جسموں میں اور مستورات میں اس تناسب میں اختلاف ہونے کا احتمال ہے۔ عمر کے ساتھ ساتھ خون کے حجم میں کمی بیشی ہوتی رہتی ہے۔ خون بادی النظر میں ایک سرخ رنگ کا سیال ہوتا ہے۔ مگر اس کو اگر خوردبین کی مدد سے دیکھا جائے تو اللہ اکبر! ایک سیلاب ہے۔ جسمیں متعدد قسم کے کروڑوں ذرات تیرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ جن میں سرخ و سفید ذرات کے علاوہ ؟ پلیٹ لٹس (Platelets) عام طور پر زیر بحث رہتے ہیں۔ پلیٹ لٹ گول پلیٹ کی شکل کی ہوتی ہے اور اسکا قطر $\frac{1}{9600}$ انچ ہوتا ہے اور ایک قطرہ خون میں تقریباً ایک کروڑ ساٹھ لاکھ ہوتی ہیں۔ پلیٹ لٹ بھی سرخ و سفید ذرات کے ساتھ خون میں بہتی رہتی ہیں۔ سفید ذرات جنہیں سفید جسیمے بھی کہتے ہیں۔ بے رنگ اور نوات بردار ہوتے ہیں۔ تعداد میں سرخ ذرات سے کم اور جسامت میں ان سے قدرے بڑے ہوتے ہیں۔ یہ ذرات کارکردگی اور شکل کے لحاظ سے کئی کنبوں میں تقسیم ہوتے ہیں۔ ہر کنبہ کے سفید جسیمے کی شکل اور کارکردگی ایک جیسی ہوتی ہے۔ سرخ جسیمے آر۔بی۔سی بہت ملائم اور لچک دار ہوتے ہیں۔ سرخ جسیمے بازو اور ٹانگوں کی لمبی ہڈیوں کے گودے میں پیدا ہوتے ہیں۔ انہی کی وجہ سے خون کی رنگت سرخ ہوتی ہے۔ اور انہی کی موجودگی پر زندگی کا دارومدار ہوتا ہے۔

کیا آپ کو معلوم ہے ان سرخ ذرات کی تعداد کتنی ہوتی ہے۔ بچپن میں ان کی تعداد چھ سے سات ملین فی مکعب ملی میٹر ہوتی ہے۔ اور بلوغت کے ساتھ ساتھ کم ہوتی جاتی ہے۔ حتیٰ کہ ایک جوان آدمی میں اوسطاً پانچ ملین فی مکعب ملی میٹر ہوتی ہے۔ اسکا مطلب یہ ہوا کہ ایک صحت مند شخص کے ایک سی سی خون میں تقریباً پچاس کروڑ اور اس کے تمام جسم کے خون میں دو سو پچاس کروڑ آر۔ بی۔ سی ہوں گے۔ یہ تو جناب! ایک شخص میں ذرات کی تعداد ہوئی۔ اگر تمام دنیا کے انسانوں کے خون میں سرخ ذرات کو گنا جائے تو حضرت انسان کو کوئی نئی گنتی ایجاد کرنی پڑے گی۔ تمام دنیا کے سائنسدان مل کر بھی اس قدر آر۔ بی۔ سی بنانے کا تو کیا فیصلہ کریں گے۔ ان کے لئے تو ایک آر۔ بی۔ سی بھی بنانا ناممکن ہے۔ آپ ابھی تو تعداد ہی سن کر حیرت زدہ ہوگئے۔ اگر ان کی کارکردگی پر بھی غور فرمائیں تو پکار اٹھیں گے۔

وَتُخْرِجُ الْحَیَّ مِنَ الْمَیِّتِ وَتُخْرِجُ الْمَیِّتَ مِنَ الْحَیِّ (العمران ۲۷)

تو ہی بے جان سے جاندار پیدا کرتا ہے۔ تو ہی جاندار سے بے جان نکالتا ہے۔

آپ کو واضح ہونا چاہیے کہ خون میں ذرات متذکرہ کے علاوہ ایک مائع بھی ہوتا ہے۔ جس کو پلازما کہتے ہیں۔ جس میں مندرجہ ذیل حل شدہ قلمی و کولائیڈی مرکبات ہوتے ہیں۔

بائی کاربونیٹ۔	حجم کا ۵ فیصد۔
کیلشیم۔	۵ ملی گرام فیصد سی سی۔
کلورائیڈ۔	۵۰۰ ملی گرام۔
کولیسٹرول۔	۱۵۰ ملی گرام

کری یاٹنن	۲ ملی گرام ۔
فاسفورس ۔	۴ ملی گرام ۔
فاسفیٹ ۔	۳۰ ملی گرام ۔
پوٹاشیم ۔	۲۰۰ ملی گرام ۔
البومن ۔ گلوبن ۔	۵ ملی گرام ۔
سوڈیم ۔	۲۰۰ ملی گرام ۔
شوگر ۔	۱۰۰ ملی گرام ۔
یوریا ۔	۳۰ ملی گرام ۔
یورک ایسڈ ۔	۲ ملی گرام ۔

ان تمام نمکیات وغیرہ کی تعداد ایک خاص مقدار و مناسبت سے حق تعالیٰ نے تجویز فرمائی ۔ اپنی معیاری مناسبت سے تجاوز یا انحطاط ہو جانے پر جو ردِ عمل ہوتا ہے ۔ وہ کسی نہ کسی بیماری کی شکل میں رونما ہوتا ہے ۔ آج تک خون جیسا محلول جو کارکردگی کے لحاظ سے خون کا نعم البدل ثابت ہو سکے نہ کسی نے بنایا اور نہ کوئی بنا سکتا ہے ۔ اب بھی مشرکین و منکرین اگر چشم بینا کو وا نہ کریں تو کیا قیامت کو کرینگے؟

ھل من خالق غیر اللّٰہ (فاطر ۲) کیا خدا کے سوا اور کوئی خالق ہے ۔

لا الٰہ الا ھو فانیٰ تؤفکون ۰ اسکے سوا کوئی نہیں تم کہاں بہکے پھرتے ہو ۔

خون کا عمل و ردِ عمل

کسی بھی مائع کی تیزابیت یا قلوئیت کے عمل و ردِ عمل کا انحصار اس مائع میں ہائیڈروجن اور ہائیڈرواکسائڈ کے آئن کے تعامل اور تقابلی ترتیب پر ہوتا ہے ۔ اگر ہائیڈروجن آئنز کی تعداد

کی برتری ہوتی ہے تو یہ محلول تیزابی خاصیت کا حامل ہوگا۔ اگر ہائیڈرو آکسائیڈ آئنز تقابلی اہمیت رکھتے ہیں تو قلوئیت کا رجحان ہوگا۔ خالص پانی اس لحاظ سے ایک غیر جانبدار محلول ہے۔ چونکہ اس میں ہائیڈروجن اور ہائیڈرو آکسائیڈ آئنز برابر تعداد میں ہوتے ہیں۔ اور اس ہی وجہ سے پانی اگر کسی محلول میں شامل کر دیا جائے تو اس کی حیثیت عرفی شریک کی سی ہوتی ہے۔ اور اس کا عمل تعدیلی ہوتا ہے۔

ایک سائنسدان سورین شن (SORENSON) نے اس رد عمل کا بغور مطالعہ کے بعد ایک طریق تسمیہ ایجاد کیا۔ جس کو پی۔ ایچ کہتے ہیں۔ ایک محلول جسکا پی ایچ ۷ ہے۔ وہ غیر جانبدار کہلاتا ہے اور اگر پی۔ ایچ ۷ سے بڑھ جاتا ہے تو یہ محلول القلی کہلاتا ہے۔ اسی طرح اگر ۷ سے کم ہو جاتا ہے تو تیزابی کہلاتا ہے۔ خون کا طبعی پی۔ ایچ ۷،۳۵ ۔ ۷،۴۵ ہوتا ہے یعنی اوسط ۷،۴ نکلتا ہے۔ انسان کی بقائے حیات کا دارو مدار خون کے ایک خاص پی۔ ایچ پر ہے جو کہ تیزابی طرف ۷ ہے اور القلی کی جانب ۷،۸ ہوتا ہے۔

خون کی طبعی حدود میں خلل انداز ہونے کے لیے بہت ساری قوتیں اور عوامل کارفرما ہوتے ہیں۔ مگر تعویضی اور مثلاً فی میکانکی ذرائع کا منصوبہ بدل کاری و انضباط اس قدر موثر ہوتا ہے۔ کہ صحت انسانی پر خون میں وقوع پذیر عوامل کا ردِعمل تہدیدی کیفیت شاذ ہی پیدا کرتا ہے۔ خوراک کی استحالاتی ردعمل کے نتیجہ کے طور پر جسم میں ہمہ وقت عمل تکسید ہوتا رہتا ہے۔ عملِ تکسید کے عمل سے کاربن ڈائی آکسائیڈ عضلات اور بافتوں سے دوران خون میں جذب ہوتی رہتی ہیں۔ اس تحویل سے تیزابی مادوں کا اخراج ظہور میں آتا ہے۔ مثلاً جب ہضم شدہ

لحمیات پر عمل تکسید ہوتا ہے تو سلفر سے سلفیورک ایسڈ بنتا ہے۔ عضلات کی قدر فعلیت سے لکٹک ایسڈ بنتا ہے۔ بعض حالات میں بیٹا ہائی ڈرو آکسی بیٹرک ایسڈ اور ایسی ٹک ایسڈ بھی بنتا ہے۔ اس کے علاوہ دیگر نامعلوم ایسڈ بھی بنتے ہیں۔ اور یہ تمام ایسڈ دوران خون میں شامل ہوتے رہتے ہیں۔

اساسی عناصر مثلاً پوٹاشیم۔ سوڈیم۔ کیلشیم۔ میگنیشیم کافی مقدار میں ہم روزمرہ خوراک میں کھاتے رہتے ہیں۔ جن کی نکاسی قدرتی ذرائع سے قلویت کی مقدار سے زیادہ نہ ہونے کی وجہ سے ہوتی رہتی ہے۔ اسی طرح خون سے تیزابی مادوں کا اخراج گردوں کے ذریعہ ہوتا رہتا ہے اور تیزابی عناصر عمل تعدیل کے ذریعہ فنا ہوتے رہتے ہیں۔

خون میں کیلشیم کے عناصر پلازما میں موجود ہوتے ہیں۔ جن کی طبعی مقدار ۹ سے ۵ء۱۱ ملی گرام فی صدسی سی ہوتی ہے۔ کیلشیم پلازما میں دو صورتوں میں ملتا ہے۔ نفوذ پذیر اور غیر نفوذ پذیر حالت میں۔ غیر نفوذ پذیر حالت میں کیلشیم عروق شریہ اور عصبی بافتوں اور ہڈیوں میں پایا جاتا ہے۔ نفوذ پذیر حالت میں تمام کیلشیم آئنائزڈ شکل میں ملتا ہے۔ جو کہ خون میں پروتھرام بن کے ارتکاز پر منحصر ہوتی ہے۔ خون میں مطلوبہ مقدار سے زیادہ کیلشیم بول و براز کے ذریعہ روزانہ خارج ہوتی رہتی ہے۔ طبعی مقدار میں کمی و بیشی جاذبیت کے عمل میں مداخلت جیسا کہ تھائی رائڈ کی بیماریوں میں ظاہر ہوتی ہے۔ مختلف علامتوں کا پیش خیمہ بن جاتا ہے۔

فاسفورس خون کے سرخ جسیموں میں نامیاتی شکل میں پایا جاتا ہے اور اس کی طبعی مقدار ۱۰۰ - ۸۵ ملی گرام فی صدسی سی خون ہوتی ہے۔ پلازما میں غیر نامیاتی

شکل میں فاسفورس پایا جاتا ہے ۔ اگر فاسفورس کی مقدار کم ہو جائے تو رکٹس ۔ غدودوں کی بیماری اور آنتوں کی غشائیاتی بیماریاں آگھیرتی ہیں ۔ فاسفورس کی روزانہ مطلوبہ مقدار ۱۰۴ گرام ہے جو کہ عام خوراک میں بخوبی مہیا ہو جاتی ہے ۔

ان تمام طبعی ۔ کیمیاوی ۔ عوامل کے مطالعہ کے بعد واضح ہو جاتا ہے کہ حکمت الہیٰ کا کس قدر عظیم مربوط نظام کارفرما ہے ۔ پس ہم دیکھتے ہیں کہ کائنات کی ہر چیز حق تعالیٰ کی مخلوق اور مربوب ہے اور سب اپنے وجود کے بقا رکھے لیے اللہ کے محتاج ہیں ۔ جس طرح ہر چیز اپنی خلقت میں کسی خاص مقصد اور مصلحت کے لیے بنائی گئی ہے ۔ اسی طرح ہمارے وجود میں بقائے حیات کی آبیاری کے لیے خون اور خون میں محیرالعقل ہمہ اقسام کے نمکیات ۔ معدنی اجزا فراہم فرمائے گئے جن میں اضافی اور انحطاطی عوامل اگر بروئے کار آجائیں تو ان میں عدم توازن پیدا ہو جاتا ہے ۔ اور مخصوص علامتوں کا اظہار ہوتا ہے ۔ تاکہ انسان چوکنا ہو جائے اور اپنی مطلوبہ کمیوں کو پورا کرے ۔ انسان اپنے توسیع علم اور فروغ عقل ۔ حیرت انگیز استعداد وں وصلاحیتوں کے باوجود ہنوز انگشت بدنداں ہے اور اس رب العرش العظیم کی سیادت و بالادستی کو اپنے ڈھیٹ پن سے مانے یا نہ مانے مگر اعتراف کیے بغیر نہیں رہ سکتا ۔

خون کی مخلوق

ہمارے اندرون جسم لاتعداد کیڑے وجراثیم ہوتے ہیں ۔ اس طرح خون کے اندر اور سرخ ذرات میں بھی بہت سارے کیڑے وغیرہ پائے جاتے ہیں ۔ یہ بھی ربوبیت کی عجیب کارفرمائی ہے ۔ کہ عام آنکھ سے نظر نہ آنے والے کیڑوں کو جب خوردبین کی آنکھ سے دیکھتے ہیں تو خالق اکبر کی ہنرمندانہ فن کاری اور حسین تخلیق میں نظم و ترتیب دیکھ کر میری نطق فی الفور پکار

اٹھتی ہے :۔

مَا تَرٰی فِیْ خَلْقِ الرَّحْمٰنِ مِنْ تَفٰوُتٍ ط

کیا تو رحمان کی آفرینش میں کچھ نقص دیکھتا ہے ؟

پلازموڈیم جنس ۔ ایک قسم کے طفیلی جراثیم ہوتے ہیں ۔ جن سے ملیریا بخار پھیلتا ہے ۔ ان کی آماجگاہ خون کے سرخ ذرات ہیں ۔ آپ کو معلوم ہوچکا ہے ۔ کہ خون کے سرخ ذرات تو خود اس قدر قلیل الجثہ ہوتے ہیں کہ خوردبین کے بغیر نظر نہیں آتے پھر آپ اندازہ لگائیں ان کے اندر بود و باش رکھنے والے جراثیم کس قدر دقیق خوردبینی سائز کے ہوتے ہوں گے جو کہ ذرات میں بخوبی سما جاتے ہیں ۔

جب مچھر کے کاٹنے سے یہ جراثیم دوران خون میں شامل ہوتے ہیں تو جلدی سے سرخ ذرات میں داخل ہوجاتے ہیں اور دس دن کے قریب اندر ہی قیام کرتے ہیں ۔ اور وہیں غیر تناسلی تولید کے ذریعہ اپنی تعداد دس بارہ گنا زیادہ کرلیتے ہیں ۔ حتیٰ کہ آر ۔ بی ۔ سی میں رہائش کی گنجائش ختم ہوجاتی ہے ۔ اور آر بی سی شدت بے بسی سے پھٹ جاتے ہیں ۔ اور یہ لاکھوں جراثیم دورانِ خون میں دوڑنے لگتے ہیں اور بے پناہ سرخ ذرات کو تباہ کر ڈالتے ہیں ۔ جب آر ۔ بی ۔ سی پھٹتے ہیں تو آدمی کو شدت کا جاڑا چڑھتا ہے اور تیز تر بخار ہوجاتا ہے ۔ جسکو ملیریا بخار کہتے ہیں ۔

سوزاک ایک معروف چھوت کی بیماری ہے ۔ جس کا موجب ایک باریک آنکھ سے نظر نہ آنے والا کیڑا ہوتا ہے ۔ جسے اسپائی روچیٹ پے لیڈا کہتے ہیں ۔ یہ دوران خون میں پرورش پاکر سوزاک کے زخم تک آتا ہے ۔ اسی جنس کے کئی اور قبیلے مثلاً ۔ ری کرن ٹس ۔ پرٹی ننس ۔ مورسس میورس اور لادی رانی

بھی پائے جاتے ہیں۔ یہ سب انتہائی خورد بینی ہوتے ہیں اور متعدد بیماریوں مثلاً ریٹ بائٹ فیور۔ ری لیپنگ فیور وغیرہ کا سبب بنتے ہیں جو کہ ہمارے برصغیر میں عام نہیں ہیں۔

فائی لیریا بنکرافٹی۔ لوا لوا۔ منسولینیا اوزارڈی۔ انکوسرکا وولوس اور اے۔ پرسٹانس کے کیڑے بعض مخصوص مکھیوں اور مچھروں کے کاٹنے سے انسانی خون میں منتقل ہوتے ہیں۔ جو کہ عموماً مغربی افریقہ۔ جنوبی امریکہ۔ جزائر غرب الہند میں بکثرت پائے جاتے ہیں اور ان سے فیل پا اور ایک خاص قسم کی نیند (انسان ہر وقت سوتا رہتا ہے) کے امراض پھیلتے ہیں۔ ٹرک نیلا اسپائی ریلس کے نومولود بچے بھی انسانی خون میں چہل قدمی کرتے پائے جاتے ہیں۔ یہ ایک خاص قسم کی گلٹیوں کا موجب بنتے ہیں۔ جس کو ٹرک نیاس کہتے ہیں۔ یہ نومولود بچے دوران خون سے مناسب عضلات میں پہنچ کر باقی ماندہ زندگی بیضوی شکل کی گلٹیوں میں گذار دیتے ہیں۔

ہک ورم ایک مشہور بیماری ہے۔ جو کہ ننگے پاؤں پھرنے والوں کو عموماً ہو جاتی ہے۔ اس کے انڈے گندے پانی میں ہوتے ہیں۔ ان میں سے بچے بھی وہیں نکلتے ہیں اور آدمی کے پیر کی نرم جلد سے گذر کر بڑی بے تکلفی سے دوران خون میں آجاتے ہیں۔ تا وقتیکہ دل اور پھیپھڑے کے راستہ ایک طویل سفر کرنے کے بعد اپنی مستقل رہائش گا معدہ میں نہ پہنچ جائیں۔

تھوڑی دیر کے لئے اپنی تمام صلاحیتوں اور اکتسابی تحصیلات کو مجتمع کر کے غور فرمائیں کہ کیا کوئی انفرادی یا اجتماعی طاقت خداوند کریم کی تخلیق

کی ہمسری کر سکتی ہے؟ کیا بنی نوع انسان کی قوت تخلیق کی کوئی بشر ایسی مثال دے سکتا ہے کہ کسی ورم کے بچے گندے پانی میں پیدا ہوں اور انسانی خون میں پرورش پائیں۔ پھر معدہ میں پہنچ جائیں اور انڈے دیں یا ملیریا کے جراثیم کی طرح خون میں سرخ ذرات کے اندر غیر تناسلی تقسیم سے اپنی نسل کو بڑھائیں۔ یا دسیوں اقسام کے کیڑوں کی طرح جو خون میں طفیلی زندگی گذارتے ہیں۔ ان کی مانند ایک ہی کیڑا پیدا کرنے کی صلاحیت پیدا کر لے! ہرگز نہیں! یہ سب قوتیں صرف خدائے عزوجل کے ہی بس میں ہیں۔ صرف اس ہی کے لیے ہم کہہ سکتے ہیں (یخلق ما یشآ) وہ جو چاہتا ہے پیدا کرتا ہے اور جناب وہ صرف پیدا ہی نہیں کرتا بلکہ (و ترزق من تشآ) اپنی مرضی سے رزق بہم پہنچاتا ہے۔ حتیٰ کہ خون کے اندر بھی جراثیم اور کیڑوں کو رزق دیتا ہے۔ جو اس کے ہی اختیار تجویز و منصوبہ کی روشن مثال ہے۔

خون کے رشتے بین الاقوامی طور پر لیگ آف نیشنز کی مجلس صحت نے مدت گذری اس طریق تسمیہ کو تسلیم کر لیا کہ بنی نوع انسان چاہے قطب شمالی کا باشندہ ہو یا قطب جنوبی کا۔ افریقہ کے تپتے ہوئے صحرا کا سیاہ فام حبشی ہو یا کوہ قاف کی سیمیں بدن نازنین۔ ان سب کا خون اپنے مصل اور سرخ جسیموں کے طرز عمل سے چار حصوں میں تقسیم ہوتا ہے اور یہ قطعی واضح رہے کہ یہ تقسیم کسی ماحولی تخصیص عمر یا جنس سے اثر پذیر نہیں ہوتی۔ یہی وجوہ زبردست طبی۔ قانونی اور وراثتی دلچسپی کے حامل ہوتے ہیں اور انہی کے تناسب سے یہ گروپ اے۔ بی۔ اے بی۔ اور او کہلاتے ہیں۔ گروپ اے اور بی بڑے محفوظ طریقہ سے اپنے ہم عصر اور گروپ او سے خون کے رشتہ استوار کر لیتے ہیں۔ جبکہ اے بی کسی کو خون دینے میں بخیل ہوتا

ہے اور اسکے مقابلہ میں او اس معاملہ میں انتہائی فیاض ہوتا ہے۔

اس عظیم فاطر اور موجب تکوین کے یہ سب اسرار سمجھنے کے لئے اختصار تحریر سے کام نہیں چلتا۔ اس موضوع پر تو دفتر لکھنے اور پڑھنے کے بعد بھی قلیل ہی سمجھ میں آتا ہے۔ مگر اس قدر ضرور وضاحت کرتا ہوں کہ خون کے اگر گروپ نہ ہوتے تو طبی قانونی اور وراثتی مسائل الجھ کر رہ جاتے۔ ہم قارئین کی ضیافت طبع کی خاطر ایک نقشہ پیش کر رہے ہیں جو کہ وراثتی خون کی پیچیدہ رموز کی آگاہی میں معاون ہے۔

والدین کا گروپ	بچہ کا ممکن گروپ	بچہ کا غیر ممکن گروپ
او × او	او	اے ۔ بی ۔ اے بی
او × اے	او ۔ اے	اے بی ۔ بی
او × بی	او ۔ بی	اے ۔ اے بی
اے × اے	او × اے	بی ۔ اے بی ۔
اے × بی	او ۔ اے ۔ بی ۔ اے بی	کوئی بھی نہیں۔
بی × بی	او ۔ بی	اے ۔ اے بی ۔
او × اے بی	اے ۔ بی	او ۔ اے بی ۔
اے × اے بی	اے ۔ بی ۔ اے بی	او ۔
بی × اے بی	اے ۔ بی ۔ اے بی	او ۔
اے بی × اے بی	اے ۔ بی ۔ اے بی	او ۔

اگر کسی لڑکے یا لڑکی کے والدین کا معلوم کرنا ہو کہ وہ کس کی اولاد ہے تو اس امر کا پتہ ان ہی خون کے گروپس سے لگایا جاتا ہے کہ والدین کے خون کا گروپ اس کی اولاد کے خون کے گروپ سے ملتا ہوگا۔ اگر ماں باپ یا بیٹے کے خون کا گروپ نہیں

ملتا تو پھر وہ کسی دوسرے کی اولاد ہوگا۔

جریانِ خون جسم سے خون خارج ہونے کے بعد رقیق حالت کی بجائے ٹھوس حالت میں تبدیل ہوجاتا ہے۔ اس عمل کو ترویب الدم یا خون کا جمنا کہتے ہیں۔ اگر ہم ان ترویبی طاقتوں کو دیکھیں تو عقل دنگ رہ جاتی ہے۔ جن سے خون کا جمنا ظہور میں آتا ہے۔ زندہ خون کے پلازما میں فائبری نوجن حل شدہ صورت میں موجود رہتا ہے۔ لیکن خون کی شریانوں کے زخمی ہوتے ہی بلڈ پلیٹ لٹس۔ کیلشیم۔ تھرمبو پلاسٹن اور پروتھرامبین کے اشتمال سے ایک دم ناحل پذیر شئے تھرومبن بن جاتی ہے۔ جو فائبری نوجن سے مل کر فائبرن بنا ڈالتی ہے۔ یہ عام نظر سے دکھائی نہ دینے والا ایک باریک دھاگوں کا جال سا ہوتا ہے۔ جس میں خون کے سرخ و سفید جسیمے اٹک جاتے ہیں اور جریان خون کو روکتے ہیں۔

اور ترویب الدم کا عمل پیش آجاتا ہے۔ یہ عمل اس قدر سادہ نہیں ہوتا۔ بلکہ اس میں بہت ساری مزید رطوبتیں مثلاً پٹوٹیری ایکسٹریٹ۔ القلی فاسفیٹ اور ہائی پرٹن سنو جن وغیرہ ہم اثر انداز ہوتی ہیں اور وٹامن "کے" کی عدم موجودگی میں پلازما پر تھرومبن کا ارتکاز کم ہوجاتا ہے اور انجماد خون کا وقفہ بڑھ جاتا ہے۔

جریان خون سے نہ صرف خون کی مقررہ مقدار میں کمی آجاتی ہے۔ بلکہ ان کے تمام اجزا میں تغیر کے آثار نمودار ہوجاتے ہیں۔ (پلازما کا حجم۔ سرخ جسیمے۔ پروٹین ہیموگلوبین۔ وغیرہ) قدرت کاملہ نے جسم کے اندر متلافی طاقتیں بھی بہم پہنچائی ہیں۔ جن سے کچھ وقت میں یہ خامیاں پوری ہوجاتی ہیں۔ واضح رہے کہ فوری خون نکل جانے سے زیادہ نقصان کا احتمال ہوتا ہے۔ بنسبت اس کے کہ اتنی ہی مقدار

میں خون زیادہ وقت میں خارج ہو۔

آپ کسی برتن میں کوئی بھی سیال شئے رکھ دیں اور اس برتن میں سوراخ کر دیں تو بالآخر تمام مشروب یا محلول اس برتن سے آہستہ آہستہ خارج ہو جاتا ہے۔ مگر دیکھنے اور سوچنے کی بات یہ ہے کہ انسان کے جسم میں اگر آپ سوئی سے سوراخ کر دیں یا زخم لگا دیں۔ جس کے نتیجہ میں جریان خون شروع ہو جائے تو اس خالق کائنات نے کیسی کیسی طاقتیں فراہم کر دیں کہ جریان خون خود بخود بند ہو جاتا ہے۔ تھرمبوپلاسٹن اور پلیٹ لٹس وغیرہ جو عام طور پر خون کے اندر رواں دواں ہیں۔ آپ کے خون کی نالیوں میں رکاوٹ نہیں بنتے۔ مگر جب زخم ہو جاتا ہے اور خون رسنے لگتا ہے تو یہی اشیاء فوراً زخم پر خون کے رسنے کا سدباب بن جاتے ہیں۔ کیا کسی انسان نے آج تک ایسی عجوبہ کار فرمائی کی ہے۔ نہیں! ہرگز نہیں!! یہ کمال تو صرف اسی مدبر کائنات کے حصہ میں ہے۔ جو فرماتا ہے۔ (افلا تتفکرون) تم فکر کیوں نہیں کرتے؟

ع بسوخت عقل ز حیرت کہ ایں چہ بوالعجبی است!

مشکل یہ آن پڑی کہ مغربی بود و باش نے ہمارے منجملہ مذہبی و ملی شعور کو اپاہج کر دیا اور ایمان پرستانہ نقطہ نظر کو عقل و منطق کے پیمانوں میں سمو دیا کہ ہم لوگ ڈارون۔ منڈل۔ ڈی وریز اور مورگن کی تھیوریز اور علم فکری کو نشاۃ ثانیہ سمجھنے لگے۔ کم علمی اور بے رضاعتی نے ان کی دائرہ سوچ و تجربہ میں پیدا شدہ نظریاتی ارتقائی و وراثتی تھیوریز کو آمنا و صدقنا کہنے پر مجبور کر دیا۔ حضرات! اہل ایمان کا زاویہ فکر اللہ اور اس کے رسول کی تعلیمات پر منتج ہوتا ہے۔ جیسا کہ ہم اولاً ذکر کر چکے ہیں کہ ایمان کا راستہ ایقان اور نظریہ علم کی پگڈنڈیوں کے طلاپ سے شروع

ہوتا ہے۔ اس لئے کہ ایمان کی تصریحات بغیر عقائد اور علمی اصلاحات کے ناممکن معلوم ہوتی ہیں۔

اب آپ ہی فیصلہ فرمائیں کہ خداوند ذوالجلال والاکرام کے نوازشات بے بہا اور بے پناہ جس سے انسان سرمو روگردانی نہیں کر سکتا۔ اس کے بلند بانگ دعوؤں میں پائے استقامت کہاں۔ مگر یہ سب تحقیقات و تصریحات تو صرف ان کے لیے ہیں جو ان پر غور کریں۔ اگر خدا نہیں کرتا تو یہ سب کون کرتا ہے اور جو ایسا کرنے سے قاصر ہیں۔ ان کے لئے تو خدا تعالیٰ نے ہی فرما دیا ہے:۔

یطبع اللّٰہ علیٰ قلوب الذین لا یعلمون ۝ (الروم۔ ۵۹)

خدا ان کے دلوں پر جو نہیں سمجھتے مہر لگا دیتا ہے۔



(۷)

کیا خدا سب سے بڑا خالق نہیں ہے؟

ڈاکٹر سید زاہد علی واسطی

اس جہانِ رنگ و بو کی اشیاء میں جو ہم آہنگی اور توافق پایا جاتا ہے۔ وہ یہی ثابت کرتا ہے کہ اس کی ہر شئے کے پیدا کرنے میں کوئی مقصد بھی ہے۔ آپ کائنات کی کسی چیز کو بے مقصد قرار نہیں دے سکتے۔ ہر چیز کی آفرینش میں حکمتیں اور مصلحتیں پوشیدہ نظر آتی ہیں۔ اس حقیقت پر کائنات اور انسانی وجود کے جملہ آثار و مظاہر شاہد ہیں کہ یہاں ہر شئے میں مقصدیت کارفرما ہے۔ حقیقت میں یہ پوری کائنات ایک نظامِ اقدار و مقاصد کے تحت چل رہی ہے۔ ذرا غور و فکر کو بروئے کار لائیں تو واضح ہو جاتا ہے کہ لازماً ان سب چیزوں کی پیدائش میں کوئی انتہائی کاریگری اور کوئی ایک قادر بھی ہوگی۔ یہ بات اس امر کی بھی مقتضی ہے کہ اس کائنات کے وجود میں کسی دستِ بالا کی دانش و بینش بھی کام کر رہی ہے۔ انسان اس تمام کائنات کا حاصل ہے۔ گل سرسبد ہے اور اور اشرف المخلوقات ہے۔ کائنات کی تمام قوتیں اس کی خدمت گذاری کے لیے وقف کر دی گئی ہیں۔ اس دنیا کی حقیقتوں کو ہماری ظاہری نگاہ سے مخفی رکھنے سے مقصود یہی ہے کہ ہمارے عقل و شعور، فکر و نظر، اور ضمیر و وجدان کا امتحان لیا جائے۔ جس سے یہ معلوم ہو جائے کہ کون عطیۂ ادراک اور اپنی سوجھ بوجھ سے صحیح کام لیکر اپنے لیے زندگی کی صحیح راہ متعین کرتا ہے اور کون ضلالت و گمراہی کی وادیوں میں بھٹک جاتا ہے۔

اندھی تقلید | منکرین۔ ملحدین اور مغربیت زدہ تعلیم یافتہ طبقہ احیائے دین کے

فکر و فہم کا مذاق اڑاتے ہیں۔ کیونکہ ان کے قلب و دماغ کو جدید سائنس نے کچھ اس طرح مسحور کر دیا ہے کہ اب ان کا خیال ہے کہ چاند اور مریخ کو مسخر کر لینے کے بعد مذہبی باتوں اور دنیوی امور میں کوئی معنویت نہیں رہی اور سمجھتے ہیں کہ یہ سب فرسودہ باتیں ہیں۔ اس میں کسی شک و شبہ کی گنجائش نہیں کہ سائنس آجکل اپنے عروج پر ہے۔ سائنسی ایجادات نے عقل انسانی کو ورطۂ حیرت میں غرق کر رکھا ہے۔ مگر اس کا یہ مطلب تو نہیں کہ سائنس کے منکرین و موجدین یہ سمجھنے لگیں کہ اب وہ خدائی کے حقدار ، حصہ دار یا دعوے دار بن گئے۔ آپ جانتے ہیں کہ عقل انسانی سائنس کی دنیا میں ایک ہمہ گیر حیثیت رکھتی ہے۔ مجھے بتایئے! کہ بایں ہمہ ان تمام محیرالعقل ایجادات کے کوئی سائنس داں اس بات کا دعویٰ کرے گا کہ وہ کسی بے عقل آدمی کو عقل دیدے۔ یہ وصف اس رب عزوجل کے ہی ہاتھ میں ہے اور جب وہ عقل جو اوج ثریا پر برسرپیکار ہے۔ خدا ہی کی عطا کردہ ہے اور سائنس بذات خود عقل کی دست نگر ہے تو پھر آپ کس منہ سے یہ بلند بانگ دعوے کرتے ہیں! کیوں نہیں مانتے کہ عقل کا کوئی خالق ہے!

اسلام کے معترضین نے زمانہ حال میں ایک اور اسکینڈل کھڑا کر دیا ہے۔ کہ ٹیسٹ ٹیوب بچے کی پیدائش کے تصور کو عوام الناس میں اس قدر مافوق الفطرت کارنامہ بنا کر مشتہر کیا جائے کہ لوگوں کے قلوب و اذہان ہمیشہ ہمیشہ کے لیے یکسر خدائے وحدہٗ لاشریک کے وجود سے (نعوذ باللہ) گمراہ ہو جائیں۔ ٹیسٹ ٹیوب بچہ کی پیدائش کوئی عجوبہ نہیں۔ جس طرح مرغی کے انڈے کو ایک خاص درجہ حرارت میں معینہ مدت تک رکھنے سے بچہ نکل سکتا ہے۔ بالکل اسی طرح لیڈز یونیورسٹی انگلستان کے ایک ڈاکٹر ڈگلس بیوس نے انسانی جنین کی بارآوری ٹیسٹ ٹیوب میں خاص درجہ حرارت

میں محفوظ کرنیکے بعد عورت کے رحم میں منتقل کر دیا اور بچہ کی پیدائش پر ٹیسٹ ٹیوب بے بی کے نام سے موسوم کر دیا۔ سوچنے کی بات ہے کہ یہ عمل تو مین مزاج فطرت کے مطابق تھا۔ سائنسدانوں کی عظمت تخلیق خدائی کو چیلنج کرنے کی دعوے دار تو جب ہو کہ وہ ایک چڑیا کا بچہ ہی مصنوعی جُنین سے تیار کر کے دکھا دیں۔ آپ کو اچھی طرح سمجھ لینا چاہیے کہ یہ اقتدار اعلیٰ سوائے خالق کائنات خدائے عزوجل کے علاوہ کسی کو حاصل نہیں۔

ہمارے نوجوان جو غور و خوض کیے بغیر کہ اسلام کی اساس اللہ تعالیٰ کا اقتدار اعلیٰ ہے اور وہی حیٔ و قیوم ہے۔ اس واہمہ کا شکار ہو گئے کہ اب انسان کی پیدائش بھی سائنس کی محتاج بن گئی۔ اسطرح وہ لوگ افسوسناک حد تک بے راہروی کا شکار ہو گئے ہیں۔ ان حضرات کو یہ معلوم نہیں ہے کہ یہ معلومات مغربی اساتذہ سے ماخوذ ہیں اور ملحدین و متشککین کی صدائے بازگشت ہیں۔ انہی ملحدین و متشککین کے حقیقی خدوخال پر بھی اگر ایک نظر ڈالیں تو ان کے شکوک و شبہات کا حقیقی منبع اور ماخذ نظر آجائے گا۔

یورپ کے ایک ملحد فلسفی برٹنڈرسل نے عیسائیت پر ایک مرتبہ تنقید کرتے ہوئے کہا کہ "جس عہد میں مذہب پر سب سے زیادہ زور دیا جاتا ہے۔ اور جس عہد میں ایمان کی فراوانی ہوتی ہے وہ عہد ظلم و وحشت میں سب سے آگے ہوتا ہے۔ اس مذہبی عہد میں جبکہ عیسائیت کو اس کی مکمل صورت میں قبول کیا جاتا تھا اور منظم کلیسائی کی وحشت و بربریت بے دینی کو ختم کر دینے کے لیے ہمہ وقت برسرِ پیکار رہتی تھی۔ لاکھوں بدنصیب خواتین کو زندہ جلا دیا جاتا تھا اور مذہب کے نام پر ہر قسم

کا ظلم روا رکھا جاتا تھا۔ اگر آپ گرد و پیش کے جہاں پر نظر ڈالیں تو محسوس ہو جائے گا کہ انسانی احساسات میں ہر معمولی ترقی۔ فوجداری قوانین میں اصلاحات کے خاتمے کی جانب ہر قدم۔ رنگدار نسلوں سے بہتر سلوک کی ہر تجویز۔ غلامی کے دستور میں ہر ترمیم۔ قصہ کوتاہ یہ کہ منظم کلیساؤں نے دنیا میں ہر اخلاقی اصلاح کی مخالفت کی ہے۔ پس میں اس نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ عیسائیت جیسا کہ اسے کلیساؤں میں منظم کیا گیا تھا۔ دنیا میں اخلاقی و معاشرتی اصلاح کی دشمن تھی اور اب بھی ہے"

ہمیں اس سے غرض نہیں ہے کہ عیسائیت کے بارے میں برٹنڈرسل کا یہ اقتباس درست ہے یا نہیں مگر یہ آپ ضرور سوچئے کہ مغربی دنیا پر جو آج بے چینی اور اضطراب کے بادل چھائے ہوئے ہیں اور وہ لوگ نفسیاتی اور اعصابی عوارض میں مبتلا ہیں اور جس طریقہ سے وہ اپنے مسائل میں راہِ فرار حاصل کرنے کے لئے منشیات کا سہارا لینے پر مجبور ہوگئے ہیں۔ ان اغراض مقاصد کا اگر بنظر غائر مطالعہ کریں تو انکشاف ہوگا کہ ان خرابیوں سے نجات حاصل کرنے کے لئے انسانیت کے ذہنی اُفق کو روحانی پر تَو کی ضرورت ہے۔ اور یہ مقصد لادینیت میں میسّر نہیں بلکہ صرف مذہب سے قربت میں میسر آسکتا ہے۔

برٹنڈرسل نے جو عیسائیت کا فلسفانہ تجزیہ کیا۔ کلیساؤں کے مذہبی داخلی و خارجی امور پر جو محققانہ رائے زنی کی ہے۔ کم از کم مذہب اسلام میں ان کا کوئی جواز نہ موجود تھا اور نہ ہے۔ اسلامی تہذیب نے مذہب سے تحریک حاصل کی۔ علم و شعور اور آگاہی کو اس تہذیب میں مرکزیت حاصل رہی۔ کبھی عقائد اور حقائق کا تصادم نہ ہوا۔ یورپی دانشوروں کی طرح اسلام کا کوئی مکتبہ فکر مذہب اور انسانی

ترقی کے درمیان متنازعہ فیہ نہ بنا۔ اس کامیابی کا اصل منبع و کلید قرآن ہے اور یہی اسلام کی روح ہے۔ اور اس روح اور سائنس میں کوئی تضاد نہیں ہے۔

کائنات کا تصوّر

مشہور فلسفی اور سائنسدان آئن سٹائن کے نظریہ اضافیت نے مادہ کا غیر حقیقی ہونا ظاہر کر دیا۔ اشیاء کی مخصوص ہیأت کو اضافی اور غیر حقیقی قرار دیا۔ عقل عامہ کے لحاظ سے مادہ زمان اور مکان میں موجود ہے۔ آئن سٹائن کی تحقیق کے بموجب مادہ ٹھوس اور جامد وجود نہیں رکھتا جبکہ اصلی توانائی حرکت ہے اس نظریہ کی رو سے کائنات میں جو اشیاء کا ایک مجموعہ نظر آتی ہے۔ کوئی ٹھوس شے نہیں ہے۔ بلکہ وہ صرف عوامل اور اثرات (Actions and Events) کا مجموعہ ہے۔

یہ وسیع کائنات جو ہماری نگاہوں کے سامنے پھیلی ہوئی ہے اور اس سے جہاں زندگی کی بہت سی ضرورتیں رفع ہوتی ہیں۔ ہمارے لئے ایسے بے شمار دلائل وشواہد بھی فراہم کرتی ہیں۔ جن کا ہماری زندگی سے بہت گہرا تعلق ہے۔ ہم دیکھتے ہیں کہ ساری کائنات اپنے اجزا سمیت حادث ہے۔ جس طرح فنا ناتوانی کی علامت ہے اس طرح بقا کمال درجہ کی توانائی کی مظہر ہے۔ جب ہم کائنات پر غور کرتے ہیں تو اس کی کوئی شے بھی تغیر سے خالی نظر نہیں آتی۔ کسی شے کو بھی ایک حال پر قرار نہیں ہے۔ حرکت کے بعد سکون اور سکون کے بعد حرکت کا حادث ہونا نظر آتا ہے۔ آئن سٹائن کے نظریہ اضافیت سے جب کائنات میں عوامل اور اثرات کارفرما نظر آتے ہیں تو ان کے لئے نت نئے حوادث کا ہونا لازمی ہے۔ ہم اسی نظریہ سے آپ پر واضح کئے دیتے ہیں کہ ہر حادث کا محدث بھی ہوگا۔ ہر عمل کے لئے کوئی عامل بھی ضروری ہے۔ ہر اثر

کے لیے کسی مؤثر کا وجود بھی ہوگا۔ کیونکہ حادث محتاج ہے سبب اور علت کا اور سبب اور علت کے وجود کے لیے کوئی موجد ضرور ہوتا ہے۔ لہٰذا ایک موجد کا ہونا ازبس ضروری ہے۔ اس واسطے سائنسدان جو منکرانہ اور ملحدانہ نظریات کے حامل ہیں ان سب کو چار و ناچار تسلیم کرنا ہی پڑے گا۔ وہ علیم ہستی خدا تعالیٰ جس نے نظامِ کائنات کو وجود بخشا محدث ہے۔ مؤثر ہے۔ موجد ہے۔ فاعل ہے اور حیّ و قیوم بھی ہے۔ یہ سب اس لیے کہ علم ایجاد ارادہ فعل۔ قدرتِ حادث۔ تدبیر مؤثر وجودی صفات ہیں۔ جن کا ایک ہی وجود کامل میں ہونا ضروری ہے۔ اور خدا کے علاوہ اور کوئی وجود کامل نہیں۔ اس وجہ سے اس ہستی کامل کو خالق۔ قادر۔ صاحب علم و ارادہ۔ مدبر کائنات مان لینے سے مفر نہیں۔

دعوتِ غور و فکر انسان کو اپنے جسم کی بقا اور ترقی کے لیے ہزاروں مادی چیزوں کی ہر قدم پر ضرورت رہتی ہے۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ جس نے انسانی جسم میں ذرہ ذرہ کی تکمیل کے لیے سب کچھ مہیا کر دیا وہ قادر مطلق۔ خالق کون و مکان کون ہے؟ کیا سائنسدان اس گتھی کو سلجھا سکتے ہیں؟ کیا وہ اپنی سطحی نگاہ سے یہ سمجھتے ہیں کہ کائناتِ عالم ان کے دائرہ ادراک میں ہے؟ یہ ان سب کی خام خیالی ہے اور کوتاہ بینی ہے۔ کائنات میں ہزاروں چیزیں ایسی ہیں کہ ہنوز وہاں تک ہمارے علم کی رسائی نہیں ہے اور عقل و خرد سے ماوراء ہیں۔ کیونکہ ہمارا علم مخلوق ہے۔ اور عدم سے وجود میں آیا ہے۔ اگر انسان کو یہ زعم بہ خویش ہے کہ اس کے ادراکات کائنات کو احاطہ کئے ہوئے ہیں تو یہ اس کی اپنی نادانی ہے۔ حقیقت تو یہ ہے کہ خدائے وحدہٗ لاشریک ہمارا خالق۔ قضاء و قدر ہے۔ ہر مخلوق کا پیدا کرنے والا ہے۔

علم و قدرت والا ہے۔ اس کے علم و قدرت ہی کی وجہ سے افعال تکمیل کے مراحل طے کرتے ہیں۔ اس کی تجویز کے مطابق وجود میں آتے ہیں۔ اس کی حقیقت و ماہیت نہ تو ہمارے دامن علم میں سما سکتی ہے اور نہ ادراک انسانی کی طاقت گرفت میں قابو کی جا سکتی ہے۔ قرآن پاک میں اسکا بیان اسطرح ہے:-

لَا تُدْرِكُهُ الْاَبْصَارُ وَهُوَ يُدْرِكُ الْاَبْصَارَ وَهُوَ اللَّطِيْفُ الْخَبِيْرُ ٥

(ترجمہ) وہ ایسا ہے کہ آنکھیں اسکا ادراک نہیں کر پاتیں۔ وہ آنکھوں کا ادراک کرتا ہے وہ بھید جاننے والا خبردار ہے۔ (الانعام - ۱۰۴)

رب السموات والارض نے اپنی قدرت کاملہ سے زمین کے فرش کو سنوارا۔ آسمانوں کو ستونوں کے بغیر تان دیا۔ ملکوت کی دنیا کو منور کر دیا۔ پہاڑوں کو بلند کیا اور ان کو زمین پر قائم کر ڈالا۔ دریاؤں کو بہایا۔ سمندروں کو متلاطم کیا اور اسی مجیب الدعوات نے انسان کو کائنات عالم میں اپنی قدرت کاملہ کی تخلیق کا شاہکار بنایا اور پھر انسان کو بعد از آفرینش مسجود ملائکہ بنا کر عظمت و فضیلت کی آخری سند عطا کر دی۔ اس تخلیق پر قادر مطلق خود نازاں و فرحاں ہے۔ واقعی اس کی خالقیت کا کوئی جواب نہیں۔ خالق ہونے میں بھلا کون اسکا شریک ہو سکتا ہے۔ اور کون اس کی ہمسری کر سکتا ہے۔ مگر حیف ہے کہ یہی انسان خدا کی الوہیت اور وحدانیت پر یقین رکھنے والوں کے ساتھ بایں طور مقابلہ و مجادلہ بھی کرتا ہے۔ خدائے عزوجل کی ہمسری کا دعوے بھی کرتا ہے اور اس کی شراکت کا جواز بھی پیش کرتا ہے۔

ہمارے جسم کی ساخت۔ اس کے کل پرزے کس حکمت بالغہ سے ایجاد کئے گئے۔ ان کو طاقت استعمال عطا کی گئی۔ قوت مدافعت بخشی گئی۔ بے ساختہ

بصیرت مخلوق اس کے خالق اور عظیم موجد کو ڈھونڈتی ۔ علم الا بدان و علم الافعال کے ماہرین ہزارہا سال سے اس قانونِ فطرت کو ڈھونڈ رہے ہیں کہ جس قانون سے یہ وجود میں آتا ہے ۔ نشوونما پاتا ہے اور زوال پذیر ہوتا ہے ۔ مگر ان کی درماندگی شرمندہ تعبیر نہیں ہو پاتی اور یہی شرمندگی و درماندگی اس واجب الوجود کی ہستی فاعل حقیقی کا اعتراف اعلان ہے :۔

(ترجمہ) یقین کرنے والوں کے لیے زمین ہی میں اسکی پہچان کی بہت سی نشانیاں ہیں ۔ خود تمہارے اندر بھی ۔ کیا تم انکو دیکھتے نہیں ۔ (الذّریٰت ۲۱ - ۲۰)

اسلام نے انسانی عقل و فراست کا دائرہ متعین کر دیا ہے ۔ کائنات پر غلبہ پانے کے لیے انسان کو اپنی عقل سے کام لینے اور کائنات کے ذرّے ذرّے پر ہر وقت مسلسل غور و فکر کی تاکید کی ہے ۔ ملاحظہ فرمائیے :۔

(ترجمہ) بے شک آسمان اور زمین کی پیدائش میں اور رات دن کے بدل بدل کر آنے جانے میں صاحبِ عقل لوگوں کے لیے نشانیاں ہیں ۔ یہ وہ لوگ ہیں جو کھڑے اور بیٹھے اور لیٹے ہوئے ۔ اللہ کو یاد کرتے ہیں اور آسمانوں و زمین کی پیدائش میں غور و فکر کرتے ہیں ۔ (آلعمران - ۱۹۰)

غور و فکر نہ کرنے والوں کے لیے خدا تعالیٰ نے انتہائی ناپسندیدگی کا اظہار فرمایا ہے ۔ ملاحظہ فرمائیے :۔

(ترجمہ) بے شک اللہ کے نزدیک سب جانداروں سے بدتر وہ ہیں جو عقل نہیں رکھتے ۔ (الانفال - ۲۲)

اس طرح اسلام نے غور و فکر کا مرجع و مقصود آیات الٰہیہ اجسام کائنات

کو بنایا۔ اسی وجہ سے قرآن پاک میں جگہ جگہ غور و فکر کی تلقین فرمائی گئی ہے۔ پس انسان کا فرض منصبی ہے کہ تخلیق کائنات پر غور و فکر کرے اور اس خالق کائنات کی ذات کو پہچانے جو اس کا مدبّر اور قیوم ہے۔

عقل کی ضرورت

ذرا آنکھ کھولئے۔ دیکھئے جو چیز بھی سامنے نظر آئے گی آپ تھوڑا سا سوچئے کہ کیسے نظر آ رہی ہے۔ وہی شے ایک نابینا کو نظر کیوں نہیں آتی؟ اس لئے کہ آنکھ کے اندر چیزوں کا عکس خودکار عدسہ سے گذر کر شبکیہ پردوں پر پڑتا ہے۔ پھر کروڑوں کی تعداد میں چھوٹی (Rods & cones) چھڑیوں اور مخروطوں کی تہوں میں سے گذر کر آپ کے اعصاب باصرہ تک پہنچتا ہے۔ تب جا کر آپ کہیں چیزوں کو پہچانتے ہیں۔ تمام کائنات کے روح پرور مناظر، سرسبز و شاداب باغات۔ رنگ برنگ پھول۔ سانولی سلونی شکلیں۔ دلفریب مسکراہٹیں۔ آپ کو کچھ دکھائی نہ دے گا۔ اگر آپ کے پاس آنکھیں نہ ہوں۔

یہ آواز کیسی آ رہی ہے۔ بڑی دلگداز ہے۔ آپ پھڑک اٹھے۔ بتائیں آپ نے کیسے سنی۔ کانوں ہی سے سنی۔ اگر آپ بہرے ہوتے تو کبھی نہ سن سکتے۔ یہ کان جو کئی ہزار پیچ دار مہرابوں پر مشتمل ہے۔ ایک لا مثال سننے کا آلہ ہے۔ جو آپ کے پاس قدرت کا عطیہ ہے۔ جو ہر آواز مکمل صحت کے ساتھ سن سکتا ہے۔ ایسا آلہ یقین فرمایئے۔ آج تک کوئی سائنسدان نہ بنا سکا۔ بہتر سے بہتر الیکٹرانک کان بھی ایسا نہیں جو انسانی کان کے برابر زود حس ہو یا اس کا نعم البدل بن سکے۔ ہمارے کانوں کے اندر وصول کرنے کی جو نازک جھلّی قدرت نے لگائی ہے۔ وہ ایک انچ کا کئی سو کروڑواں حصہ ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ انسانی کان الیکٹرانک آلات کے مقابلہ

میں مختلف النوع آوازوں کو بخوبی سن لیتے ہیں ۔ اور پھر یہیں پر اکتفا نہیں کرتے سُن کر تقریباً چار لاکھ مختلف آوازوں کو بخوبی شناخت بھی کر لیتے ہیں ۔ آپ کے یہ کان تشخیص بھی کرتے ہیں کہ یہ سریلے نغمے لتا منگیشکر کے ہیں یا نور جہاں مُغنّیہ کے بلکہ آپ کو یہ بھی بتا سکتے ہیں کہ ان نغموں کی آواز کس سمت سے آرہی ہے ۔

آپ نے نظر افروز مناظر دیکھے ۔ دل نشین آوازیں سُنیں ۔ یہ دیکھ اور سُن کر آپ محسوس کرتے ہیں کہ ان میں کچھ مانوسیت ہے ۔ آپ نے یہ مناظر پہلے دیکھ رکھے ہیں یہ سب کیسے ؟ جناب عالی ! ہمارا دماغ اور اس سے متعلقہ اعصاب سیکنڈ کے ہزارویں حصہ میں اس منظر اور آواز کی شناخت کر ڈالتے ہیں ۔ اسی طرح دل پذیر کھانوں کی مہک آپ کو احساس دلاتی ہے ۔ یہ سب آپ کے دستر خوان پر پہنچ جا چکے ہیں ۔ بریانی کی پلیٹ آپ کے پاس سے گذر جائے ۔ آپ نہ بھی دیکھیں ۔ مگر صرف اس کی مہک فوراً احساس دلائے گی کہ قریب ہی کہیں بریانی موجود ہے ۔ کیونکہ یہ نظارے ۔ یہ آوازیں ۔ یہ خوشبویات آپ کے دماغ کے خانوں میں محفوظ رہتی ہیں ۔ دیکھنے ۔ سونگھنے اور سننے کے بعد آپ کے دماغ میں تحریک ہوتی ہے اور یادداشت کے حصے پل بھر میں آپ کو بتا دیتے ہیں کہ یہ منظر مینارِ پاکستان کا ہے یا کلفٹن پر ساحل سمندر کا ۔ گھر میں داخل ہوتے ہی شناخت کر لیتے ہیں کہ آج پلاؤ پکا ہے یا تیل کے پکوڑے ۔ آواز سن کر آپ جھوم جاتے ہیں کہ مہدی حسن گا رہا ہے یا سہگل ۔ ذرا عقل پر زور ڈالئے !

انسانی دماغ ہی تو ہے جو شماریات کے مشکل سے مشکل مسائل کی عقدہ کشائی کرتا ہے ۔ سائنٹفک ایجادات جن سے آسمان پر پرواز اور سمندر میں زقند لگائی جاتی

ہیں ان تمام آلات کی تخلیق کرتا ہے۔ یہ سب کیا ہے؟ خدا تعالیٰ ہی کا عطا کردہ گنجینہ بے بہا ہی تو ہے۔ آخر اس گوشت کے لوتھڑے میں یہ ہوش ربا صلاحیتیں کس نے بھر دیں۔ کیا کوئی خلا سفر۔ کوئی حیاتیات کا ماہر۔ کوئی کیمیاگر اس کی توجیہہ کر سکتا ہے۔ اور بتا سکتا ہے کہ اس بے جان مادہ نے ترقی کر کے خود صلاحیتوں اور قابلیتوں سے بھرپور انسانی دماغ کی شکل کیسے اختیار کر ڈالی۔ اس حقیقت کو جاننے کے بعد کوئی ذی فہم اور مفکر۔ خدا تعالیٰ کے بہترین خالق اور حیّ و قیوم ہونے میں انکار نہیں کر سکتا ہے۔ جس نے ایک ایسا نظام عصبی قائم کیا کہ سائنس دان کھربوں ڈالر خرچ کرنے کے بعد بھی ایک سینٹی میٹر عصبی ریشہ نہ بنا سکے جبکہ قدرتی عصبی ریشے جو ایک انسان میں موجود ہیں اگر پھیلا دیئے جائیں تو لاہور سے کراچی تک بآسانی خبر رسانی کر سکتے ہیں۔

نظامِ عصبی

آئیے ہم آپ کو تفصیل سے بتائیں کہ نظامِ عصبی کیا ہوتا ہے۔ یہ نظام تمام جسم کو کنٹرول کرتا ہے۔ عضلات میں اصابت۔ غدود دوں میں عروق کے بہاؤ۔ جسم کے مختلف نظاموں میں ہم آہنگی و اشتراک۔ حرارت میں اعتدال۔ ارادی و غیر ارادی حرکات میں افراط و تفریط۔ اعضائے حاسہ سے اطلاعات کی بہم رسانی کے علاوہ احساسات و جذبات۔ قوت شامہ۔ سامعہ و باصرہ۔ شعور و ادراک۔ فکر و فہم سب کچھ نظام عصبی کے ہی مرہون منت ہیں۔ یہ نظام مرکزی و مشارکی ماتحت نظاموں پر مشتمل ہوتا ہے۔ مشارکی نظام تو مختصر سا ہوتا ہے۔ یہ عصبی مادے کی عقود (گانٹھوں) کی زنجیریں ریڑھ کی ہڈی کے دونوں جانب واقع ہوتی ہیں۔ جو عصبی ریشوں کی مدد ایک دوسرے کے ساتھ اور پھر

مرکزی نظام سے منسلک ہوتی ہیں۔ یہ نظام اندرونی اعضاء کی حرکات مثلاً انتڑیاں دل۔ جگر۔ معدہ وغیرہ کے افعال کی نگرانی کرتا ہے۔

عصبی نظام کا جزو لاینفک عصبی بافتیں ہوتی ہیں۔ عصبی بافتوں کا مادہ اعصابی خلیوں سے بنتا ہے۔ یہ دمدار ستارے کی شکل کا ہوتا ہے۔ جس کے مرکز پر ایک نیوکلیس واقع ہوتا ہے۔ خلیہ کے جسم سے ریشے نکلتے ہیں جو آگے بڑھکر دوسرے خلیوں کے پاس ختم ہو جاتے ہیں۔ اس طرح پیغامات کی رسائی ایک خلیہ سے دوسرے تک ہوتی۔ حتیٰ کہ جسم کے دُور دراز مقامات سے اطلاعات دماغ تک پل جھپکنے سے قبل ہو جاتی ہیں۔ یہ ریشے ہمارے جسم میں خبریں لانے اور لے جانے کے لیے علیحدہ علیحدہ ہوتے ہیں۔ لانے والے ریشوں کا نام اعصاب حرکی ہے جو دماغ یا حرام مغز سے عضلات۔ غدوددں یا خون کی نالیوں کو پیغامات پہنچانے پر مامور ہیں۔ دماغ اور حرام مغز سے عضلات کے سکڑنے اور پھیلنے کے احکامات۔ غدوددں سے رطوبت کے اخراج اور بند ہونے کی ہدایات۔ خون کی نالیوں کو گرمی کی حدت اور سردی کی شدت میں سکڑنے اور پھیلنے کی تحریکات کا موجب دراصل یہی عصب ہیں۔ جو ہمہ وقت اپنی کارگزاریوں میں برسرِ پیکار رہتے ہیں۔ دوسرے قسم کے اعصابی ریشے حسّی کہلاتے ہیں۔ اعضائے حاسہ سے دماغ اور حرام مغز تک پیغامات لے جاتے ہیں۔ ان کے توسط سے احساس پیدا ہوتا ہے۔ انہی کی وجہ سے ہم درد کی تکلیف محسوس کرتے ہیں۔ سُننے۔ دیکھنے اور چکھنے کے حواس انہی کی وجہ سے قائم رہتے ہیں۔ ان کے ذریعہ دماغ تک نہ کہ صرف تحریک ہوتی ہے۔ بلکہ آوازوں کو سُن کر۔ نظاروں کو دیکھکر یا خوشبویات کو سونگھ کر سمجھنے۔ پرکھنے

اور جانچنے کی کیفیت کا دارو مدار اور ان پر فیصلہ اور فیصلہ پر عمل درآمد کا حکم اور حکم پر ردعمل کا مقابلہ بھی دماغ اپنے عصب سے ہی کراتا ہے۔ خدا تعالیٰ نے آپ کو کیسی کیسی نعمتوں سے نوازا ہے۔ آپ ذرا سوچیے!

دماغ دماغ جیسے قیمتی خزانہ کو کئی مضبوط جھلیّوں میں بند کر کے ایک کھوپڑی میں محفوظ کر دیا گیا۔ خداوند کریم کا عطیہ بے بہا عصبی نظام کے ذریعہ جسم کے ایک ایک خلیہ سے اپنا رابطہ استوار رکھتا ہے۔ دماغ کے اپنے اندر خلیہ ہوتے ہیں۔ جن کی تعداد ایک محتاط اندازے کے بموجب تیرہ ارب پچاس کروڑ کے لگ بھگ ہوتی ہے۔ کارکردگی کے لحاظ سے یہ خلیئے اطلاعات کی وصولیابی اور روانگی احکامات کے مرکز ہوتے ہیں۔ نیز یہ زیادہ معروف اعضائے حاسہ کو اعصاب بھی فراہم کرتے ہیں۔ جہاں ایک سیکنڈ کے ہزارویں حصے میں استفسارات کی معلومات بہم پہنچائی جاتی ہیں۔

انسان کمپیوٹر کی ایجاد پر نازاں ہوتا ہے۔ مگر سوچیے تو سہی! کمپیوٹر کی ایجاد اوّل تو اسی دماغ کی مرہونِ منّت ہے۔ دوم یہ کہ لاکھوں روپے کے مصارف سے چلنے والا کمپیوٹر وہ کام کہاں کر سکتا ہے جو دماغ انسانی کرتا ہے۔ داد دیجیے اس صانعِ عظیم کو جس نے انسان کی کھوپڑی میں ایک بغیر قیمت کمپیوٹر لگا دیا جو بچپن سے بڑھاپے تک کی لاکھوں یادداشتیں شکلیں۔ احساسات۔ جذبات۔ عملیات۔ معلومات محفوظ کر لیتا ہے۔ سب سے بڑی بات یہ ہے کہ کمپیوٹر کو جب تک فیڈ نہ کریں وہ محض ایک مشین بے مصرف ہے۔ دماغ کو نہ تو فیڈنگ کی ضرورت ہے اور نہ کمپیوٹر کی طرح متوالی اخراجات کی ضرورت ہے۔

دماغ اکبر (CEREBRUM) یہ حصہ دماغ میں سب سے بڑا ہوتا ہے۔ یہ حصہ ایک لمبے شگاف کے ذریعہ دو حصوں میں منقسم ہوتا ہے۔ جو دائیں اور بائیں حصے کہلاتے ہیں۔ یہ دونوں حصے نیچے کی جانب ایک مضبوط گول بند کے ذریعہ بندھے ہوتے ہیں۔ دماغی نصف حصوں کے بارے میں انتہائی دلچسپ بات یہ ہے کہ ہر نصف حصہ اپنے برعکس جانب کے نصف جسم کے حصوں کو کنٹرول کرتا ہے۔ یعنی جسم کے دائیں جانب اعصاب دماغ کے بائیں جانب کے حصے کو پیغامات لے جاتے اور لے آتے ہیں۔ اگر دماغ کے دائیں حصہ پر کوئی ضرب لگ جائے یا دوران خون میں کوئی ذرہ خون منجمد ہوکر گردش کرتا ہوا اس حصہ کی خون کی نالیوں میں پھنس جائے تو جسم کا بایاں حصہ مفلوج ہوکر رہ جائے گا۔ دماغ اکبر کے ان بڑے حصوں کو مزید چار چار حصوں میں منقسیم کیا جاتا ہے۔ سامنے کے حصے کو فرنٹل اوپر کا حصہ پے رائٹل۔ باہر کی جانب کے حصے کو ٹمپورل اور پچھلی جانب کے حصے کو آکسی پی ٹل کہا جاتا ہے۔ دماغ اکبر کی سطح پر بہت سی سلوٹیں نظر آتی ہیں جن کو اگر کھول کر پھیلا دیا جائے تو تمام سلوٹیں تقریباً چار ہزار مربع سینٹی میٹر زمین پر پھیل جائیں گی۔ کہا جاتا ہے کہ دماغ پر سلوٹوں کی بہتات زیادہ دماغی قوت اور صلاحیت کا آئینہ دار ہوتی ہیں۔

دماغ کا فرنٹل حصہ انسان میں شخصیت۔ جذبات۔ یادداشت اور معاشرتی میلان کے متوازن رکھنے میں سرگرم عمل رہتا ہے۔ تجربات کی روشنی میں یہ بات بڑے وثوق سے کہی جا سکتی ہے کہ جن لوگوں کا یہ حصہ چوٹ یا ضرب سے متاثر ہوگیا یا بچپن ہی سے معدوم رہا۔ ان میں اپنی شخصیت سے لاپرواہی۔ اختلاط وانبساط

سے محرومی ۔ معاشرتی ارتباط اور ثقافتی تخصیص میں ناکامی ۔ تجربات کی اندازہ گیری اور وسائل سے استفادہ حاصل کرنے کا شعور ایک عام شخص کی بہ نسبت کم ہوتا ہے یا قطعی طور پر فقدان ہوتا ہے ۔ دماغ کا پیرائٹل حصہ اوپر کی طرف دونوں جانب میں سامنے اور پچھلے دماغ کے حصوں سے اور نیچے کی جانب عصبی ریشوں کی گانٹھ سے منطبق ہوتا ہے ۔ یہ حصہ دماغ کا سب سے ضروری اور منتظم حصہ کہلاتا ہے ۔ یہاں ایک لمبی سلوٹ کے اندر کی جانب دونوں طرف ایک مرکز ہوتا ہے جو انتہائی بیش قیمت ہے ۔ صانع عظیم نے اس کی حفاظت کے لئے بے پناہ انتظامات کئے ہیں ۔ یوں کہیئے کہ انسان کا وجود ہی اس سلوٹ کے اندر سمٹ کر پنہاں کر رکھا ہے ۔ بالالفاظ دیگر جسم کے تمام اعضاء کے لئے الگ الگ مرکز اسی جگہ ہوتے ہیں ۔ جو قطعاً نمایاں نہیں ہوتے بلکہ عام آنکھ سے نظر نہ آنے والے خلیوں کی شکل میں ہوتے ہیں اور ایسے ہزاروں خلیئے ملکر انسان کے پیر سے لیکر دماغ تک کے تمام اعضاء کے نہ نظر آنے والے خاکے کی صورت میں ثبت ہوتے ہیں ۔ جہاں احساسات کے علاوہ درد کے پیغامات ان کے رد عمل میں احکامات وصول اور صادر کئے جاتے ہیں ۔ قدرے اندر کی جانب ایک اور مرکز ہوتا ہے ۔ جسے تھیلامس کہتے ہیں ۔ یہ مرکز جسم کی حرارت کو اعتدال پر رکھنے میں زبردست کام انجام دیتا ہے ۔ جسم کی تمام حرکات و سکنات ۔ فکرات و احساسات ۔ اسی کے دائرہ اختیار میں ہیں اعصاب حرکی جو دماغ اکبر میں جاتے اور آتے ہیں ۔ یہیں سے ہوکر گذرتے ہیں ۔ جسم کے اعضاء سے اطلاعات و پیغامات آتے وقت یہاں ان کی شدت و کمیت کا جائزہ لیا جاتا ہے اور حسب ضرورت کمی و بیشی کی جاتی ہے ۔ بالعموم فکرات جو بذات خود

ایک قسم سے احساسات کی منعکس شدہ تحریک ہوتی ہیں۔ یہاں پہنچ کر ظہور میں آتی ہیں۔ یہ شعور و احساسات کبھی تو ایک خاص نظام و ترتیب سے انسانی افعال کا مبداء بنتا ہے اور کبھی ایک نامعلوم مبدار بنتا ہے اور دماغ اکبر سے حرکی اعصابی تحریک پر مطلوب و مقصد کی طرف رجوع کرتا ہے اور نفیاً یا ثباتاً جسم کے اعضاء سے آمد شدہ پیغامات کی عکاسی کرتا ہے۔ اسی فکری طبیعت سے انسان دیگر تمام حیوانات سے ممتاز و اشرف ہے۔ دماغ اسی مقام پر طبیعت فکریہ کی صحت فکر کی جانچ پڑتال کرتا ہے کہ کہیں ترتیب افعال میں غلطی سرزد نہ ہو جائے۔ یہی وہ مقام ہے جہاں صاحبِ فکر و نظر ان عوارضِ فکر کا تجزیہ اپنے تجربات کی اندازہ گیری کی روشنی میں کر ڈالتا ہے۔ تب اعصاب حرکی بعض مرتبہ اعصاب حسی یا دونوں کے ذریعہ فیصلہ کن نظریات ادراک عمل میں پیش کرتا ہے۔

دماغ کے دونوں بڑے حصوں کو مقامِ اتصال پر اگر لمبائی میں تراش لیا جائے تو اندرونی رخ پر ایک افقی دائرہ کی شکل کا پل نظر آئے گا۔ اس افقی پل کے زیریں حصہ میں قوت خیال کا مرکز ہوتا ہے۔ قوت خیال وہ قوت ہے جو محسوسات کے اجتماع سے پیدا ہوتی ہے۔ اعصاب حسّی اسی راستہ سے گذر کر دماغ کے بالائی علاقوں میں جاتے وقت اپنے جزئیات کا ادراک کرتے ہیں۔ یہاں محیر العقل پیرائے میں قوت واہمہ اور قوتِ حافظہ سے متاثر ہوتے ہوئے آگے بڑھ جاتے ہیں۔ قوتِ حافظہ خیالات کے ادراکات کا خزانہ ہوتا ہے۔ ان تمام تاثرات۔ احساسات خیالات کو قوت حافظہ مجتمع کر لیتا ہے اور محفوظ رکھتا ہے۔ تاکہ وقت ضرورت ان سے کام لیا جا سکے۔ یہ سب قوتیں اوپر جا کر قوتِ فکریہ پر معکوس ہوتی ہیں۔

جس کے ذریعہ فکر اور توجہ ۔ ادراک و تعقل کو متوجہ کرتی ہے۔ نفس مدرکہ اسی کے ذریعہ ہی ہمیشہ کام کرتا رہتا ہے۔ کیونکہ نفس مدرکہ میں پیدائشی طور پر ایسی صلاحیت ہوتی ہے کہ ان معلومات کو حفاظت سے رکھ سکے۔ علم جوں جوں بڑھتا رہتا ہے نفس مدرکہ کی صلاحیتیں صیقل ہوتی رہتی ہیں ۔ ارتکازِ علم سے قوت حافظہ کی تربیت ہوتی رہتی ہے ۔ اگر قوتِ حافظہ سے کام نہ لیا جائے تو آہستہ آہستہ یہ صلاحیت ختم ہو جاتی ہے۔ بچپن میں یہ صلاحیت بدرجہ اتم ہوتی ہے اور نئے نئے الفاظ کو ایک دو مرتبہ سُن لینے کے بعد ہی مرکز پر منقش کر دیتی ہے ۔ جبکہ عمر کے بڑھنے کے ساتھ ساتھ قوت حافظہ کمزور ہوتی جاتی ہے اور یادداشت آہستہ آہستہ رُو بہ زوال ہو جاتی ہے ۔

قوت سماعت

دماغ کے ٹمپورل حصہ میں قوت سماعت اور گویائی کے مراکز واضح طور پر ہوتے ہیں۔ کسی آواز کے پیدا ہونے سے ہوا میں جو ارتعاش پیدا ہوتا ہے ۔ اس سے ہوائی لہریں حرکت میں آتی ہیں اور آلہ سماعت (کان) تک پہنچتی ہیں۔ کان کے پردہ سماعت پر چوبیس ہزار کے قریب ریشے ہوتے ہیں جو اس گونج کو انتہائی جانفشانی سے ایک طویل چکردار راستوں سے گزار کر عصب سامعہ کے ذریعہ دماغ اس حصہ تک پہنچا دیتے ہیں ۔ قوت سامعہ کے مرکز میں آواز کی عملی پڑتال ہوتی ہے ۔ اس مرکز کے قریب نفسیاتی سامعی مرکز میں اس کی شناخت کر لینے پر معلوم ہو جاتا ہے کہ یہ آواز رونے کی ہے یا ہنسنے کی ۔ ہارن کی ہے یا بانسری کی سریلی آواز ہے یا دلخراش ۔ اس کے ساتھ قریب ہی دوسری سائڈ میں ایک مرکز ہوتا ہے ۔ جسے سمعی ناطقہ مرکز کہتے ہیں ۔ یہ مرکز آوازوں کی تجربہ گاہ ہے۔ یہاں

آواز کو ہزاروں خلیوں میں فوری طور پہ بانٹ دیا جاتا ہے۔ جہاں سے فی الفور واپس جواب مل جاتا ہے کہ یہ آواز پہلے سن رکھی ہے یا نہیں۔ آواز جانی پہچانی ہے یا نہیں۔ یا یہ آواز کسی دوسری آواز سے مشابہت رکھتی ہے یا نہیں۔ ان آوازوں میں جزئیاً کوئی فرق ہے یا کلیتہً نئی ہے۔

مرکز گویائی چونکہ اسی حصہ میں وقوع پذیر ہے اور اس کے مختلف مراکز سے ہمہ وقت باہمی رابطہ رہتا ہے اس وجہ آواز سننے کے بعد آپ بلا ارادہ سمجھ لیتے ہیں کہ یہ کون بول رہا ہے۔ یہ کون آواز دے رہا ہے۔ یہ کیا کہہ رہا ہے۔ اس کا کیا جواب دینا ہے۔ دینا بھی ہے یا خموش رہنا ہے۔ سمعی ناطقہ مرکز میں ہر طرح کی صلاحیت موجود ہوتی ہے۔ جب بچہ پیدا ہوتا ہے تو اس میں قوت سماعت ہوتی ہے۔ قوتِ گویائی نہیں ہوتی۔ بتدریج عمر کی بڑھوتری کے ساتھ ساتھ علم حاصل کرتا رہتا ہے اور اس طرح گویائی اور سماعت میں باہم تعاون و ارتباط کی ہم آہنگی پیدا ہو جاتی ہے۔ یعنی قوتِ ناطقہ کی صلاحیت کو عدم سے وجود میں لانے کے لئے علوم اور ادراکات کی ضرورت پڑتی ہے۔ جوں جوں انسان علم حاصل کرتا ہے۔ اسی نسبت سے اس کی قوتِ ناطقہ بڑھتی رہتی ہے۔ شروع میں انسان پہلے دیکھتا ہے۔ پھر سنتا ہے۔ پھر محسوس کر کے اوپر کے مراکز میں اطلاعات دیتا ہے۔ جہاں ان سب کا ادراک ہوتا ہے۔ اس علم سے قوت نظریہ کے ذریعہ ان دیکھی اور نامعلوم اشیاء کا بھی ادراک کر لیتا ہے۔ اور یہ سب افعال دماغ کے انہی خلیوں میں محفوظ ہو کر رہ جاتے ہیں۔ اگر ان کی بازیافت ہوتی رہے تو وہ دماغ میں محفوظ رہتے ہیں۔ ورنہ ذہن سے

محو ہو جاتے ہیں۔ انہی مراکز میں بحث و مباحثہ ۔ افکار و گفتار اور لفظی کلموں سے دلائل کی طرف اور دلائل سے مدلولات کی طرف منتقل ہونے کی صلاحیتیں پنہاں رہتی ہیں۔ جن کی حُسنِ کارکردگی کی صلاحیت سائنسدان یا کوئی فلسفہ دان اتنے مختصر ترین حصہ میں پیدا نہیں کر سکتا۔ اور نہ ان سب اسباب یا آلات کی فراہمی بجز خدائے حیّ و قیوم کوئی کر سکا ہے۔

دماغ کے پچھلے یعنی آکسی پی ٹل حصّے میں دائیں اور بائیں جوانب کی آنکھوں کے عصب باصرہ مل جاتے ہیں اور دماغ کے اس حصّے میں نیچے کی سطح پر مختلف النوع مثلاً اندھیرے اور روشنی میں فرق ۔ روشنی کی اعانت ۔ رنگوں کی پہچان ۔ چکا چوند کرنے والی شعاعوں سے بچاؤ اور تصوراتی بنیادوں پر سمجھ لینے والے مراکز قائم ہوتے ہیں ۔ یہاں ان تمام شعاعوں کی جانچ پڑتال ہوتی ہے اور کچھ تو وہیں نچلی سطحی مراکز میں سے ضروری احکامات کے لئے دماغ کو روانہ کردی جاتی ہیں اور بعض باب ہمہ دماغ اکبر کے متعلقہ مراکز کو روانہ کردی جاتی ہیں۔ ان کے علاوہ چند سیدھی دماغ کے پچھلے حصے میں پہنچ جاتی ہیں جہاں ان کی ضروری پہچان ہوتی ہے ۔ بعض ان دیکھی چیزوں کا صرف ذکر سن کر تصور ہی سے نظرِ عقلی کے ذریعہ ان کی کیفیات کا اندازہ لگا لیا جاتا ہے ۔ نابینا اشخاص میں چونکہ عصب باصرہ کے ذریعہ کوئی اطلاع یہاں نہیں آتی اور صرف قوتِ سامعہ کے مرکز سے یہ لوگ تصور کے ذریعہ نظرِ عقلی کا استعمال کرتے ہیں ۔ اور نظرِ عقلی چونکہ نابینا افراد میں ہمہ وقت اسی جستجو میں رہتی ہے اور ان کی عقل و دانش اور ادراک میں اضافہ کرتی ۔ جبکہ بینا اشخاص میں اس مرکز کی نشوونما کم رہتی ہے

دماغ کی کارگزاریوں پر تو دفتر لکھے جا سکتے ہیں۔ اس مختصر اجمالی جائزہ دماغ سے میرا ماحاصل صرف یہی ہے کہ انسان اپنی سائنسی تحقیقات و معلومات پر فرحاں ہے اور اس خالق حقیقی کو فراموش کرنے پر بضد ہے اور خود کو اپنی زندگی پر قادر کر لینے پر تُلا ہوا ہے اور اپنی زندگی کی استواری و دوام چاہتا ہے۔ عمر کو طویل تر کرنا چاہتا ہے۔ تمام سائنسی سرمایہ کو اس ضمن میں بروئے کار لانے کے باوجود بھی یہ بحرِ حیات میں طوفانوں سے گھرا ہوا ہے۔ یہ ناکام نادر اور مظہر العجائبات موت سے اپنی جان چھپاتے پھرتا ہے۔ بیماری اور لاغری اس خودسر انسان کو ضعیف سے ضعیف تر کرتی رہتی ہے۔ خطرات و حادثات بظاہر عظیم لیکن درحقیقت مجبور انسان کا محاصرہ کئے رکھتے ہیں۔ ہر گھڑی ہر لحظہ یہ انسان مبتلائے آلام رہتا ہے۔ مگر افسوس پھر بھی خدائے ذوالجلال کی ہمسری کا دعویٰ کرتا ہے۔ اپنے کو خدا سے بڑا خالق ثابت کرنے پر مُصر انسان قوت و توانائی کے باوجود ایک دن اپنے خالقِ حقیقی کے پاس چلا جاتا ہے۔ حیف کوئی اس اشرف المخلوقات کی بے بسی تو دیکھے! اور بتائے کہ کیا خدا سب سے بڑا خالق نہیں ہے؟

---

(۸)

میں نے خداوند تعالیٰ کو دیکھا!

دید استدلالی ۔ دیدِ وجدانی ۔ دیدِ کشفی

ایم منظور محمد قادری ایم اے

کیسے دیکھا! میں نے خداوند تعالیٰ کو دیکھا! ہاں دیکھا! بے شک دیکھا! لیکن ظاہری آنکھ سے نہیں۔ کیونکہ میری یہ محدود آنکھ غیر محدود خدا کو دیکھنے کی اہلیت اور طاقت ہی نہیں رکھتی کیونکہ یہ عارضی فانی آنکھ خدا کو دیکھنا تو ایک طرف رہا۔ ایک معمولی دیوار کی دوسری طرف بھی نہیں دیکھ سکتی۔ سورج کی روشنی کے بغیر محض بے کار یہ انسانی آنکھ، دوپہر کے وقت آفتاب کی تیز روشنی اور تیز بجلی کی روشنی میں بے بس یہ میری محدود آنکھ، خالقِ کائنات جس کی ذات انسانی فہم و ادراک سے وراالوراء ہے۔ کو نہیں دیکھ سکتی اور جس چیز کو یہ انسانی ضعیف آنکھ دیکھ سکتی ہے۔ جن انوارات کا یہ مشاہدہ کر سکتی ہے۔ جن تجلیات کو یہ محسوس کرتی ہے۔ وہ سب کی سب خدا نہیں بلکہ خدا کی مخلوق ہیں۔ خدا کی ذات انسانی فہم و ادراک سے وراء الورا اور بعید از بعید ہے!

ہاں تو میں نے خدا تعالیٰ کو دیکھا: ضرور دیکھا! لیکن ظاہری آنکھ سے نہیں۔ غور و فکر اور استدلال کی آنکھ سے۔ سر کی آنکھ سے نہیں۔ سِر کی آنکھ سے۔ جسم کی آنکھ سے نہیں دل کی آنکھ سے!

روزانہ استعمال کی عام اشیاء

بائیسکل جس پر روزانہ سوار ہوتا ہوں۔ گھڑی جس پر وقت دیکھتا ہوں۔ جوتا جسے پہنتا ہوں۔ قلم جس سے لکھتا ہوں۔ برقی پنکھا جس کے نیچے بیٹھ کر روزانہ کام کرتا ہوں۔ اور سینکڑوں دیگر اشیاء جن کو میں روزمرہ استعمال کرتا ہوں ان میں سے ہر چیز کے متعلق میں حتمی اور یقینی طور پر جانتا ہوں کہ اگرچہ میں نے ان اشیاء میں سے کسی بھی شے کے بنانے والے کو نہیں دیکھا۔ تاہم مجھے ناقابل تردید اٹل یقین حاصل ہے کہ ہر چیز کسی بنانے والے نے بنائی ہے اور حادثہ یا اتفاق کی پیداوار نہیں ہے۔ ہر چیز کی ساخت میں مجھے اس چیز کے بنانے والے کا ذہن صاف نظر آتا ہے۔ موٹر ہو یا ہوائی جہاز۔ آٹا پیسنے کی چکی ہو یا خراد کی مشین۔ غرضیکہ ہر مشین کے ہر پرزہ، اس کی ہر کل، اس کے چھوٹے سے چھوٹے پیچ میں مجھے ایک خاص مقصدیت اور افادیت نظر آتی ہے۔ ان تمام کل پرزوں کی ساخت۔ ان کا آپس میں ربط۔ نظم جوڑ مجھے پکار پکار کر بتاتا ہے کہ یہ مشین خود بخود نہیں بن گئی بلکہ کسی بنانے والے نے بنائی ہے۔

دعوتِ فکر

کسی بھی چیز پر غور کیجئے۔ میرے سامنے اخبار رکھا ہے۔ کوئی پاگل اور مجنون بھی یہ نہیں کہہ سکتا کہ بانس کے جنگلات مختلف ارتقائی ادوار سے گزر کر خود بخود کاغذ بن گئے۔ کاغذ آندھیوں، بارشوں، زلزلوں سے خود بخود مناسب تقطیع میں کٹ گیا۔ اور مدت مدید گزرنے کے بعد اس پر حروف کے نقوش خود بخود ابھر آئے اور کسی نامعلوم ذریعہ سے اس پر تمام دنیا کی تازہ خبریں چھپ گئیں اور پھر یہ اخبار آندھی کے ذریعہ اڑ کر لاہور سے دُور دراز کا فاصلہ طے کرکے میری میز پر پہنچ گیا۔

حیرت کا مقام ہے کہ ہم سبکے سب بلا استثنار یہ تولقین رکھتے ہیں کہ ایک معمولی اخبار کے تیار کرنے کیلئے بھی ایک ذہن منصوبہ سوچ سمجھ ۔ شعور اور انسانی سعی درکار ہے اور ایک معمولی مشین کے بنانے کیلئے کسی فہیم باشعور کاریگر کی ضرورت ہے ۔ لیکن انسانی جسم کی حیرت انگیز مشین جو عجیب وغریب نظام دوران خون عمل انہضام اعصابی نظام اور بے شمار دیگر کل پرزوں پر مشتمل ہے ۔ اسکے متعلق ہم میں سے بعض یہ اعتقاد رکھتے ہیں کہ تمام دنیا بھر کی مشینوں سے زیادہ پیچیدہ یہ انسانی جسم کی مشین کسی بنانے والے کے بغیر خود بخود مختلف ارتقائی ادوار میں سے گزرتی ہوئی جامد ۔ بے حس ۔ بے شعور گونگے بہرے مادے سے شروع ہو کر آخر میں انسان کی شکل اختیار کر گئی ۔

انسانی دماغ

انسانی دماغ کی مشینری کے ان گنت کام ہیں ۔ دماغ ہی ہے جو اعضار کو حرکت میں لاتا ہے ان کو اپنے ضبط میں رکھتا ہے ۔ استدلال غور و فکر فیصلہ شعور حسن اور دیگر بے شمار اسکی صلاحیتیں ہیں ۔ قوت حافظہ اسکا کرشمہ ہے جس چیز کو ایک دفعہ دیکھ لیتا ہے ۔ ہمیشہ ہمیشہ کیلئے نہاں خانہ میں محفوظ ہو جاتی ہے ۔ اسکے سٹور ہاؤس میں لکھوکھا شکلیں اور نغمے محفوظ ہیں ۔ ہمارا دماغ کسی واقف شخص کی آمد پر ایک سیکنڈ کے لاکھویں حصہ میں دماغ کے نہہ خانہ میں محفوظ لکھوکھا شکلوں سے موازنہ کر کے پلک جھپکنے میں ہمیں بتاتا ہے کہ یہ فلاں شخص ہے اور ناواقف شخص کے متعلق فوراً ہمیں بتاتا ہے کہ اسکا فوٹو اسکے نہاں خانہ میں موجود نہیں ہے اور نووارد اجنبی ہے اور اسے زندگی میں پہلی مرتبہ دیکھا ہے ۔ آوازوں کے متعلق بھی اسکا طریق کار یہی ہے انسانی دماغ مشکل سے مشکل مسائل کی عقدہ کشائی کرتا ہے تمام نئی ایجادات دماغ کی مرہون منت ہیں ۔ آخر یہ دماغ کیا چیز ہے ؟ اس گوشت کے لوتھڑے میں یہ صلاحیتیں کہاں سے آگئیں ؟ کیا باہوش انسان ان صلاحیتوں

اور قابلیتوں کی مادی تشریح اور توجیہہ کر سکتا ہے۔ اور کہہ سکتا ہے کہ اندھے بہرے گونگے بے شعور بے جان مادہ نے ترقی کر کے خود بخود انسانی دماغ کی شکل اختیار کر لی ہے۔

انسانی آنکھ انسانی آنکھ کو دیکھئے اس کا لینز (عدسہ) اسکے ریٹنا (پردہ شبکی) پر جب کسی صورت کا عکس ڈالتا ہے تو اس عمل کے ساتھ ہی آنکھ کے خودکار اعصاب لینز کے تطابق سے فوکس پیدا کر لیتے ہیں۔ چشم انسانی کا شبکی پردہ نو تہوں سے مرتب ہے۔ ان میں سب سے اندرونی تہہ کوئی تین کروڑ چھڑوں اور تیس لاکھ مخروطوں پر مشتمل ہے۔ ہماری آنکھ کا خودکار عدسہ اپنی دبازت و کثافت میں مسلسل تبدیلی پیدا کرتا رہتا ہے تاکہ اس تک پہنچنے والی تمام شعاعیں خود بخود دماسکہ میں مرکوز ہوتی رہیں۔ انسان اس قسم کا لینز آج تک ایجاد نہیں کر سکا۔ سوال یہ ہے کہ کیا وہ حیرت ناک مطابقتیں جو چشم انسانی کو اعلیٰ درجہ کی بصارت عطا کرتی اور عینی عدسوں اور لاکھوں کروڑوں مخروطوں، چھڑوں اور نسوں کو ایک کامل ترتیب میں منظم کرتی ہیں محض اتفاق سے ایک ہی وقت میں یکجا ہو گئیں۔ کیا ہر عنصر تمام دوسرے عناصر کی ضروریات اور لوازم سے پہلے ہی آگاہ ہو کر اپنے آپکو انکے مطابق کر لینے پر قادر ہو چکا تھا؟

انسانی کان انسانی کان کا ایک حصہ تقریباً چار ہزار ایسی باریک اور پیچیدہ محرابوں پر مشتمل ہے جو قد اور شکل کے لحاظ سے ایک تدریجی سلسلہ بناتی ہیں اور یہ ایک دوسرے سے ایسی مطابقت رکھتی ہیں کہ ہر آواز پوری صحت کے ساتھ وصول ہوتی ہے اور فوراً دماغ تک پہنچتی ہے۔ آواز کیا ہے؟ یہ فضا میں کسطرح لہریں پیدا کرتی ہے؟ یہ لہریں کان میں کسطرح وصول ہوتی ہیں؟ ان لہروں کا مدوجزر جو بادلوں کی کڑک۔ توپ کے گولے درختوں کی سائیں سائیں کسی ساز یا نے کی ہر کن کی علیحدہ علیحدہ سُر سے پیدا ہوتا ہے کسطرح کان میں وصول ہو کر فوراً دماغ میں پہنچتا ہے اور علیحدہ علیحدہ شناخت اور تمیز ہوتا ہے؟ کیا دنیا کی کوئی مشین انسانی کان

کا کسی درجہ میں بھی مقابلہ کر سکتی ہے ؟

ہمارے جسم کا مواصلاتی نظام

ٹیلیفون کی لائن میں ہم تاروں کے پیچیدہ نظام کے ذریعے کراچی سے لندن کے لیے کال چند منٹ میں مکمل کر لیتے ہیں اور اس پر حیرت اور تعجب کا اظہار بھی کرتے ہیں لیکن کبھی بھی ہمارے وہم و خیال میں بھی یہ بات نہیں آتی کہ یہ پیغام رسانی کا نظام خود بخود کسی حادثہ یا اتفاق سے معرض وجود میں آگیا اور اس میں انسانی ذہن۔ محنت۔ منصوبہ بندی کا کوئی دخل نہیں۔

مگر ہمارے جسم میں ایک اور عجیب و غریب مواصلاتی نظام جو ٹیلیفون کے نظام سے کہیں زیادہ وسیع اور پیچیدہ ہے۔ اس مواصلاتی نظام پر کروڑوں خبریں دن رات اِدھر اُدھر دوڑتی رہتی ہیں جو مختلف اعضا کو حکم دیتی ہیں کہ وہ کب حرکت کریں۔ اس نظام کا مرکز انسانی بھیجہ ہے۔ بھیجے کے اندر تقریباً ایک ہزار ملین (ملین = دس لاکھ) عصبی خلئے (NERVE CELLS) ہیں۔ ہر خانے سے بہت باریک تار نکل کر تمام جسم کے اندر پھیلے ہوتے ہیں جن کو عصبی ریشے (NERVE FIBRES) کہتے ہیں۔ ان پتلے ریشوں پر خبریں وصول کرنے اور حکم بھیجنے کا یہ نظام قائم ہے۔ ہماری زبان میں تین ہزار ذائقہ خانے ہیں جن میں ہر ایک اپنے علیحدہ عصبی تار کے ذریعے دماغ سے جڑا ہوا ہے۔ ان کے ذریعے ہم مختلف مزے محسوس کرتے ہیں۔

یہ اعصاب ہی ہیں جن کے ذریعے ہم چکھتے ہیں، سنتے ہیں، دیکھتے ہیں محسوس کرتے ہیں اور مختلف عمل کرتے ہیں۔ عصبی نظام کی کئی قسمیں ہیں ایک (AUTONOMIC BRANCH) خود اختیاری عصبی نظام ہے جو ایسے افعال سرانجام دیتا ہے جو خود بخود جسم کے اندر ہوتے

ہیں۔ مثلاً ہضم۔ دل کی حرکت سانس وغیرہ وغیرہ۔

علاوہ ازیں ہماری تمام جلد میں حیاتی ریشوں کا ایک جال بچھا ہوا ہے۔ اگر ایک گرم چیز جلد کے سامنے لائی جائے تو تقریباً تیس ہزار گرم خانے اس کو محسوس کر کے فوراً دماغ کو اس کی خبر دیتے ہیں۔ اسی طرح ہماری جلد میں دو لاکھ پچاس ہزار خانے ایسے ہیں جو سرد چیز کو محسوس کرتے ہیں۔ جب کوئی سرد چیز جسم سے ملتی ہے تو دماغ کو فوراً خبر ہوتی ہے۔ دماغ خبر سنتے ہی جسم کو کانپنے کا حکم دیتا ہے۔ جسم کانپنے لگتا ہے۔ جلد کی رگیں پھول جاتی ہیں۔ مزید خون دوڑ کر آتا ہے تاکہ سرد جسم کو گرمی پہنچائی جا سکے۔ اگر ہم شدید گرمی سے دوچار ہوں تو گرمی کے مخبر دماغ کو اطلاع دیتے ہیں اور تیس لاکھ پسینہ کے غدود (GLANDS) ٹھنڈا پسینہ خارج کرنا شروع کر دیتے ہیں۔

کیا اس زبردست انسانی مواصلاتی نظام کا دنیا میں کوئی انسان کا بنایا ہوا مواصلاتی نظام مقابلہ کر سکتا ہے؟ کیا عقلِ سلیم کبھی باور کر سکتی ہے کہ یہ عجیب و غریب نظام اتفاق یا حادثہ سے خود بخود بن گیا اور ایک بے مثل صناع کی بے مثل کار یگری کا نمونہ نہیں!

(ریڈرز ڈائجسٹ بحوالہ علوم جدیدہ کا چیلنج صفحہ ۸۷)

معدہ انسانی معدہ دنیا کا سب سے بڑا معمل ہے۔ ہم اس کیمیائی معمل میں ہر قسم کی خوراک بلا سوچے سمجھے ٹھونستے رہتے ہیں اور اپنے دل کو یہ کہہ کر تسلی دے لیتے ہیں کہ ہمارا عمل انہضام خود بخود اس سے نمٹ لے گا۔ یہ غذا ہمارے عمل انہضام میں ریزہ ریزہ ہو کر از سر نو تیار ہوتی ہے اور ہمارے جسم کے اربوں خلیات میں سے ہر خلیہ کو مسلسل پہنچائی جاتی ہے۔ اس عظیم الشان تقسیم و ترسیل کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ خلیہ اس وسیع و عریض دسترخوان سے صرف اسی چیز کا انتخاب کرتا ہے جو اس کے انفرادی ضرورت

کے مطابق ہو۔ مثلاً ناخن بڑھانے والے خلیات ساری خوراک میں سے صرف وہی عناصر چنیں گے جو ناخنوں کی تعمیر میں صرف ہوتے ہیں۔ یہی صورت ہڈی، کھال، بال، دانت وغیرہ اور دیگر اعضا کے بارے میں صادق آتی ہے۔ ہمارے جسم کا یہ خود کار بے مثال معمل بہ یک وقت اتنی مختلف النوع اور کثیر اشیاء تیار کرتا ہے جو دنیا کے کسی دیگر معمل میں ممکن نہیں اور اس معمل کے ساتھ رسل و رسائل کا ایک ایسا لاجواب نظام مربوط ہے کہ صحت عمل ترتیب قواعد کی پابندی اور تیز رفتاری کے اعتبار سے انسان کا بنایا ہوا کوئی نظام ترسیل اس کی گرد کو بھی نہیں پہنچ سکتا۔ میں آپ سے ایک سادہ سوال کرتا ہوں، کیا دنیا میں کوئی انسانی نظام ایسا موجود ہے جو اتفاق یا حادثہ کی پیداوار ہو اور اس میں انسانی ذہن کا دخل نہ ہو؟ اگر جواب نفی میں ہے اور یقیناً ہوگا تو ہم کس منطق سے یہ دعویٰ کر سکتے ہیں کہ ہمارا لاجواب نظام انہضام بغیر کسی خالق کے خود بخود معرض وجود میں آگیا؟

قلب انسانی اور خواب

یہ عام مشاہدہ کی بات ہے کہ بعض اوقات انسان پر مستقبل کے واقعات خواب میں یا الہاماً یا کشفاً منکشف ہو جاتے ہیں۔ قلب انسانی پر غیب سے واقعات آئندہ کا پرتو پڑتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کا عالم الغیب ہونا، ماضی و مستقبل کی غیب کی باتوں کو انسانی قلب پر بذریعہ کشف الہام۔ وحی منکشف کرنا ہی ایسے واقعات کی تشریح اور توجیہہ کر سکتا ہے۔ اگر کوئی شخص نعوذ باللہ خداوند تعالیٰ کو نہیں مانتا اور صرف گونگے بہرے بے شعور مادہ کو ہی حقیقت سمجھتا ہے تو وہ ایسے واقعات آئندہ کے انکشاف کی وجہ بیان کرتے ہوئے آئیں بائیں شائیں کے سوا اور کیا کہہ سکتا ہے۔

دہریت کے نتائج

دہریہ خدا، روح، آخرت اور ابدی اقدار حیات مثلاً سچائی

انصاف ۔ پاکیزگی، عصمت، عفت کا انکار کرتا ہے ۔ اس کے لئے ملک کا قانون ہی مشعل راہ ہے ۔ اگر ملک کا قانون اس کو بدکاری ۔ شراب، جوا کی اجازت دیتا ہے ۔ اگر ملک کا قانون اس کو سکھاتا ہے کہ گورا انسان کالے سے پیدائشی طور پر فوقیت رکھتا ہے تو وہ ان سب باتوں کو جائز اور درست سمجھتا ہوا ان پر عمل کرتا ہے ۔ مَیں نے ایک دفعہ غالباً ۱۹۴۱ء میں ایک دہریہ سے سوال کیا کہ تم سگی بہن سے شادی کیوں نہیں کر لیتے ۔ وہ جواب میں کہنے لگا ۔ اس میں کیا ہرج ہے ۔ درحقیقت دہریت اور لا مذہبیت انسان کو انسانیت سے خارج کر کے حیوانوں کی صف میں لا کھڑا کرتی ہے ۔ حیوان کی زندگی کا مقصد صرف حیوانی جبلّتوں کی تسکین ہے اور دہریہ کی زندگی کا مقصد بھی کھانا پینا، شادی کرنا اور دیگر حیوانی میلانات کی تسکین کرنا ہے ۔ دہریت ان تمام اعلیٰ اقدارِ حیات کی نفی کرتی ہے ۔ جن کے لئے دنیا کے جلیل القدر پیغمبران علیہم السلام اور اولیاء اللہ نے بڑی بڑی قربانیاں دیں ۔ ناقابل بیان اذیتیں سہیں اور بے انتہا تکلیفیں برداشت کیں ۔

نیند مسلسل محنت کرنے کے بعد انسان تھک کر چور ہو جاتا ہے ۔ اس کا جسم آرام مانگتا ہے ۔ جسم کو ازسرِنو تروتازہ کرنے کے لئے نیند ضروری ہے ۔ انسانی جسم کا اندرونی مطالبہ ہے اس انسانی ضرورت کو پورا کرنے کے لئے رات پیدا کی گئی ۔ انسان کی طبعی ضرورت نیند اور اس ضرورت کی تسکین کے لئے کائناتی نظام میں رات کا پیدا کیا جانا، صاف ظاہر کرتا ہے کہ دونوں کے پیدا کرنے والا ایک ہے اور وہ قادرِ مطلق خدا ہے ۔

حیاتِ اوّل دنیا میں پہلی زندگی کیسے پیدا ہوئی ؟ بے جان بے شعور مادہ ۔ گونگا

بہرا مادہ کس طرح یک لخت زندہ ہوگیا۔ تمام سائنس دان اس بات پر متفق ہیں کہ نہ ہی ماحول خواہ وہ کیسا ہی موافق ہو اور نہ ہی کیمیائی اور طبعی کیفیتوں کا اتفاقی امتزاج اس قابل ہے کہ بے جان۔ بے شعور مادہ سے زندگی کی تخلیق کر سکے۔ مخلوقات عالم میں سے سادہ ترین زندہ مخلوق ایمی باجو صرف ایک ہی خلیے پر مشتمل ہے کی ترکیب پر نگاہ کیجئے یہ نیو یارک شہر سے زیادہ پیچیدہ کروڑوں منظم جوہری ذرات سے مرتب شدہ یہ خوردبینی مخلوق قدو قامت میں ایک انچ کے سویں حصہ کو بھی نہیں پہنچتی۔ اسے بھوک بھی لگتی ہے۔ یہ اپنی غذا بھی تلاش کرتی ہے۔ اپنی بقار کے لئے ہر ممکن کوشش کرتی ہے۔

سوال پیدا ہوتا ہے کہ کسی خالق کی تخلیق کے بغیر یہ بے جان مادہ کس طرح زندہ ہوگیا۔ یہ سوال ہزاروں دفعہ دریافت کیا ہے لیکن اس کا کوئی تسلی بخش جواب سائنس کی طرف سے آج تک نہیں ملا۔ بعض سائنسدان یہ نظریہ پیش کرتے ہیں کہ پہلی زندگی ایک جرثومہ کی شکل میں کسی سیارہ سے زمین پر منتقل ہوئی۔ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اس سیارہ میں پہلی زندگی کیسے نمودار ہوئی؟

کرۂ ارض پر انسانی زندگی برقرار رکھنے کیلئے حیرت انگیز انتظامات

آپ نے اپنی جسم کی حیرت انگیز مشینری پر غور کر لیا۔ آئیے اب ذرا گردو پیش پر نظر ڈالیں اور ان عجیب و غریب انتظامات پر غور کریں جو انسانی زندگی کو قائم رکھنے کیلئے کئے گئے ہیں۔

۱۔ **محوری جھکاؤ**۔ ہماری زمین ایک گولے کی شکل میں خلاء میں معلق ہے یہ گولہ ۲۳½ درجہ کے زاویہ پر ایک طرف کو جھکا ہوا ہے۔ اگر یہ جھکاؤ نہ ہوتا تو کرۂ ارض

پر زندگی ناممکن ہوتی۔!

اگر یہ جھکاؤ نہ ہوتا اور کرۂ ارض بجائے ترچھا ہونے کے عموداً ہوتا تو زمین کے دونوں قطبوں پر ایک دوامی شفق چھائی رہتی۔ آبی بخارات سمندروں سے اڑ اڑ کر شمال اور جنوب کی طرف بڑھتے اور برف کے براعظم بناتے جاتے۔ نتیجہ یہ ہوتا کہ اس برفستان اور خط استوا کا درمیانی علاقہ صحرا ہوتا۔ برف کے پہاڑوں کا بارِ عظیم دونوں قطبوں کو اس قدر دبا دیتا کہ زمین درمیان سے ابھر کر پھٹ جاتی اور خط استوا ایک ڈراؤنی خندق کی صورت میں اس کے گرد پھیل جاتا کرۂ ارض میں محوری جھکاؤ کس نے پیدا کیا؟

۲۔ چاند کا زمین سے فاصلہ: چاند ہم سے دو لاکھ چالیس ہزار میل دور ہے اور اس کی کشش ہر روز سمندروں میں مد و جزر پیدا کرتی ہے۔ یہ فاصلہ انتہائی موزوں ہے اگر چاند ہم سے صرف پچاس ہزار میل دور ہوتا تو اس کرۂ ارض پر قیامت برپا ہو جاتی دن میں دو بار ہمارے سمندروں سے پہاڑوں جیسی لہریں اٹھتیں اور تمام دنیا میں پھیل جاتیں۔ ہوائیں ہر وقت شدید قسم کے طوفان برپا رکھتے۔ ان حالات میں اس کرہ پر کسی جاندار کا زندہ رہنا کیونکر ممکن ہوتا۔ زمین اور چاند کے درمیان یہ موزوں فاصلہ کس نے رکھا؟

۳۔ زمین کی روزانہ گردش: زمین کی روزانہ گردش کی رفتار تقریباً ایک ہزار میل فی گھنٹہ ہے۔ اگر زمین کی رفتار موجودہ رفتار سے دس گنا زیادہ ہوتی تو زمین اپنے محور کے گرد تقریباً ۲½ گھنٹوں میں گھوم جاتی اور سوا گھنٹے کا دن اور سوا گھنٹے کی رات ہوتی دنیا کے کاروبار کس طرح چلتے؟ اس کے برعکس اگر زمین کی رفتار موجودہ رفتار کا صرف دسواں حصہ ہوتی تو زمین اپنے محور کے گرد ۲۴۰ گھنٹوں میں گھومتی تو قریب قریب ۱۲۰

گھنٹے کا طویل دن اور قریب قریب اتنی ہی طویل رات ہوتی ۔ گرمیوں کے موسم میں ۱۲۰ گھنٹے کا طویل دن ہمیں جھلس دیتا اور سردیوں میں ۱۲۰ گھنٹے کی طویل رات ہمیں منجمد کر دیتی ۔ آپ ہی بتایئے ان حالات میں فصلیں کس طرح پروان چڑھتیں انسان کس طرح زندہ رہ سکتا ؟

زمین کی موجودہ مناسب رفتار کس نے قائم کی ؟

۴ ۔ زمین کا حجم :- زمین کے حجم پر غور کیجئے اگر زمین کا حجم چاند جتنا چھوٹا ہوتا تو اس کی کشش ثقل موجودہ کشش ثقل کا ۱/۶ ہوتی ۔ ہوا اور پانی موجود نہ ہوتے ۔ اس میں درجہ حرارت چڑھتا تو انتہائی طور پر اور اگر گرتا تو انتہائی طور پر ۔ اس کے برعکس اگر زمین کا قطر موجودہ قطر کی نسبت دگنا ہوتا اس کی سطح موجودہ سطح کے مقابلہ میں چار گنا زیادہ وسیع ہوتی ۔ کشش ثقل دگنی ہوتی ۔ ہوا کے غلاف کا حجم خطرناک حد تک گھٹ جاتا ۔ اس کے دباؤ میں فی مربع انچ ۱۵ تا ۳۰ پونڈ کا اضافہ ہوتا ۔ جس کا ردعمل زندگی پر نہایت مہلک ہوتا ۔ زمین کا موجودہ مناسب حجم کس نے مقرر کیا ؟

۵ ۔ زمین کا سورج سے فاصلہ :- ذرا غور کیجئے اگر زمین کا سورج سے فاصلہ موجودہ فاصلے کی بجائے دگنا ہوتا تو زندگی منجمد ہو کر رہ جاتی اور اگر زمین اور سورج کا درمیانی فاصلہ موجودہ فاصلے کی نسبت نصف ہوتا تو سورج سے حاصل ہونے والی حرارت چار گنا ہوتی اور کرۂ زمین پر تپش اس قدر بڑھ جاتی کہ اس میں زندگی کا برقرار رہنا ناممکن ہوتا ۔

۶ ۔ فضا :- کرۂ ارض کی فضا میں ایسی گیسیں جو بقائے حیات کے لئے ضروری ہیں تقریباً ۵۰۰ میل کی بلندی تک محیط ہیں ۔ ان کا یہ نہایت موٹا غلاف ہمیں

ان شہابوں کی تباہ کن بارش سے محفوظ رکھتا جو روزانہ دو کروڑ کی تعداد میں تیس میل فی سیکنڈ کی رفتار سے کرۂ ارض کی فضا میں داخل ہوتے ہیں۔ حفاظت کا یہ انتظام کس نے کیا؟

۷۔ **بارش:۔** غور کیجئے سمندروں کا لاکھوں ٹن نمکین پانی کس طرح سورج کی گرمی سے بخارات بن کر اور نمکیاتی مادوں سے پاک وصاف ہو کر ہواؤں کے کندھوں پر سوار ہزاروں میل دور بنجر اور خشک زمینوں کو سیراب کرتا ہے۔ بارش کا پانی فصلوں کے لئے دریاؤں، نہروں، کنوؤں کے پانی سے زیادہ مفید ہے۔ کیونکہ اس میں فضا سے کارآمد گیسیں شامل ہو جاتی ہیں۔ بارش کا یہی پانی پھر سورج کی گرمی سے بخارات بنتا ہے اور بارش کی شکل میں زمین پر برستا ہے۔ یہ آبی چکر مسلسل جاری ہے۔ اس کے بغیر ہم زندہ نہیں رہ سکتے۔ اس آبی چکر کا انتظام کس نے کیا؟

۸۔ **پانی:۔** پانی میں کئی انوکھی خصوصیات ہیں جو انسان کو یہ ماننے پر مجبور کرتی ہیں کہ پانی نہ صرف کسی بڑے حکیم دانا کی تخلیق ہے۔ بلکہ وہ خالق اپنی مخلوق پر بڑا مہربان اور اس کا بڑا خیر خواہ ہے۔ تمام مائعات جمنے کے وقت کثیف اور بھاری ہو جاتے ہیں لیکن پانی اور صرف پانی میں یہ انوکھی خصوصیت ہے کہ وہ جمنے پر ہلکا ہو جاتا ہے۔ یہ چیز بقائے حیات کے لئے زبردست اہمیت کی حامل ہے۔ اسی کے سبب برف دریاؤں، سمندروں اور جھیلوں کی سطح پر تیرتی رہتی ہے۔ بصورت دیگر برف دریاؤں، سمندروں اور جھیلوں کی تہہ میں بیٹھ جاتی اور تمام دریا، سمندر جھیلیں ٹھوس اور منجمد ہو جاتے اور موسم گرما میں اوپر کی برفانی سطح کا کچھ حصہ پگھل جایا کرتا اور باقی پانی ہمیشہ ہمیشہ کے لئے ٹھوس برف کی شکل اختیار

کئے رکھتا اور تمام آبی جانور مر جاتے ۔

اب صورت حال یہ ہے کہ پانی جمتے ہی ہلکا ہو جاتا ہے اور برف پانی کی سطح پر ایک ایسی حاجب تہ بناتی ہے ۔ جس کے نیچے مچھلیاں زندہ رہتی ہیں ۔ پانی کی دوسری صفت جو اس کو باقی مائعات سے متمیز کرتی ہے ۔ یہ ہے کہ اس میں تمام مائعات سے زیادہ چیزوں کو حل کرنے اور گلانے کی صلاحیت ہے اور اس بنا پر ہمارے خون کا ایک اہم جز بن کر ہماری جسمانی زندگی کی نشوونما میں بہت بڑا حصّہ لیتا ہے ۔

پانی کی یہ عجیب و غریب خصوصیات کس نے پیدا کیں ؟

۹ ۔ نظامِ شمسی : ۔ ہمارا نظامِ شمسی ایک محیر العقول نظام ہے ۔ جس میں سب سیارے اپنے اپنے مقررہ مدار میں ایک سیکنڈ کے لاکھویں حصے کی درستگی کے ساتھ اپنی اپنی مقررہ رفتار پر گردش کرتے ہیں اور کوئی تصادم نہیں اور کوئی افراتفری نہیں ۔ یہ ایک عجیب بات ہے کہ انسان کے بنائے ہوئے معمولی مصنوعی سیارچہ کے لئے تو ہم باور کرتے ہیں کہ اس کو زمین کے گرد مدار میں گھمانے کے لئے ذہن ، عقل ، منصوبہ کی ضرورت ہے ۔ لیکن کائنات کے اربوں نظامہائے شمسی کے متعلق ہم میں سے بہت سے بلا سوچے سمجھے اندھا دھند دعویٰ کر دیتے ہیں کہ یہ تمام نظام بغیر کسی ناظم اعلیٰ اور خالق حقیقی کے خود بخود پیدا ہو گئے اور ایک عجیب و غریب کائناتی نظام میں منسلک ہو گئے ۔ کہتے ہیں نیوٹن نے کسی لوہار سے نظامِ شمسی کا ایک چھوٹا سا نمونہ بنوایا جو اس کے کمرے میں ایک میز پر رکھا رہتا تھا ۔ نمونہ کچھ اس طریقے سے بنایا گیا تھا کہ ایک پیچ کے گھمانے سے سب سیارے مشتری ، زہرہ ، زحل ، عطارد وغیرہ وغیرہ اپنے اپنے مدار میں حرکت کرنے لگ جاتے زمین کے گرد چاند اور سورج کے گرد زمین گھومنے لگ جاتی ایک دن نیوٹن کا ایک

دہریہ دوست اس سے ملنے آیا۔ میز پر رکھے ہوئے نمونہ کو دیکھ کر وہ فوراً سمجھ گیا کہ نظام شمسی کا نمونہ ہے۔

اس نے نیوٹن سے دریافت کیا، یہ نمونہ کس نے بنایا ہے؟

نیوٹن، اس کو کسی نے نہیں بنایا بلکہ خود بخود بن گیا۔

دہریہ، اجی! آپ مذاق کیوں کرتے ہیں۔ تبلایئے یہ نمونہ کس نے بنایا!

نیوٹن، مَیں نے جو عرض کیا۔ اس کے بنانے والا کوئی نہیں۔ یہ خود بخود بن گیا۔

دہریہ: اجی! مذاق چھوڑیئے۔ جلد بتایئے یہ نمونہ کس کاریگر نے بنایا ہے؟

دوست کے بار بار اصرار پر نیوٹن نے بالآخر جواب دیا۔

"حیرت ہے کہ آپ اس بات کو تو بلا چون وچرا تسلیم کرتے ہیں کہ نظام شمسی کا یہ حقیر اور معمولی سا نمونہ بغیر کسی بنانے والے کے نہیں بن سکتا۔ لیکن اس چھوٹے نمونہ کی عظیم اصل کے متعلق یہ عقیدہ رکھتے ہیں کہ وہ خود بخود بغیر کسی بنانے والے کے بن گیا!"

یہ کیا الوالعجبی ہے؟ یہ جواب سن کر دہریہ لاجواب اور ہکا بکا رہ گیا۔

مندرجہ بالا دلائل ثابت کرتے ہیں کہ یہ کائنات ایک ایسے حاکم وحکیم کی حکمت کا کرشمہ ہے جو ماورائے ادراک ہے۔ اس کائنات میں ہر جگہ نظم اور حکمت نظر آتی ہے۔ چاہے انسان افلاک کی وسعتوں کا جائزہ لے اور چاہے زمین کی گہرائیوں میں اتر کر دیکھے ہر جگہ یہ حقیقت نظر آئے گی۔ اس کائنات کے تمام مظاہر اور اس کائنات میں ہر جگہ نظم اور حکمت دیکھ کر ناظم اعلیٰ اور حکیم مطلق کی ہستی کا انکار کرنا اتنا ہی بعید از عقل ہے ہے۔ جتنا کہ ایک لہلہاتے کھیت دیکھنے کے بعد اصرار کرنا کہ اس کھیت میں مختلف فصلوں کی انتہائی سائنٹفک طریقہ سے کی گئی کاشت کھیت کی چوطرفہ مناسب قد

میں کٹی ہوئی کانٹے دار پودوں کی باڑ آب پاشی کی پختہ نالیاں۔ صاف ستھری چوڑی کی سڑکیں اور روشیں کسی ذہین محنتی کاشتکار کے ذہن محنت توجہ اور منصوبہ بندی کا نتیجہ نہیں بلکہ یہ سب کچھ اتفاقاً خود بخود کسی زلزلے۔ آندھی مسلسل بارش وغیرہ سے رونما ہوگیا! یہ تو ایسا ہی ہے۔ جیسے کوئی دعویٰ کرے کہ زمین پر پانی کا گلاس گرانے سے زمین پر دنیا کا نقشہ بن جاتا ہے۔ جس پر تمام سمندر۔ بحیرے۔ آبنائیں۔ خلیجیں ممالک۔ مجمع الجزائر انتہائی درستگی کے ساتھ واضح اور نمایاں ہوجاتے ہیں!

آپ خود ہی اندازہ لگالیں۔ کیا یہ دعویٰ عقل سلیم کے نزدیک قابل تسلیم ہے یا اسے کسی پاگل کا مضحکہ خیز جنون ہی کہنا پڑے گا۔

سوچنے کی بات

زمینی گاڑیاں:۔ حکومت ریل گاڑیوں کو ٹائم ٹیبل کے مطابق چلانے کے لئے کثیر تعداد میں اسٹیشن ماسٹر۔ گارڈ کنٹرولر تکنیکی ماہرین وغیرہ وغیرہ ملازم رکھتی ہے۔ پھر بھی گاڑیاں لیٹ ہوتی ہیں۔ پٹڑی سے اترتی ہیں۔ تصادم اور ٹکراؤ ہوتے ہیں۔ جانی مالی نقصان ہوتا ہے۔ ہزار تدبیر کریں پھر بھی حادثات ہوتے رہتے ہیں۔

آسمانی گاڑیاں:۔ زمینی گاڑیاں زمین پر چلتی ہیں۔ انسان ان کو چلاتے ہیں۔ یہ گاڑیاں لیٹ ہوتی ہیں۔ تصادم ہوتے ہیں۔ لیکن کائنات میں ایسی بے پہیہ گاڑیاں ہیں جو حد اور شمار سے باہر ہیں یہ لاتعداد گاڑیاں بلا انسانی ڈرائیور، گارڈ، پائلٹ یا نیوی گیٹر کے ایک سیکنڈ کے لاکھوں حصّہ کی درستگی کے ساتھ خلار میں چل رہی ہیں۔ یہ کبھی لیٹ نہیں ہوتیں۔ اور ان کا کبھی تصادم نہیں ہوتا۔ علمائے فلکیات کے اندازے کے مطابق کائنات کے پچاس کروڑ کہکشاؤں کے ہر کہکشاں

کے دس ہزار کروڑ ستاروں میں سے ہر ستارہ کوئی آٹھ میل فی سیکنڈ کوئی ۸۴ میل فی سیکنڈ کی رفتار سے حیرت انگیز تنظیم اور ایک سیکنڈ کے لاکھویں حصہ تک کی باقاعدگی کے ساتھ اپنے اپنے مقررہ راستے پر بھاگ رہا ہے۔ ہمارے نظام شمسی میں نو سیارے اپنے اکتیس[۱۱] چاندوں، تیس ہزار چھوٹے سیاروں، ہزاروں دمدار ستاروں کے ساتھ زمین سے بارہ لاکھ گنا سورج کے گرد گھوم رہے ہیں اور سورج خود بھی اپنے تمام سیاروں سیارچوں سمیت ایک عظیم کہکشانی نظام کے اندر بھاگ رہا ہے۔ یہ باقاعدگی۔ انتہائی درستگی۔ حیرت انگیز ضبط نظم تنظیم دیکھ کر اعتراف کرنا پڑتا ہے کہ یہ نظام کسی عظیم۔ بے عیب بہمہ وجوہ کامل۔ قادر مطلق۔ حکیم مطلق واجب الوجود کا بنایا ہوا ہے اور وہی اپنی بے حساب قدرت و حکمت کاملہ سے اس کو چالو رکھے ہوئے ہے۔ کیا کائنات میں نظم۔ حکمت۔ ترتیب اس بات کی متقاضی نہیں کہ ہم ناظم اعلیٰ حکیم مطلق مرتب بے مثال قادر مطلق خدا کے وجود کو تسلیم کریں۔ پھر بھی اگر کوئی شخص خالق کائنات کے وجود کا انکار محض اس بنا پر کرے کہ خدا تعالیٰ اس کو نظر نہیں آتے اور اگر اُسے خدا تعالیٰ کی ہستی کو دکھا دیا جائے تو وہ خدا تعالیٰ پر ایمان لے آئے گا تو اس سے چند سوالات دریافت کروں گا۔

دہریوں سے چند سوالات

(۱) آپ مجھے تشریح الابدان کی لیبارٹری میں انسانی دماغ ایک گوشت کے لوتھڑے کی شکل میں تو دکھا سکتے ہیں لیکن کیا آپ مجھے اس کی صلاحیتیں۔ جبلتیں۔ ذہانت قوت حافظہ۔ عقل۔ فہم وغیرہ بھی دکھا سکتے ہیں؟ فرض کیجئے آپ کو کوئی مشکل

پیش آتی ہے ۔ آپ ذرا سوچتے ہیں اور اس مشکل کو حل کر لیتے ہیں اور دعویٰ کرتے ہیں کہ میں نے اپنی عقل سے اس مشکل پر قابو پا لیا ۔ سوال یہ ہے کیا آپ عقل کو مجھے دکھا سکتے ہیں ؟ کیا عقل کو میں دیکھ سکتا ہوں ۔ سن سکتا ہوں ۔ سونگھ سکتا ہوں ۔ چھو سکتا ہوں چکھ سکتا ہوں ۔ اگر نہیں اور یقیناً نہیں تو آپ کونسی منطق اور کونسی دلیل سے مجھ سے مطالبہ کرتے ہیں اور شرط پیش کرتے ہیں کہ خدا تعالیٰ پر ایمان لانے کے لیے آنکھ سے دیکھنا شرط ہے ۔ آپ عقل ذہانت اور حافظہ کے کرشمے دیکھ کر ان کے وجود کو مان لیتے ہیں ۔ سوال پیدا ہوتا ہے کہ خدا تعالیٰ کی حیرت انگیز صناعی اور آفاق و انفس میں خدا تعالیٰ کی آیات (نشانیاں) دیکھ کر آپ خدا تعالیٰ پر ایمان کیوں نہیں لے آتے ؟

(۲) آپ نے اپنے دادا کے دادا کو نہیں دیکھا ۔ لیکن انہیں نہ دیکھنے کے باوجود آپ کو یقین ہے کہ وہ کسی وقت دنیا میں موجود تھے ۔ آپ کا یہ یقین آنکھوں دیکھا یقین تو نہیں ہے تو کیا پھر آپ تسلیم کرتے ہیں کہ حواس خمسہ کے بغیر یقین کے اور ذرائع بھی ہیں اور ان میں سے سب سے بڑا ذریعہ سچی شہادت ہے ۔

اس دنیا میں ہزارہا اشخاص ایسے گزرے ہیں جن کی صداقت، پاکیزگی، خلوص اور دیانتداری پر ان کے مخالفین بھی شک نہیں کرتے ۔ ان تمام حضرات نے نہایت زور سے پیہم مسلسل دنیا کو پیغام دیا ہے کہ خدا موجود ہے ۔ وہ خدا سے ہم کلام ہوئے ہیں اور خدا نے ان کو دنیا میں زندگی بسر کرنے کا طریقہ بتایا ہے ۔ موت کے بعد ابدی زندگی ہے ۔ اس ابدی زندگی میں راحت اس کو ملے گی جو ان حضرات کی شہادت پر ایمان لائے گا ۔ اور ان کے بتائے ہوئے خدائی پیغام کے مطابق اپنی زندگی بسر کرے گا ۔ اگر سچی شہادت آپ کے نزدیک قابل قبول اور باعث یقین ہے تو آپ ان اکابر کی شہادت

پر یقین کیوں نہیں لاتے اور ان کے دہریہ مخالفین فرعون، ہامان، قارون، نمرود، ابوجہل وغیرہ جو مسلمہ طور پر خود غرض، حریص، بدکار، ظالم، فاسق، فاجر تھے۔ کیوں ایمان لے آئے ہیں اور انکی صف میں شامل ہونا کیوں پسند کرتے ہیں۔

اول الذکر طبقہ ہمیشہ ظلم سہتا رہا ہے۔ سختیاں برداشت کرتا رہا ہے۔ ہر قسم کی قربانیاں دیتا رہا ہے۔ یہ بے غرض، بے نفس طبقہ زہد، قناعت، صبر۔ انصاف۔ دیانت۔ سچائی کا حامل یہ طبقہ آپ کے نزدیک کیوں قابل قبول نہیں اور مؤخر الذکر غاصب ظالم طبقہ آپ کے نزدیک کیوں قابل احترام ہے؟

(۳) ضد اور تعصب کا تو کوئی علاج نہیں۔ اگر تعصب اور ہٹ دھرمی کی عینک اتار کر دیکھیں اور انصاف کریں تو کیا آپ انکار کر سکتے ہیں کہ ایک اُمّی محض جو اُمیّوں کی گود میں پلا۔ بت پرست۔ شراب خور۔ سُود خور۔ قمار باز۔ فحاش۔ دختر کش۔ مردار خور۔ متکبر۔ کینہ پرور۔ بداخلاق علوم و فنون و تہذیب و تمدن سے عاری لوگوں میں پل کر جوان ہوا۔ جس نے گذشتہ صحف انبیاکرام علیہم الصلوات والتسلیمات کسی سے نہیں پڑھے۔ جس نے عقائد صحیحہ۔ اصول قانون۔ مبادی اخلاق محاسن علم و عمل کی تعلیم ظاہری کسی مدرسہ میں حاصل نہیں کی اور اپنی زندگی کے چالیس برس اسی ظلمت و تاریکی کے ماحول میں پورے کئے۔ دفعتاً غار حرا سے نکلا اور دنیا کو ایسا کلام پیش کیا جو تمام بنی نوع انسان کے لیے عالمی قانون۔ اخلاق و موعظت۔ اسرار ایمان و عمل۔ مکمل ضابطہ حیات و مشعل ہدایت۔ تمام گذشتہ کتب الٰہیہ کی مجموعی صفات کا حامل۔ استدلال و دعوت فکر سے پُر۔ اظہار غیب و پیش گوئیوں سے لبریز۔ مخاطبات قلبی و دعاؤں کا گنجینہ فصاحت و بلاغت کا معجزانہ کمال۔ انسانی اخوت۔ آزادی و مساوات کا علمبردار ہے۔ سوال یہ ہے کہ معاشرتی علوم کا مسلمہ اصول ہے کہ انسانی ذہن فکر۔ خیال ـــــ اس کی تہذیب۔ اس کے عقائد۔ اس کا تمدن۔ اس کے

ماحول کی پیداوار ہیں۔ عرب کے اس وقت کے ماحول میں بلکہ تمام دنیا میں اس وقت بت پرست۔ ستارہ پرست۔ آتش پرست۔ تثلیث پرست عیسائی حضرت عزیز کو ابن اللہ کہنے والے اور حضرت ابراہیم علیہ السلام اور ان کے مینڈھے کا بت خانہ کعبہ میں رکھ کر پوجنے والے یہودی اور قدرتی مناظر پرست آباد تھے۔ پھر یہ ماحول سے باغی ماحول کی کامل مکمل تردید کا حامل کلام کہاں سے آگیا؟ اگر آپ کہیں کہ یہ کلام کسی آدمی نے آپؐ کو سکھا دیا تو سوال پیدا ہوتا ہے کہ وہ مفروضہ آدمی کس مذہب کا پیرو تھا؟ اگر وہ عیسائی تھا تو اس نے عیسائی عقیدہ تثلیث۔ کفارہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے صلیب پر جان دینے کی کیوں تردید کی؟ اگر یہودی تھا تو اس نے مروّجہ یہودیت کی کیوں تردید کی؟ اگر وہ مناظر پرست۔ ستارہ پرست۔ آتش پرست مجوسی تھا تو اس نے مناظر پرستی۔ ستارہ پرستی۔ آتش پرستی۔ مجوسیت کی کیونکر تردید کی؟ صحیح جواب اس کے سوا ہو ہی نہیں سکتا کہ یہ انسانی کلام نہیں۔ خدا موجود ہے اور یہ صرف خدا تعالیٰ ہی کے لئے ممکن ہے کہ وہ تمام دنیا کے مروّجہ مذاہب باطلہ کی تردید اور سچے مذہب اسلام کی تعلیم و تلقین کرے۔ اس قادر مطلق معلم حقیقی نے اس کام کے لئے ایک اُمّی محض کو چنا۔ تاکہ تمام دنیا پر روز روشن کی طرح ثابت ہو جائے کہ یہ کلام انسانی کلام نہیں بلکہ اللہ تعالیٰ کا کلام ہے اور اس کلام کے انسانی کلام نہ ہونے اور اس کلام کے اللہ تعالیٰ کا کلام ہونے کے مزید ثبوت کے لئے اسی کلام میں یہ معجزانہ دعویٰ موجود ہے کہ جب تک دنیا قائم ہے۔ یہ کلام بھی محفوظ ہے اور جب تک دنیا قائم ہے۔ اس وقت تک کوئی شخص قرآن پاک جیسی ایک سورت بھی نہیں بنا سکتا۔

اہل عرب کفار نے مسلمانوں سے جنگیں کیں۔ خود بھی مرے مسلمانوں کو بھی شہید کیا۔ وہ قرآن پاک کے مقابلے میں ایک سورت بنا کر مسلمانوں کے اس دعویٰ کو

جھٹلا سکتے تھے ۔ آخر اپنی قوم کے اندر اتنے فصیح و بلیغ ادیب رکھتے ہوتے انہوں نے یہ آسان راستہ کیوں نہ اختیار کیا ؟ اور اتنی جنگوں میں اپنے عزیز و اقارب کیوں مروائے ؟

عربوں نے ایسا کیوں نہ کیا اور مخالفین و منکرین اسلام اب بھی ایسا کیوں نہیں کر لیتے ؟ نام نہاد مستشرقین یورپ سب مل کر ایک سورت قرآن پاک کے مقابلے میں بنا کر دنیا کے سامنے کیوں نہیں پیش کر دیتے اور قرآن پاک کے اس چیلنج کو کیوں قبول نہیں کر لیتے ؟ کیا ان کا ایسا نہ کرنا اور نہ کر سکنا اس بات کا ناقابل تردید ثبوت نہیں کہ یہ کلام انسانی کلام نہیں بلکہ مافوق الادراک انسانی فہم کی رسائی سے بالا قادر مطلق کا کلام ہے ۔ جس کی نظیر نہ کوئی بنا سکا نہ بنا سکے گا ۔

(۴) میرا چوتھا اور آخری سوال یہ ہے کہ ٹیلی وژن ۔ ریڈیو ۔ ہوائی جہاز وغیرہ وغیرہ ایجادات کو آج سے ایک صدی پہلے ناممکن خیال کیا جاتا تھا ۔ لیکن اب امر واقعہ ہیں ۔ پس ثابت ہوا کہ واقعات پر یقین کے لئے اصل بنیاد ممکن اور ناممکن کی بحث نہیں بلکہ بنیاد یہ ہے کہ واقعات کے وقوع پذیر ہونے کی روایت صحیح ہے یا نہیں ؟ معجزہ خرق عادت اور قاعدہ علت معلول کی استثنائی شکست کا نام ہے اور اسکا ثبوت سچی ناقابل انکار شہادت ہے ۔ امکان اور عدم امکان کی بحث غیر ضروری اور لاحاصل ہے ۔

سوال یہ ہے کہ صحابہ عظام کی راستی ۔ دیانتداری ۔ صدق مقال ۔ اعلیٰ اخلاقی زندگی پر تمام دنیا کا اتفاق ہے ان کے مخالفین بھی ان کی راستبازی کے معترف ہیں ۔ ان حضرات نے مسلسل متواتر نہایت وثوق سے چشم دید سید المرسلین صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے صادر ہوئے معجزات روایت کئے ہیں ۔ مثلاً شق القمر عظیم الشان پیش گوئیاں ۔ غلبہ روم کی پیش گوئی ۔ فتوحات عظیم کی اطلاع ۔ قیصر و کسریٰ کی

بربادی کی خبر۔ فتح یمن۔ فتح شام۔ فتح عراق وغیرہ وغیرہ (تفصیل کے لیے دیکھئے سیرت النبی صلی اللہ علیہ والہ وسلم۔ جلد سوم صفحہ ۶۸۸ تا ۷۱۹) تھوڑے سے کھانے میں حیرت انگیز برکت وعظیم اضافہ کے محیر العقول معجزات۔ ستون کا رونا۔ منبر کا ہلنا۔ چٹان کا پارہ پارہ ہونا۔ درختوں اور پہاڑوں سے سلام کی آواز۔ درختوں کا زمین پھاڑتے ہوئے چلنا۔ بے دودھ بکری کا دودھ دینا۔ جانور کا سجدہ کرنا مشکیزہ سے پانی اُبلنا۔ انگلیوں سے پانی جاری ہونا۔ قحط کا دُور ہونا۔ خشک سالی کا دُور ہونا۔ بارش ہونا۔ نقصان دہ شدید بارش کا بند ہونا وغیرہ وغیرہ۔ یہ تمام معجزات ہزاروں کی تعداد میں ہیں۔ ان کے چشم دید گواہ اتنے کثیر ہیں اوران کی راستبازی اتنی مسلّمہ ہے کہ منکرین اسلام کو بھی معجزات کے وقوع کو تسلیم کرنا پڑا ہے۔ لیکن وہ اپنی اسلام دشمنی کی تسکین یہ کہہ کر کر لیتے ہیں کہ یہ اتفاق تھا۔ مسمیرزم تھا۔ ہپناٹزم تھا وغیرہ وغیرہ۔ ایسا بودا جواب سوائے عقل سے عاری لوگوں کے اور کون دے سکتا ہے؟ اگر مسمیرزم اور ہپناٹزم سے کھانے میں برکت ہوسکتی ہے تو یہ حضرات پاکستان کی غذائی قلت کو اس طرح دور کیوں نہیں کر لیتے؟ اگر مسمیرزم اور ہپناٹزم سے شدید بارش اور سیلاب تھم سکتے ہیں تو وہ پاکستان کو آئے دن کی اس مصیبت سے کیوں نہیں بچا لیتے؟ سچ ہے جس کو اللہ چاہے ہدایت دے۔ جن دشمنان خدا نے نفس (انسان کے اندر کا کتا۔ چیتا۔ بھیڑیا۔ سوّر) اور شیطان کی اندھادھند تقلید سے اپنے دلوں کو سخت کرلیا اور اس پر مُہر لگالی وہ معجزات دیکھنے کے بعد بھی حق قبول نہیں کرتے۔ وہی معجزہ فرعون نے دیکھا۔ ایمان نہ لایا۔ وہی معجزہ جادوگروں نے دیکھا ایمان لے آئے۔ وہی معجزہ کفار عرب نے دیکھا وہ حضور صلی اللہ علیہ والہ وسلم کو کاہن اور جادوگر کہنے لگے۔ وہی معجزہ قلب سلیم والوں نے دیکھا اور ان کا ایمان اور پختہ ہوگیا۔ دنیا جائے عبرت ہے۔

دہریوں سے آخری اپیل

اگر خدا نخواستہ آپ کے دل و دماغ مادہ پرستی کی زہریلی فضاء سے اتنے متاثر ہو چکے ہیں کہ نہ ان پر دلیل اثر کرتی ہے اور نہ ہی بے لوث مخلص اکابر کی شہادت اور آپ خداوند تعالیٰ کو دیکھ کر ہی ایمان لانا چاہتے ہیں تو آئیے میں آپ کو خداوند تعالیٰ دکھادوں لیکن یاد رکھیئے خدائے عظیم و برتر کو دیکھنے کی اہلیت انسانی کمزور آنکھ میں نہیں۔ اس دنیا میں رویتِ الہٰی ممکن نہیں۔ لیکن کالرویت ضرور ہے۔ کالرّویت آنکھ کا نہیں دل کا کام ہے بصارت کا کام نہیں۔ قلبی بصیرت کا کام ہے۔ سائنٹسٹ نے خدا کو عقل و استدلال کی آنکھ سے دیکھا لیکن انبیاء کرام علیہم السلام اور اولیاء اللہ نے اللہ تعالیٰ کو دل کی آنکھ سے دیکھا سائنٹسٹ کا ایمان استدلالی تھا۔ لیکن انبیاء کرام علیہم السلام اور اولیاء اللہ کا ایمان کشفی وجدانی ذوقی تھا۔ استدلالی ایمان کی مثال ایسے ہے جیسے کوئی شخص طب کی کتاب میں بخار کا باب پڑھ کر علم اور یقین حاصل کرے کہ بخار ایسا مرض ہے جس میں بدن گرم ہو جاتا ہے۔ اعضاء ٹوٹنے لگتے ہیں۔ سر میں شدید درد ہوتا ہے۔ کشفی وجدانی ذوقی ایمان کی مثال ایسے ہے جیسے کسی شخص کو خود بخود بخار چڑھ جائے اور اس کو بلا واسطہ اپنے تجربہ سے پتہ چل جائے کہ بخار ایسا مرض ہے جس میں بدن گرم ہو جاتا ہے۔ اعضاء ٹوٹنے لگتے ہیں اور سر میں شدت کا درد ہوتا ہے۔ یہ ایمان اصلی ایمان ہے۔ یہ یقین اصلی یقین ہے۔ یہ علم ہی اصل علم ہے۔ جو انسان نہ بھولتا ہے نہ بھول سکتا ہے۔ کیونکہ یہ علم اس پر خود وارد ہو چکا ہے اور وہ اس کیفیت میں سے خود گزر چکا ہے۔ یہ ایمان وہ ایمان ہے۔ جس کے حصول کے بعد انکار اور کفر کی گنجائش ہی نہیں۔ اس وجدانی کشفی ذوقی ایمان والا شخص اپنے آپ کو دائماً خدا تعالیٰ کے روبرو حاضر اور خدا تعالیٰ کی معیت میں پاتا ہے۔ اس کے دل کا ٹیلیفون جو تصفیہ قلب اور تزکیہ نفس سے قبل غیر اللہ کی محبت کی گرد سے اٹا پڑا تھا۔ اب صاف اور صیقل ہو کر

اللہ تعالیٰ کے دربار میں پیغام بھیجتا بھی ہے ۔ اور پیغام الہٰی وصول کرتا ہے ۔
لیکن اس زنگ آلود دل کے شیشے کو صیقل کیسے کریں ۔ اس کو صاف کرنیکا جو طریقہ خدا تعالیٰ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی معرفت دنیا کو بتایا ہے ۔ وہ یہ ہے کہ انسان صحیح عقیدہ ۔ اخلاص ۔ استقامت علی الشریعت اسلامیہ اخلاق عالیہ مثلاً توکل زہد ۔ صبر و شکر ۔ تحمل ۔ بردباری ۔ قناعت ۔ ایثار ۔ کثرت ذکر ۔ صحبت صالح ۔ اجتناب از معاصی و رذائل نفسی سے اپنے دل کو غیر اللہ سے ایسا پاک صاف کرے کہ دل میں غیر اللہ کا خیال بھی نہ آئے اور یاد الہٰی دل کا ایسا ملکہ بن جائے ۔ جیسے بصارت آنکھ کی صفت بن جاتی ہے اور باوجود کوشش کے انسان اس بات کو ناممکن پاتا ہے کہ آنکھ کھلی ہو اور نہ دیکھے ۔ اس طرح انسان اس بات کو ناممکن پاتا ہے کہ دل کسی وقت بھی خدا کی یاد سے غافل ہو ۔ خدا کی یاد دل کی صفت بن جاتی ہے ۔ چاہے آپ چاہیں یا نہ چاہیں دل ہر وقت مشاہدہ الہٰی میں مستغرق رہتا ہے ۔ استدلالی ایمان کشفی اور وجدانی میں تبدیل ہو جاتا ہے اور وہ ایمان نصیب ہو جاتا ہے جس کے بعد کفر کا وجود نہیں ۔ لیکن جیسے کہ میں عرض کر چکا ہوں اس قلبی مشاہدہ کے حصول کیلئے ابتدا میں کم از کم رسمی اور تقلیدی عام مسلمانوں جیسا ایمان ہونا ضروری ہے ۔ یہ رسمی تقلیدی ایمان اتباع سنت دین اسلام پر استقامت ۔ کثرتِ ذکر ۔ صحبت صالح ۔ اخلاق عالیہ اور گناہوں سے پرہیز ۔ کشفی وجدانی ذوقی ایمان میں تبدیل ہو جاتا ہے ۔ اگر خداوند تعالیٰ کو دیکھنا ہے تو پہلے یہ رسمی ایمان لے آئیں پھر مندرجہ بالا نسخہ پر عمل کریں ۔ انشاء اللہ تعالیٰ مشاہدہ الہٰی نصیب ہوگا ۔ اللہ تعالیٰ سے دائمی قلبی تعلق پیدا ہوگا ۔ دعائیں قبول ہونگی ۔ قبولیت کے الہام ہونگے ۔ مشکلات حل ہونگی ۔ ایک عجیب مطمئن پرسکون حیات طیبہ نصیب ہوگی آپ کو دعوت ہے کہ خود تجربہ کر دیکھیں ۔ اگر آپ پھر یہ جواب دیں کہ میں تو دہریہ مادہ پرست ہوں ۔ مجھے ایمان و شریعت سے کیا سروکار تو میں اس کے جواب میں

عرض کروں کہ یہ ٹھیک ہے کہ اس صورت میں آپ کو ہرگز ہرگز کشفی اور وجدانی دید الہٰی نصیب نہیں ہو سکتی۔ لیکن میں یہ ضرور کہوں گا کہ سیدھی اور صاف سڑک پر چل کر ان گنت لوگ کراچی سے لاہور پہنچے اور آجکل پہنچ رہے ہیں۔ آپ اس یقینی شاہراہ کو اختیار کرنے سے کیوں گریز کرتے ہیں۔ آپ اس شاہراہ عظیم کو چھوڑ کر غاروں اور کھڈوں میں بھٹکنے پر کیوں اصرار کرتے ہیں۔ ہزاروں لوگ انبیاء کرام علیہم السلام و اولیاء اللہ کی بتائی ہوئی شاہراہ پر چل کر واصل اللہ ہوتے اگر آپ کسی جگہ جانا چاہتے ہیں لیکن وہ راستہ اختیار نہیں کرتے جو اس جگہ کو جاتا ہے تو کوئی آپ کی کیا مدد کر سکتا ہے؟ دلائل آپ نہیں مانتے۔ مسلسل پیہم صادق و مصدوق برگزیدہ پاکیزہ حضرات کی شہادت کو آپ تسلیم نہیں کرتے جو راستہ آپ کو بتایا جاتا ہے۔ اس پر چلنے کیلئے آپ تیار نہیں تو اس کا علاج کوئی کیا کر سکتا ہے۔

میں آپ سے آخری اپیل کرتا ہوں کہ آپ اپنی گزشتہ زندگی پر غور کریں۔ کیا آپ کو اس زندگی میں صرف اتفاقات و حوادث ہی نظر آتے ہیں کیا آپکو اس زندگی میں کہیں حکمت منصوبہ۔ ترتیب۔ نظم نظر نہیں آتا۔ کیا آپ کو کہیں بھی کسی واقعہ میں خداوند تعالیٰ کا ہاتھ نظر نہیں آتا۔ کیا آپ نے کبھی نہیں دیکھا کہ کسی غیبی طاقت نے آپ کی حفاظت کی ہو؟ کیا آپنے کبھی نہیں دیکھا کہ رزق آپ کو وہاں سے پہنچا۔ جہاں سے آپکو گمان بھی نہ تھا؟ کیا آپنے کبھی نہیں دیکھا کہ انتہائی مایوسی اور اضطراب کی حالت میں غیبی امداد آئی؟ کیا آپکو کبھی ایسا سابقہ نہیں پڑا کہ ہوائی جہاز کے پہیئے نہیں کھلے اور انجن میں نقص پیدا ہو گیا یا بریک خراب ہو گئے۔ مسافروں کو موت بالکل سامنے نظر آنے لگی لیکن یکایک نقص خودبخود دور ہو گیا اور جہاز بخیریت اتر گیا۔ اسلئے ایسے واقعات پر غور کریں اور دیکھیں کہ ہر معاملہ میں کس کا دست غیب کام کر رہا ہے۔ ایمان اور یقین انسان کے اندر کی باطنی چیز ہے باہر سے نہیں ٹھونسی جا سکتی اسکے حصول کیلئے اپنا باطن درست کریں اور باطن کی درستی کیلئے مندرجہ بالا طریقہ اختیار کریں۔

(۹۱)

میں نے خدا کو کہاں دیکھا؟

(از جناب ڈاکٹر سید زاہد علی صاحب واسطی)

خدا کو کیسے دیکھیں؟ یہ سوال اکثر بعض ذہنوں میں ابھرتا ہے کہ انسان خدا کو کیسے دیکھ سکتا ہے۔ واضح رہے کہ دیکھنے کے لئے ضروری ہے کہ کوئی چیز کسی خاص جہت۔ مقام، شکل اور رنگ میں سامنے موجود ہو۔ روشنی کی شعاعیں اس سے منعکس ہو کر انسان کی آنکھ میں پردہ بصارت پر پڑیں اور آنکھ سے ایک خاص نس کے ذریعہ دماغ میں بینائی کے مرکز تک اسکی تصویر منتقل ہو جائے۔ کیا اللہ جل و علیٰ کی ذات کے متعلق اس طرح قابل دید ہونے کا تصور کیا جا سکتا ہے کہ انسان اللہ تعالیٰ کو اس طریقہ سے دیکھ سکے؟ ہرگز نہیں۔ یہ بات تو بڑی غلط فہمی پر مبنی ہو گی۔ اگر کوئی شخص یہ سمجھتا ہے کہ خدا کے وجود کو دیکھنے کی حقیقت کا عملی ظہور اس خاص صورت میں ہو سکتا ہے۔ تو یہ اس کی کم عقلی ہے۔ ورنہ خدا کو خدا کی خدائی میں دیکھنے کی ایسی بے شمار صورتیں ممکن ہیں۔ جن میں ہم خدا کی تجلی اور اسکا نور اسکا ظہور عملاً دیکھ سکتے ہیں:-

اللہ نور السموات والارض ط مثل نورہ کمشکوٰۃ فیھا مصباح ط (النور، ۳۵)

اللہ تعالیٰ نور دینے والا ہے۔ آسمانوں اور زمینوں کا نور۔ اسکی حالت ایسی ہے۔ جیسے ایک طاق ہے اس میں ایک چراغ ہے۔

اس بات میں کسی شک و شبہ کی گنجائش نہیں ہے کہ ذات خداوندی کا جلوہ کائنات

کے ہر مظہر میں جھلکتا ہے اور یہ سب مظاہر کلیتاً رہنمائے ذات باری ہیں۔ لیکن یہ رہنمائی بھی اس صورت میں ممکن ہے کہ ادراکِ صفات کو شعور ذات کا وسیلہ متعین کر لیا جائے۔ اگر اس کی بجائے تماشائے صفات مقصود بالذات کی حیثیت اختیار کر لے تو یہی وسیلہ راستے کی رکاوٹ بن کر ذہنی پریشانی کا موجب بن جائے گا۔ یہ ارض و سما۔ نباتات۔ جمادات۔ الغرض تمام کائنات کے نظر افروز مناظر کیا ہیں! یہ سب کے سب ذات خداوندی کے پرتو ہی تو ہیں۔ ربّ العرش العظیم ارشاد فرماتا ہے:۔

وَاِنْ تَعُدُّوْا نِعْمَتَ اللّٰهِ لَا تُحْصُوْهَا ؕ (النحل : ۱۸)

اگر تم اللہ کی نعمتیں گننی چاہو تو ان کا احاطہ نہ کر سکو گے۔

تخلیقِ انسان

بڑے بڑے سائنسدان اور اربابِ علم و صلاح جو صدیوں تک سائنسی تحقیقات کی بنیاد پر فلسفہ کی تعمیر میں کوشاں رہے۔ بڑے بڑے ماہر حیاتیات و ارضیات جو تخلیق کے حکیمانہ اقتدار اور مخلوقات کی معقولیت میں غور و فکر کرتے رہے۔ اسی نتیجہ پر پہنچے کہ کائنات کی تخلیق و قیام ایک زبردست ریاضیاتی دماغ سے ہوئی ہے۔ اور یہ کہنے پر مجبور ہو گئے کہ دنیا کے کل کتب خانوں سے زیادہ حکمت کے خزانے انسان کے جسم کی ساخت اور عمل و اثر میں پوشیدہ ہیں۔

انسان کا ظہور کون و مکان کی تخلیق کا نقطۂ عروج ہی نہیں بلکہ منتہائے مقصود بھی ہے۔ جب ہی اس کو خلیفۃ الارض قرار دیا گیا۔ اور اگر ہم تمام اسباب و علل کو سامنے رکھ کر انسان کو الطافِ ایزدی کا مظہر کہیں تو بیجا نہیں ہوگا۔ جس نے انسان کو ماورائے عقل ہونے کا دعویٰ دار بنا دیا ہے۔ قرآن کی رو سے انسان کی خلقت روحانی

اور جسمانی اعتبار سے احسن تقویم سے ہوئی۔ لقد خلقنا الانسان فی احسن تقویم (التین۔ ۴) انسان کو بہترین ساخت پر پیدا کئے جانے کا مطلب یہ ہے کہ اس کو اعلیٰ درجہ کا جسم عطا فرمایا گیا۔ جو کسی دوسری جاندار مخلوق کو نہیں دیا۔ اسے فکر و فہم علم و عقل کی وہ بلند پایاں قابلیتیں بخشیں جو کسی مخلوق کو عطا نہیں ہوئی۔

انسان اپنی زندگی مادی عناصر سے شروع کرتا ہے۔ اور پھر درجہ بدرجہ ترقی کرتا ہے۔ یہاںتک کہ وہ حواس و عقل سے نوازا جاتا ہے۔ چنانچہ یہ اس قادر مطلق کی قدرت و حکمت ہے کہ انسان کی پیدائش مٹی سے شروع کی جس کے متعلق ارشاد ربانی ہے :۔

ہم نے انسان کو کھنکھناتی مٹی کے گارے سے پیدا کیا۔ (الحجر، ۲۶)

قدیم یونانی اطبّاء و حکماء کا خیال تھا کہ انسانی جسم چار عناصر (مٹی۔ پانی۔ آگ اور ہوا) سے مرکب ہے۔ عربوں نے بھی اس معاملے میں یونانی حکما کی اتباع کی اور انہی چار عناصر کو بنیادی حیثیت قرار دیا۔ اٹھارہویں صدی کے آخری نصف تک یورپی سائنس دانوں نے مٹی اور پانی کو مرکب ثابت کرکے مادے کے آکسیجن ہائیڈروجن۔ نائیٹروجن جیسے تقریباً اسّی عناصر کی تفصیل بتا دی۔ انسانی جسم کے تجزیہ سے بھی یہ امر پایہ ثبوت کو پہنچ گیا۔ کہ انہی عناصر میں سے ایک محدود تعداد جسم میں موجود ہے۔ جن میں سے خاص خاص عنصر نائیٹروجن۔ آکسیجن۔ کاربن۔ ہائیڈروجن۔ کیلشیم۔ گندھک اور فاسفورس ہیں۔ ان کے علاوہ آئرن۔ میگنیز۔ زنک کوبالٹ اور کاپر وغیرہ بھی شامل ہیں۔ مذکورہ عناصر انسانی جسم میں ایسے سادہ اور خالص شکل میں دستیاب نہیں ہوتے بلکہ غذا کے دوران انہضام میں جسم

کے اندر کیمیائی طریقہ سے سادہ اجزا توڑ دی جاتی ہیں۔ اور پھر ان سادہ اجزا کو اکٹھا کیا جاتا ہے۔ اور اکٹھا کر کے جزو بدن بنا دیا جاتا ہے۔ گویا ایک ایسا فعل بروئے کار لایا جاتا ہے۔ جسے تجمع کا فعل کہا جاتا ہے۔ مثلاً جب کاربن ڈائی اکسائڈ دھوئیں اور یوریا کی راکھ میں تبدیل ہو جاتی ہے تو توانائی پیدا ہوتی ہے۔ جسے عمل تفرق کہتے ہیں۔ یہی شکست و ریخت کے عوامل ہر وقت جاری رہتے ہیں۔ اور یہی تفرق حقیقت میں زندگی کا دوسرا نام ہے۔ ؎

زندگی کیا ہے عناصر کا ظہور ترتیب ۔۔۔ موت کیا ہے انہی اجزا کا پریشاں ہونا

تولید انسان

راقم الحروف نے اپنے پیشہ وارانہ تعلیمی۔ علمی اور تدریسی زمانہ میں انسان کی ہیئت کو ہر شکل میں دیکھا۔ نطفہ کی اس بوند کو دیکھا۔ جس کا ذکر رب جلیل نے متعدد جگہ قرآن پاک میں فرمایا۔ اس بوند کو خوردبین میں تحقیق کیا اور رب العالمین کے اس شاہکار اسپرمے ٹوزا (کیڑا جس سے انسان تخلیق ہوتا ہے) کو دیکھا جو کروڑوں کی تعداد میں اس بوند میں موجود ہوتے ہیں۔ رحم مادر کو باہر اور اندر سے بخوبی دیکھا۔ اس اندھیری کوٹھڑی میں جھانک کر ہاتھ ڈال کر دیکھا۔ جہاں آسمانوں پر کمندیں ڈالنے والا انسان تقریباً دو سو اسی (۲۸۰) دن قیام کرتا ہے۔ اسی پُر پیچ راستہ کو دیکھا جو اس اندھیری کوٹھڑی سے سورج کی روشنی میں کھلتا ہے۔ جس راستہ کے بارے میں خدا تعالیٰ نے فرمایا کہ ہم نے تمہارے لئے آسان کیا۔ کیونکہ مادر رحم سے باہر تک کا راستہ انتہائی تنگ ہوتا ہے۔ اور صرف بچے کی ولادت کے وقت بحکم ربی اس قدر کشادہ ہو جاتا ہے کہ بچے کا اخراج بآسانی ہو جاتا ہے۔ مادر رحم میں، میں نے انسان کو

ایک گوشت کے لوتھڑے کی شکل میں بھی دیکھا۔ پھر اس کو اس کیفیت میں بھی دیکھا جسکا ذکر اس غفورالرّحیم نے اس طرح کیا کہ پہلے تمہیں گوشت کا لوتھڑا بنایا۔ پھر لوتھڑے کی بوٹی بنائی۔ پھر بوٹی سے ہڈیاں بنائیں۔ پھر ہڈیوں پر گوشت پوست چڑھایا۔ پھر اسکی صورت بنائی۔ فی الفور مجھے یاد آیا کہ ارشادِ ربانی ہے :۔

"ہم نے انسان کو ایک مخلوط نطفہ سے پیدا کیا تاکہ اس کا امتحان لیں اور اس غرض کیلئے ہم نے اسکو سننے اور دیکھنے والا بنایا" (الدھر : ۲)

یہاں میری قوت فکر ورطۂ حیرت میں غرق ہوگئی اور اس عظیم احسن الخالقین کی قدرت کاملہ کے بارے میں میری نطق صرف یہ کہہ سکی۔ بَلٰی وَاَنَا عَلٰی ذَالِكَ مِنَ الشَّاھِدِین۔ (کیوں نہیں ؟ میں اس پر گواہی دینے والوں میں ہوں)۔

قرآن نے ربوبیت کے مظاہر اعمال کے استدلال کے ساتھ ساتھ کائنات وخلقت کے افادہ و فیضان۔ زینت وجمال۔ موزونیت و اعتدال کے حقائق کی راہنمائی بھی کی ہے۔ جیسکے لئے فرمانِ الٰہی ہے کہ۔

"بلا شبہ اس میں بہت بڑی بصیرت ہے۔ اس کیلئے جو اپنے پہلو میں دل رکھتا ہو اور جس کے سر میں سننے والا کان ہو" (ق : ۳۷)

دماغ

دماغ انسانی کو کئی اعتبار سے تفوق حاصل ہے۔ اسے گنجینۂ اسرار کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا۔ یہی دماغ نفس امارہ و لوامہ کے درمیان فیصلہ کن راہیں دکھاتا ہے۔ اور ان کے درمیان آہنگیوں کا ذمہ دار ہے۔ قدرت کا یہ شاندار آلہ اپنے بنیادی حیاتیاتی کردار کی بدولت ہمیں خارجی دنیا کے متوقع حادثات میں متوازن رکھتا ہے۔ جسمانی تندوتیز لامتناہی کیمیاوی اور احساساتی

تبدیلیوں کے ماحول میں بھی اپنی ہستی کو برقرار رکھنے کی ذمہ داری بھی دماغ پر عائد ہوتی ہے۔ دماغ ہمارے ارادی افعال۔ عضلات کی حرکات وسکنات اور دیگر اعضاء مثلاً دل۔ پھیپھڑے۔ جگر۔ معدہ۔ گودے اور غدودوں وغیرہ کے کاموں میں ربط وضبط۔ انضمام وانصرام اور اشتراکِ عمل پیدا کرتا ہے۔

آیئے آپ کو دماغ کی سیر کرائیں۔ اسکا وزن تقریباً ایک کلوگرام ہوتا ہے۔ یہ متعدد جھلیوں میں بند انسان کی کھوپڑی میں بحفاظت رکھا ہوتا ہے۔ لیکن خدائے ذوالجلال کے شاہکار عصبی نظام کے ذریعہ سے اس کا رابطہ جسم کے ایک ایک خلیہ سے ہوتا ہے۔ دماغی مادہ نہایت چھوٹے چھوٹے عصبوں پر مشتمل ہوتا ہے جنہیں نیورونز کہتے ہیں۔ ان کی تعداد ایک محتاط اندازہ کے مطابق تیرہ ارب پچاس کروڑ کے لگ بھگ ہوتی ہے۔ کارکردگی کے لحاظ سے نیورون اطلاعات کی وصول یابی اور روانگی کے مرکز ہوتے ہیں۔ جہاں سے ایک سیکنڈ کے ہزارویں حصہ میں استفسارات کی معلومات بہم کی جاتی ہے۔ دماغ کے بالائی حصہ میں خودکار افعال انجام پاتے ہیں۔ مثلاً نظام انہضام۔ تنفس اور دوران خون کی کارکردگی اس حصہ کے ماتحت ہوتی ہے۔ یہی وہ وجہ ہے کہ اس کو ارتقا پذیر کہا جاتا ہے۔ چونکہ یہی حصہ انسان اور حیوان میں تفریق پیدا کرتا ہے۔ اور اس کے اندر بدن کے مختلف حصوں مثلاً ٹانگوں۔ ہاتھوں بازوؤں حتیٰ کہ ایک ایک پور کے مختلف مراکز کے علاوہ سونگھنے۔ چکھنے۔ دیکھنے سننے۔ سوچنے کے مراکز موجود ہوتے ہیں اور یہاں سے ہی جسم کے تمام حصوں کے مختلف النوع کاموں پر کنٹرول ہوتا ہے۔ جسم کے وسیع وعریض مواصلاتی نظام میں اربوں عصبے انتہائی برق رفتاری سے ہر لمحہ اپنے مخصوص مراکز کی معرفت کام

انجام دیتے رہتے ہیں۔ کنپٹیوں کے قریب دماغ میں یادداشت کا ایک مرکز ہوتا ہے۔ مرگی اور دوسرے امراض میں یہ مرکز اثر انداز ہوتا ہے۔ جس سے گذشتہ واقعات کی یادداشت اثر انداز ہو جاتی ہے۔ پچھلے حصہ میں بصارت کا مرکز ہے۔ اسی طرح سماعت کا مرکز ہے۔ اکثر اوقات بالا تر دماغ کی صلاحیتیں کمزور ہو جاتی ہیں۔ دماغی کام کرنے کی سکت۔ اوصاف اور خصوصیات کم ہونے لگتی ہیں۔ یہ علامات دماغ کی شریانیں سکڑنے کی بیماری یا درازی عمر کی وجوہات کی وجہ سے پائی جاتی ہیں۔

دماغ کی نچلی سطح پر ایک گول مٹول مٹر کے دانے کے برابر ایک محیر العقل غدود ہوتا ہے۔ جو بحفاظت ایک غلاف میں محفوظ نظر آتا ہے۔ اس غدود کو پی ٹوی ٹری کہتے ہیں۔ یہ عجائبات قدرت الہٰی کا منہ بولتا ثبوت ہے۔ انسان کے جسم میں تمام غدودوں سے نسبتاً سب سے چھوٹا ہوتا ہے۔ مگر اس میں اللہ تعالیٰ نے وہ جوہر پنہاں کر رکھے ہیں۔ جن سے انسانی ہیئت اور انسانی جسم کی تمام نشوونما کا کنٹرول اسی غدود کی کارکردگی کا محتاج ہے۔ اس غدود کا فعل ناقص ہو تو آدمی کا قد بہت چھوٹا رہ جاتا ہے۔ عموماً ڈھائی تین فٹ تک بڑھ سکتا ہے اور بتدریج نشوونما رک جاتی ہے۔ جسمانی بڑھوتری کے ساتھ ساتھ انسان ذہنی طور پر بھی انحطاطی رد عمل کا شکار ہو جاتا ہے۔ اور اگر یہ غدود بڑھ جائے تو اسکی کارکردگی انسانی جسم میں ایک تغیر عظیم کا موجب بن جاتی ہے۔ انسان ایک عظیم الجثہ شخصیت اختیار کر لیتا ہے۔ قد سات آٹھ فٹ تک بڑھ جاتا ہے۔ بازو اور ٹانگوں میں کوئی تناسب نہیں رہ جاتا۔ چہرہ لمبوترا اور دھڑ بے ڈول ہو جاتا ہے۔ دودھ پیدا کرنے پر اور فعل توالد پر بھی اس کا اثر حیرت کن انداز میں ہوتا ہے۔ غدود

کے پچھلے حصہ کی رطوبت دوران خون میں شامل ہو کر بے قنات غدوددوں کے رس میں شامل ہو کر بلڈ پریشر اور آنتوں کی حرکت کو درست حالت میں رکھتی ہیں۔ مزید براں اسکی رطوبتیں دوسرے غدوددوں کی کارکردگی کو کنٹرول کرتی ہیں۔ اس غدود کو اس لحاظ سے جسم کے تمام غدوددوں کا ہیڈ ماسٹر بھی کہتے ہیں۔

زبان

زبان گو اللہ تعالیٰ نے ہر مخلوق کو دی ہے۔ مگر انسان کو اشرف بنانے کیلئے رب العالمین کی نوازش ہے کہ ہمیں گویائی عطا فرمائی۔ زبان کا ذکر سورت البلد میں خدا تعالیٰ فرماتا ہے کہ ہم نے انسان کو زبان عطا کی ہے۔ مگر یہ صرف بولنے کا آلہ نہیں ہے۔ بولنے والی زبانیں تو چرند پرند، ہر ایک کو مرحمت فرمائی گئیں ہیں۔ مگر انسان کے لئے یہ نفس ناطقہ ہے جو کہ اظہار مافی الضمیر کے لئے ہے۔ جس سے انسان کو دیگر مخلوق پر فوقیت حاصل ہے۔ سورت الرحمان میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔ علمہ البیان اس نے بولنا سکھایا۔ یعنی ہمارا بولنا اس رب کریم کا فیض بے بہا ہے۔ اس قوتِ گویائی کے علاوہ اس ربِ رحیم نے زبان میں کس قدر خوبیاں عطا فرمائیں۔ آیئے دیکھیں عطیہ زبان میں کیا اسرار مضمر ہیں۔

زبان کی بناوٹ کلیتاً عضلاتی بافتوں کی مرہونِ منت ہے۔ اسی لئے ہم اس کو اپنی مرضی کے مطابق جس سمت چاہیں گھما پھرا سکتے ہیں۔ زبان کی اوپر کی تہ لعاب دار جھلی کی بنی ہوتی ہے۔ اس میں بے شمار چھوٹے چھوٹے ابھار ہوتے ہیں۔ جن کی تعداد کئی لاکھ ہوتی ہے۔ انہیں ذائقہ کے ابھار کہتے ہیں ان تمام ابھاروں کے جوف میں خلیوں کے ایسے مجموعے ہوتے ہیں جو ذائقے کی حس رکھتے ہیں۔ یہ مختلف ذائقوں کے شگوفہ ہوتے ہیں۔ کوئی چیز اگر سیال حالت میں نہ ہو۔ تو ذائقہ کے شگوفے متاثر نہیں

ہوتے۔ اگر وہ چیز پہلے ہی سیال حالت میں نہ ہو تو لعاب دہن اسکو محلول بنا دیتی ہے۔
اگر زبان پر لعاب بالکل صاف کر دیا جائے اور زبان پر نمک یا شکر رکھ دی جائے تو
وہ کوئی ذائقہ پیدا نہیں کرے گی۔ اگرچہ کھانے سینکڑوں اقسام کے ہوتے ہیں اور
ہر ایک کھانے کا ذائقہ انفرادی نوعیت کا ہوتا ہے۔ لیکن بنیادی ذائقے صرف چار
ہیں۔ یعنی میٹھا۔ نمکین۔ کڑوا۔ اور کھٹا۔ ان ذائقوں میں میٹھے اور نمکین ذائقوں کو
زبان کا سرا بہت اچھی طرح محسوس کرتا ہے۔ کڑوا ذائقہ زبان کے پچھلے سرے میں محسوس
ہوتا ہے اور کھٹے ذائقہ کی حس صرف زبان کے کنارے محسوس کرتے ہیں۔ یہ بھی نیرنگی
قدرت ہے کہ ذائقے کی حس کا سونگھنے کی حس سے بہت قریبی تعلق ہوتا ہے۔ یہی وجہ
ہے کہ اگر کوئی بدذائقہ دوا مثلاً کسٹر آئیل وغیرہ پینی پڑ جائے تو ناک بند کر کے پی جاتی
ہے اور یہی وجہ ہے کہ زکام نزلہ میں کھانوں کے ذائقے محسوس نہیں ہوتے اور لذت
کم ہو جاتی ہے۔ مثلاً ہم کو اعلیٰ درجے کی بریانی پیش کی جائے اسکا ہم جو اچھا ذائقہ تصور
کرتے ہیں۔ وہ دراصل اس کی اچھی خوشبو ہوتی ہے۔ جو معمولی ذائقہ کے باوجود اپنا
مخصوص اثر پیدا کرتی ہے۔ اب ذرا سوچئے کہ صرف چار انچ کے اس گوشت کے لوتھڑے
میں اس قدر خوبیاں علاوہ اس خالقِ کائنات کے کوئی اور پیدا کر سکتا ہے؟ ہرگز نہیں!

آنکھ ذرا غور تو فرمایئے مدبر کائنات کی حکمت عملیوں پر کہ حیات کی نمود میں آنکھ
کی تخلیق۔ پھر اس میں بصارت و مناسبت اور مطابقت و موزونیت کا
بے پایاں کمال جسکی تحسین نطق انسانی دینے سے قاصر ہے۔ ایک لمحہ کے لئے تصور
فرمائیں کہ اگر آنکھیں دو کی جگہ ایک ہوتی یا اپنی موجودہ جگہ کے بدلہ سینہ یا پشت
پر ہوتی تو انسان کی ہیئت کیا ہوتی۔ اس کے لئے ہی اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے۔

اِنّا کُلَّ شَیٍٔ خَلقنٰہ بِقَدَرٍ ـ یعنی ہم نے جتنی چیزیں پیدا کیں ایک انداز کے ساتھ پیدا کیں ـــــــــــــــ اب میں آپ کو اسی پر از مصلحت عطیہ ربانی کی سیر کراتا ہوں ۔

آنکھ عجائبات قدرت الٰہی کا ایک عظیم عطیہ ہے ۔ جس کی حفاظت کے لئے قدرت نے سر کی ہڈیوں میں ایک جوف بنایا ہے ۔ جسے خانہ چشم کہتے ہیں ۔ اس خانہ کے اطراف کی ہڈیاں سوائے سامنے کے رخ کے ہر طرف سے آنکھ کی حفاظت کرتی ہیں ۔ سامنے کے رخ آنکھ کی حفاظت پپوٹے کرتے ہیں ۔ ان پپوٹوں کے اندر بے شمار غدود ہوتے ہیں ۔ جن سے لعاب دار رطوبت خارج ہوتی رہتی ہے ۔ یہ رطوبت آنکھ کی سطح کو چکنا رکھتی ہے ۔ اور اس کی وجہ سے آنکھ بآسانی حرکت کرتی رہتی ہے ۔ ان پپوٹوں کے سروں پر لمبے بال ہوتے ہیں ۔ جنہیں پلکیں کہتے ہیں ۔ یہ پلکیں آنکھوں کو ٹھوس و رقیق ہر قسم کے بیرونی مادوں سے بچاتی ہیں ۔

آنکھ میں چھ عضلات ہوتے ہیں ۔ جن کی مدد سے آنکھ کو ہم ہر جانب اپنی مرضی سے گھماتے ہیں ۔ آنکھ کا دماغ کے ساتھ تعلق ایک عصب کے ساتھ ہوتا ہے ۔ جسے عصبِ باصرہ کہتے ہیں ۔ آنکھ کے کئی بیرونی پردے ہوتے ہیں ۔ جن کے علاوہ ایک سب سے اندرونی پردہ ہوتا ہے ۔ جسے پردہ شبکیہ یا (ریٹینا) کہتے ہیں ۔ یہ پردہ عصب باصرہ کے آخری سرے پر واقع ہے ۔ شبکیہ کی تمام سطح یکساں طور پر روشنی کا اثر قبول نہیں کرتی ۔ آنکھ میں بیرونی پردوں کے درمیان ایک شیشہ (لینس) ہوتا ہے ۔ یہ ایک شفاف جھلی میں ملفوف ہوتا ہے ۔ شیشہ ساخت کے لحاظ سے محدب ہوتا ہے ۔ شیشہ کے باہر کے پردے شیشہ کی موٹائی کو گھٹاتے بڑھاتے ہیں ۔

ہیں۔ جس کی وجہ سے اسکا طول ماسکہ علی الترتیب کم یا زیادہ ہوتا ہے۔ اس عمل کو تطبیق کہتے ہیں۔ جسکی وجہ سے ہم دور و نزدیک کے فاصلوں سے چیزوں کو صاف فوکس میں لاکر دیکھ سکتے ہیں۔ جب روشنی شیشہ میں سے گذرتی ہے تو وہ انعطاف سے ایک مرکز پر جمع ہوجاتی ہے۔ اور پردہ بصارت پر اس چیز کی تصویر نمایاں ہو جاتی ہے۔ جہاں سے عصب باصرہ کے ذریعہ یہ دماغ میں احساس بینائی پیدا کرتی ہے پردہ چشم پر جو عکس بھی پڑتے ہیں۔ وہ سیکنڈ کے آٹھویں حصہ تک قائم رہتے ہیں اور آنکھوں کے تادیر بینائی کے تاثر کو قائم رکھنے کے اصول پر سنیما کی طرح تصویریں بنتی رہتی ہیں۔

آنکھیں تو گدھے۔ گھوڑے کو بھی عطا کی گئی ہیں۔ مگر انسان کی آنکھ اس کائنات کو دیکھ کر اور فکر و فہم۔ علم و عقل کی وہ بلند پایاں قابلیتیں جو کسی مخلوق کو عطا نہیں ہوئیں۔ انہیں بروئے کار لاکر کسی بالاتر مقتدر ہستی کی بالادستی کو تسلیم نہ کرے (جس کے لئے قرآن فرماتا ہے۔ فِیْ اَنْفُسِکُمْ اَفَلَا تُبْصِرُوْنَ۔ یعنی اور خود تمہارے وجود میں بھی۔ پھر کیا تم دیکھتے نہیں؟) تو ایسے کو تو کور چشم ہی کہا جا سکتا ہے۔ آنکھ کا ذکر قرآن پاک میں عقل و فہم و ادراک کی پیش بینی۔ گمراہی و ضلالت سے فرار اور امر بالمعروف کے لئے کیا گیا ہے۔ اب یہ آپ پر منحصر ہے کہ آپ مانیں یا نہ مانیں اَلَمْ نَجْعَلْ لَّهٗ عَيْنَيْنِ (البلد۔ ۱۰) بھلا ہم نے انہیں دو آنکھیں نہیں دیں۔ ایسے ہی ایک اور جگہ ارشاد ہے۔ قُلْ هُوَ الَّذِیْٓ اَنْشَاَکُمْ وَجَعَلَ لَکُمُ السَّمْعَ وَالْاَبْصَارَ (الملک ۲۳) کہہ دو وہ خدا ہی تو ہے۔ جس نے تمہیں پیدا کیا اور تمہارے کان اور آنکھیں بنائیں۔

دل

یوں تو جسم کا ہر خلیہ عظمت تخلیق کا مظہر ہے۔ مگر دل کی کارفرمائی کل جسم کی شیرازہ بندی اور زندگی کا ظہور اپنے عمل و تدبیر خاص سے قائم رکھنے پر قادر ہے اور خالقِ عظیم کے حکیمانہ علم سے ایک وقت معینہ تک مصروف کار رہتا ہے۔ انسانی جستجو و تلاش بعد بسیار غور و خوض اسکی ساخت و عمل کی نقل اتارنے سے قاصر ہے۔

دل کہنے کو تو ایک قسم کا پمپ ہے۔ جسکا کام الفاظ میں تو بہت معمولی نوعیت کا ہے۔ یعنی ایک طرف سے خون لیکر دوسرے راستے سے جسم کے مختلف حصوں میں روانہ کر دینا۔ مگر یہ ایک ایسا عجوبہ تخلیق ہے کہ آج تک کوئی مشین اس مختص سائز میں یہ کام نہ کر سکی اور نہ کر سکے گی۔ یہ پھیپھڑوں کے درمیان واقع ہے۔ اور ایک مخروطی شکل کا کھوکھلا عضو ہے۔ ایک دوتہوں والی جھلّی کے تھیلے میں ملفوف ہوتا ہے۔ یہ غلاف رطوبت سے بھرا ہوتا ہے۔ اس میں بیک وقت ۱۴۰ مکعب سنٹی میٹر خون سما سکتا ہے۔ دل میں صرف چار خانے ہوتے ہیں۔

دل کے خانوں میں خون کی آمد و رفت کے لئے دائیں اور بائیں حصوں کے درمیان سوراخ ہوتے ہیں۔ اسطرح بالائی اور زیریں حصوں کے درمیان بھی سوراخ ہوتے ہیں۔ ان سوراخوں کے درمیان ایسے والو لگے ہوتے ہیں۔ جو خون کی یکطرفہ آمد و رفت کا انصرام کرتے ہیں۔ یہ مظاہر ربانی دیکھ کر دل میں خیال آتا ہے کہ دل ہی ان خواہشات نفسانی کی آماجگاہ ہے۔ جہاں اخلاقیات۔ دیانت۔ امانت۔ شرافت و شائستگی۔ انصاف و رحم۔ محبت و ہمدردی جیسے فضائل اور بدمعاش و سفلہ پن۔ ظلم و ستم۔ شرک و الحاد۔ گمراہی و ضلالت کی اتھاہ گہرائیوں میں چلنے کے

منصوبے بنتے ہیں۔ مگر عالم محسوسات میں ہمیں نظر نہیں آتے جیسے فرمان عزوجل ہے۔ لا تدرکه الابصار۔ (اسکو نہیں پاسکتیں آنکھیں) (الانعام، ۱۰۳)

دورانِ خون کی ابتدا میں شریانوں کے ذریعہ ناخالص خون پھیپھڑوں میں داخل ہوتا ہے۔ اور وہاں وہ گردش کرتا ہوا پھیپھڑوں میں عروق شعریہ کے درمیان سے جب گذرتا ہے تو سانس کے ساتھ وہاں آئی ہوئی آکسیجن کے ذریعہ صاف ہوجاتا ہے۔ اور یہ مصفا خون پھر ایک ورید کے ذریعہ دل میں داخل ہوجاتا ہے۔ جہاں سے شریانِ اعظم کی شاخوں کے ذریعہ جسم کے تمام حصوں میں جا پہنچتا ہے۔ شریانیں شاخدار شاخوں میں تبدیل ہوکر بہت باریک شریانوں میں منقسم ہوجاتی ہیں جنہیں شریانکیں کہتے ہیں۔ یہ شریانکیں مزید تقسیم ہوکر بے شمار بال سے باریک ایسی نالیوں میں بٹ جاتی ہیں۔ جنہیں عروق شعریہ کہتے ہیں۔ عروق شعریہ اس قدر باریک ہوتی ہیں کہ ہم انہیں خوردبین کے علاوہ قطعاً نہیں دیکھ سکتے۔ انہیں عروقِ شعریہ کے ذریعہ جسمانی بافتوں اور خون کے درمیان غذائی مادوں اور گیسوں کا باہمی تبادلہ ہوتا ہے۔ اس تبادلہ کے بعد عروق شعریہ آپس میں مل کر پھر ذرا بڑی نالیوں میں بدل جاتی ہیں۔ جنہیں ورید کہتے ہیں۔ یہ ورید میں مل کر بڑی نالیوں میں تبدیل ہو جاتی ہیں اور آخر میں تمام وریدیں دو بڑی وریدوں میں ختم ہوجاتی ہیں۔ یہ دونوں بالائی اور زیریں ورید اعظم میں کھلتی ہیں۔ جہاں سے یہ استعمال شدہ گندہ خون پھیپھڑوں میں لے جاکر نظام دوران خون قائم رکھتی ہے۔ اگر تمام خون کی نالیوں کو ایک لمبائی میں رکھا جائے اور ان پر سفر کیا جائے تو آپ بآسانی ملتان سے بہاول پور پہنچ سکتے ہیں۔

نبض کی حرکت دل کی دھڑکن کے مطابق ہوتی ہے۔ ایک منٹ میں دل اوسطاً ۷۲ مرتبہ دھڑکتا ہے۔ مگر جسمانی مشقت اور بخار میں دل کی دھڑکن بڑھ جاتی ہے۔ اسی واسطے نبض کی رفتار بڑھ جاتی ہے۔ دل اور نبض کی رفتار میں گردش خون اور خون کے بہت سے افکار کارفرما ہوتے ہیں۔ اس وجہ سے لگے ہاتھوں آپ کو خون کے بارے میں کچھ بتا دینا بھی ضروری ہے۔ خون تخلیق کائنات کا ایک اہم ترین حصّہ ہے۔ یہ جسم کے وزن کا تقریباً بارھواں حصہ ہوتا ہے۔ اگر خون کے قطرہ کو خوردبین میں دیکھیں تو لاتعداد گول گول جسیمے بے رنگ سیال میں تیرتے نظر آئیں گے۔ یہ جسیمے سرخ و سپید رنگ کے ہوتے ہیں۔ خون کے ایک قطرہ میں تقریباً پچاس لاکھ سے زائد سرخ جسیمے ہوتے ہیں۔ ان کا کام جسم کو طاقت پہنچانا اور آکسیجن کو جذب کرکے جسم کے تمام حصوں کو فراہم کرنا ہوتا ہے۔ جس کی وجہ سے جسم میں توانائی آجاتی ہے۔ آپ نے مشاہدہ کیا ہوگا کہ کسی حادثہ میں خون کی کثیر مقدار کے ضائع ہونے سے موت واقع ہو جاتی ہے۔ حقیقت میں انہی سرخ ذرات کی کمیابی ہو جاتی ہے۔ جس میں توانائی اس حد تک کم ہو جاتی ہے کہ موت ناگزیر ہو جاتی ہے۔

سفید جسیمے دراصل ایک قسم کی خون کی پولیس ہوتی ہے۔ یہ بیماریوں کے جراثیم اور دیگر زہریلے مادوں کو کھا کر برباد کر دیتی ہے۔ اگر ہم کوئی بیرونی مادہ یا جرثومہ خون میں داخل کر دیں اور خون کی ایک بوند کو خوردبین میں دیکھیں تو ایک محیر العقل منظر نظر آئے گا۔ بیرونی مادہ یا جرثومہ کو ہزاروں کی تعداد میں سفید جسیمے گھیرے میں لئے ہوتے ہیں اور اس کو کھا جاتے ہیں۔ اگر سفید جسیمے مزید ضرورت ہوں تو اپنی دفاع کے لئے موقع محل کے لحاظ سے سفید جسیمے تعداد میں بڑھنے

لگتے ہیں ۔ یہی وجہ ہے کہ کسی بھی بیماری کے دوران سفید جسمیوں کی تعداد بڑھ جاتی ہے ۔ خون میں جسم کی تمام فاسد رطوبتیں جمع ہوتی رہتی ہیں ۔ اس وجہ سے ہی خون کا استعمال حرام قرار دیا گیا ہے ۔ قرآنِ پاک میں اسی کے لئے فرمان ہے ۔ اِنَّمَا حَرَّمَ عَلَیۡکُمُ الۡمَیۡتَۃَ وَالدَّمَ (البقرہ ۱۷۳) بیشک اس نے تم پر مردہ اور خون حرام کیا ۔

گردے

دیکھنے میں تو گردے ایک حقیر سی چیز معلوم ہوتے ہیں ۔ مگر قادرِ مطلق علیم و حکیم کی صناعی کا لافانی شاہکار ہیں ۔ ان کی کارکردگی مظاہر ربِ کریم کے کمالات و عجائبات میں سرِ فہرست ہے ۔ گو آج کل انسان نے بکمال تحقیق مصنوعی گردہ بنانے میں قدرے سرخروئی حاصل کر لی ہے مگر اگر کسی نے اس مصنوعی گردہ کو کبھی دیکھا ہو تو اندازہ کر سکے گا ۔ ایک پندرہ مربع فٹ کے مصنوعی گردہ اور چار مربع انچ کے گردہ میں نہ صرف سائز میں فرق ہے ۔ بلکہ مصنوعی گردہ کی جزوقتی کارکردگی کے مقابلہ میں سورج کو چراغ دکھانے کے مصداق ہے ۔

بہر حال گردوں کی جوڑی جوف شکم کے اندر ریڑھ کی ہڈی کے دائیں بائیں ہوتی ہے ۔ اگر گردے کو لمبائی میں چیر کر دیکھا جائے ۔ تو اسکے اندر دو تہیں نظر آتی ہیں ۔ بیرونی تہ کو کارٹیکس اور اندرونی تہ کو میڈلا کہتے ہیں ۔ میڈلا سے مثانہ تک ایک لمبی پتلی نالی پیشاب لے جانے کے کام آتی ہے ۔ کارٹیکس کے درمیان خالی جگہیں نظر آتی ہیں ۔ ان خالی جگہوں میں مخروطی سطحیں ہوتی ہیں ۔ اگر کسی مخروط کو کاٹا جائے تو اس میں بے شمار خمیدہ نالیاں نظر آتی ہیں ۔ ان کا خاص وصف یہ ہوتا ہے کہ وہ خون سے بے کار مادے جذب کر کے انہیں خالی جگہوں میں جہاں مخروط ہوتے ہیں، لا ڈالتی ہیں ۔ یہ نالیاں گردے کی بیرونی سطحوں کے قریب آ کر پھیل جاتی ہیں اور گردوں کی

شکل اختیار کرلیتی ہیں اور یہاں عروق شعریہ کے گچھے بنالیتی ہیں۔ یہ گُرّے گردوں کی مشینری کی بنیادی اکائی ہوتی ہے۔ گردہ کے اندر تقریباً دس لاکھ سے زائد نیفرون یا گُرّے ہوتے ہیں۔ ہر نفرون ایک مکمل مشینری ہوتی ہے۔ جس میں مختلف قسم کے کل پرزہ ہوتے ہیں۔ اس میں باریک نالی ہوتی ہے۔ جس کی لمبائی تین سنٹی میٹر ہوتی ہے اِس طرح اگر دونوں گردوں میں ان نالیوں کی لمبائی ناپ لی جائے تو چالیس میل سے زائد بنتی ہے۔ گردوں کی کارکردگی اگر دیکھی جائے تو انسان انگشت بدنداں رہ جاتا ہے۔ اور خدائے عزوجل کی صناعی کے بارے میں یہی کہہ سکتا ہے۔ ع

فتویٰ ہے ذوقِ معرفت کا　　　　پہچان خدا کو بے دلائل

گردوں میں تیرہ سو مکعب سنٹی میٹر خون فی منٹ کے حساب سے گردش کرتاہے۔ اس گردش کا مقصد خون کا ان باریک نالیوں کے گچھوں سے گزرنا ہوتاہے۔ جہاں سے خون کے فاسد مادوں کا اخراج پیشاب کے ذریعہ ہوتا ہے۔ اسطرح چوبیس گھنٹوں میں اوسطاً ۷۰ لیٹر خون گردوں میں سے گزر جاتاہے۔ گردوں کی بیماریوں میں بنیادی اکائی اثرانداز ہوجاتی ہے۔ جس کی وجہ سے خون کے ذرات اور چند ضروری اشیاء مثلاً شکر وچربی وغیرہ پیشاب کے ذریعہ خارج ہونا شروع ہوجاتی ہیں اور فاسد مادے مثلاً یوریا۔ یورک ایسڈ اور متعدد نمکیات جو خارج ہونا ضروری ہوتے ہیں۔ دوبارہ خون میں واپس چلے جاتے ہیں۔

خوراک اکثر مشینوں میں کسی زمانہ میں لکڑی۔ پتھر کا ایندھن جلاتے تھے۔ جس کے جلنے سے توانائی حاصل ہوتی تھی۔ اس کے بعد تیل سے بتدریج ترقی ہوتے ہوتے آج کل گیس۔ بجلی اور شمسی شعاعوں کا ایندھن جلنے لگا۔

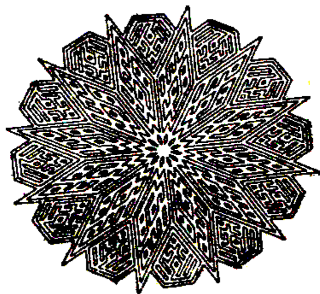
ہمارے جسم میں بعینہ ایندھن جلایا جاتا ہے تاکہ ہم کو توانائی حاصل ہو سکے اور یہ ایندھن خوراک ہوتی ہے۔ خدا تعالیٰ نے ہمیں اعلیٰ وارفع درجہ کی خوراکوں سے نوازا جس کو بطور ایندھن ہم اپنے پیٹ کی بھٹی میں جھونک کر ہمچو ما دیگرے نیست کے مصداق نہ صرف اکڑ اکڑ کر چلتے ہیں بلکہ ان جسمانی مشینوں کے خالق کا شکر تک ادا نہیں کرتے۔ جس طرح کسی بھی مشین کے کل پرزے گھستے رہتے ہیں۔ اسی طرح ہمارے جسم کی بھٹی کام کرنے سے شکست وریخت ہوتی رہتی ہے۔ اگر ہم ایک ایسی فیکٹری بنائیں جس میں ایک طرف سے تمام غذا جو ہم کھاتے ہیں وہ ڈالی جائے اور معدہ و آنتوں کے تمام عمل باقاعدہ زیرعمل رہیں۔ اور فیکٹری کے آخری جانب سے فضلے کا اخراج ہو۔ جیسا ہمارے جسم میں ہوتا ہے۔ تو بلا مبالغہ ایسی فیکٹری کے لئے کم از کم بیس ایکڑ زمین درکار ہوگی۔ اس کے باوجود انسان کو مطلوبہ کلورک توانائی نہ مل سکیگی۔

ہمارے جسم کو توانائی پیدا کرنے کے لئے کاربوہائیڈریٹ۔ پروٹین اور چکنائی کی ضرورت ہوتی ہے۔ جو کہ ہم کو قوت فراہم کرتے ہیں۔ بچوں میں تازہ بافتیں بناتے ہیں۔ بڑی عمر میں شکستہ بافتوں کی مرمت کرتے ہیں۔ نمک اور حیاتین اگرچہ براہِ راست جسم میں کوئی خاص قوت مہیا نہیں کرتے مگر ان کی موجودگی بہت سے عوامل اور تبدیلیوں کے لئے ناگزیر ہے جو کہ ہمارے جسم میں ہر لمحہ ہوتی رہتی ہیں۔

بایں ہمہ میں نے یہ سب خداوندی مظہر العجائب اپنی چشمِ گنہگار سے دیکھے اور بعد جستجو کے بسیار یہی سمجھ سکا کہ ایمان بے یقین اور یقین

بغیر علم کے مکمل نہیں ہو سکتا۔ اسی علم کی بدولت میں نے اس عظیم صناع رب السموات والارض کو انسان کے وجود میں دیکھا۔ اس کی حکمتوں اور نشانیوں سے روشناس ہوا جس کے بعد مجھے کسی سوچ و بچار کی ضرورت محسوس نہیں ہوئی۔ مگر یہ سب نشانیاں جو میں نے بیان کیں۔ یہ سب تو نصیحت پکڑنے والوں کے لئے ہیں۔ جن کے لئے خود اللہ تعالیٰ کا قرآن پاک میں ارشاد ہے۔

ان فی ذالک لآیت لقوم یذکرون (النحل - ۱۲)



(۱۰)

رحمٰن - شیطان اور انسان

(از ڈاکٹر نور محمد چوہدری پی - ایچ - ایس I ریٹائرڈ ملتان)

حقیقت شناسی

اللہ جلشانہ اپنے کلام پاک میں فرماتے ہیں. کہ

"جب کبھی شیطان آپ کو ورغلانے لگے. یا جب کبھی آپ قرآن مجید کی تلاوت کرنے لگیں تو شیطان کے داؤ پیچ سے بچنے کے لئے اللہ کی پناہ مانگیئے"

یہی وجہ ہے کہ ہر مسلمان اس حکم ربانی کی تعمیل میں اکثر و بیشتر مناسب موقع پر یہ پڑھتا رہتا ہے :-

اعوذ باللہ من الشیطٰن الرجیم

قرآن کریم کی اس آیت کریمہ میں رحمٰن - شیطان اور انسان تینوں کا اکٹھا ذکر آگیا ہے. جس سے معلوم ہوتا ہے. کہ ان تینوں کا ایک دوسرے کے ساتھ گہرا تعلق ہے. اور یہ تعلق عارضی یا وقتی نہیں بلکہ دائمی اور ابدی ہے. پھر جب ہم گرد و پیش کے حالات پر نظر دوڑاتے ہیں. تو یہ ساری کائنات ان تینوں ہستیوں کے ہی کردار کا آئینہ بن جاتی ہے جس میں ہر ایک اپنا اپنا کردار ادا کرتا نظر آتا ہے.

رحمٰن - شیطان اور انسان کا یہ تعلق اتنا گہرا ہے کہ وہ کسی وقت بھی نہیں ٹوٹتا. مگر

اتنے گہرے تعلق کے باوجود ہماری نظر ان کی ذات وصفات کی حقیقت تک نہیں پہنچی اور جب تک کسی چیز کی حقیقت واضح نہ ہو۔ اس وقت تک انسان کے دل میں اس کی قدر و منزلت اور عظمت و اہمیت پیدا نہیں ہوتی۔ رحمٰن کی رحمت شیطان کی شیطنت اور انسان کی انسانیت پر قرآن کریم نے بڑی شرح وبسط کے ساتھ روشنی ڈالی ہے۔ تاکہ حضرت انسان کو ان کی صحیح معرفت حاصل ہو جائے۔ وہ سفر زندگی بلا خوف جاری رکھ سکے۔ اور کسی کے فریب یا دھوکا میں نہ آئے۔ مگر انسان سب سے زیادہ انہی امور میں غفلت برت رہا ہے۔ جس کی وجہ سے معاشرہ میں طرح طرح کی خرابیاں پھیل رہی ہیں۔

ایمان اور عقیدہ

ایمان یقین یا عقیدہ کا نام ہے۔ اس کے بغیر زندگی کی گاڑی کا چلنا ناممکنات میں سے ہے۔ یہی وجہ ہے۔ کہ ہر انسان خواہ وہ کافر ہے۔ ملحد ہے۔ یا مسلمان، کسی نہ کسی پر مزور ایمان یا اعتقاد رکھتا ہے۔ اور اس کی زندگی اسی کے گرد طواف کرتے گزر جاتی ہے۔ جس طرح ہندوؤں کا ایمان وید دل پر، سکھوں کا گرنتھ پر، یہودیوں کا توریت پر، عیسائیوں کا انجیل پر، اور مسلمانوں کا قرآن پر ایمان و یقین ہے۔ اسی طرح منکرینِ خدا کا ایمان اپنے رہبروں کی تعلیمات پر ہے، روس میں لینن کے نظریات پر اور چین میں ماؤزے تنگ کی تعلیمات پر وہاں کے لوگوں کا اتنا پختہ یقین وایمان ہے، کہ انہوں نے عملاً انہیں اپنے دلوں۔ دماغوں اور فضاؤں میں وہی مقام عطا کیا ہے۔ جو خدائے حقیقی کا ہونا چاہیئے۔ اور وہ ان کی ویسی ہی عزت ومحبت اور پرستش کرتے ہیں۔ جیسی اللہ تعالیٰ کی ہونی چاہیئے۔ اور جس کی طرف قرآن کریم نے ان الفاظ میں اشارہ کیا ہے۔

وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَّتَّخِذُ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ اَنْدَادًا يُّحِبُّوْنَهُمْ كَحُبِّ اللّٰهِ

اور بعض لوگ وہ ہیں۔ جو اوروں کو اللہ کے برابر جانتے ہیں اور ان سے ایسی محبت رکھتے ہیں۔ جیسی اللہ سے محبت کی رکھانی چاہیئے۔

اسی لئے قرآن کریم نے سب سے زیادہ زور ذات وصفاتِ باری تعالیٰ کے ذہن نشین کرانے پر دیا ہے تاکہ انسان اپنے مالک حقیقی اور خالق ورزاق کو صحیح معنوں میں پہچانے اس کے احکام کی اطاعت کرکے اپنی محبت اور فرمانبرداری کا ثبوت دے۔ ہر وقت اسی سے وابستہ رہے کسی لمحہ بھی اس کی یاد سے غافل نہ رہے۔ اور اس کو چھوڑ کر نہ دوسروں کے دروازوں پر جھکے اور نہ انہیں اپنا کارساز، مشکل کشا اور حاجت روا بنائے۔ کیونکہ وہ بصیر وعلیم ہے۔ سب کچھ دیکھتا اور جانتا ہے اور ہر ایک کی براہ راست سنتا ہے۔ اس لئے اس نے کوئی حاجب ودربان نہیں رکھے ہوئے۔ یہاں تک کہ کسی کو اتنی بھی مجال نہیں کہ وہ اس سے کسی کی سفارش کر سکے۔ تاوقتیکہ وہ خود اس کی اجازت نہ دے۔

مَنْ ذَا الَّذِيْ يَشْفَعُ عِنْدَهٗٓ اِلَّا بِاِذْنِهٖ

ایمان اور عمل

ہم خدا کا نام لیتے نہیں تھکتے۔ بات بات پر اس کے نام کی قسم کھاتے ہیں۔ قدم قدم پر شیطان سے پناہ مانگتے ہیں مگر فی الواقعہ ہم خدا پر ایمان نہیں رکھتے۔ حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کے قول کے مطابق خدا پر ایمان لانا یہ ہے۔ کہ ہر وقت اسی کی پناہ مانگے۔ اور اسی کی مدد چاہے۔ اور شیطان کو اپنا دشمن جانے اور اس کے فریب میں نہ آئے۔ مگر ہم ہر وقت غیر اللہ سے امداد مانگتے ہیں۔ اور ہر معاملہ میں شیطان کو رفیق بناتے ہیں۔ اسی لئے ہم خدا کو ایک عضو معطل تصور کرکے اس کے احکام کی علانیہ اور عملاً مخالفت کرتے ہیں۔ اور شیطان کو خوش کرتے ہیں۔

اگر ہمارے دلوں میں خدا کی عظمت موجود ہو۔ اور ہمارا اس کی صفات پر ایمان ہو۔ تو ہم ہر میدان میں خلیفۃ اللہ نظر آئیں۔ دنیا ہم سے خوف کھائے۔ اور شیطان ہمارے قریب نہ آئے۔

اس لئے اس بات کی اشد ضرورت ہے کہ جذبۂ خدا شناسی پیدا کیا جائے۔ خدا کی ذات و صفات کو دل و دماغ میں رکھا جائے۔ شیطان کی نافرمانی اور انسان دشمنی کو ہر وقت پیش نظر رکھا جائے۔ اور انسان اپنے آغاز و انجام کو نہ بھولے۔ تاکہ وہ صراطِ مستقیم سے نہ بھٹک سکے۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ایک ارشاد کے مطابق صراطِ مستقیم سے مراد اسلام ہے۔ اللہ تعالےٰ فرماتے ہیں۔

وَاَنَّ هٰذَا صِرَاطِیْ مُسْتَقِیْمًا فَاتَّبِعُوْهُ

اور یہ ہے میرا راستہ سیدھا۔ سو تم اس کی پیروی کرو

صفات باری تعالیٰ

قرآن کریم نے اسلام کے سیدھے راستے کی حدود متعین کرنے کے ساتھ ساتھ ہی قدم قدم پر انسان کے احساس خدا شناسی کو بھی بیدار رکھنے کے لئے تفصیل و تکرار سے کام لیا ہے۔ تاکہ وہ اپنے روزمرہ کی زندگی میں اسے پیش نظر رکھے۔ قرآن کا کہنا ہے کہ:۔

"اللہ ایک ہے۔ اس جیسا کوئی نہیں۔ وہ سننے والا، دیکھنے والا ہے، نہ وہ جسم ہے۔ نہ شبح، نہ جثہ، نہ صورت، نہ گوشت، نہ خون، نہ شخص، نہ جوہر، نہ عرض، نہ رنگدار، نہ کسی مزے اور بو والا۔ نہ اسے چھوا جا سکتا ہے

نہ وہ حرارت والا ہے نہ برودت والا۔ نہ رطوبت والا۔ نہ یبوست والا نہ اس میں طول وعرض وعمق ہے اور نہ اجتماع و افتراق وحرکت وسکون ہے نہ اس کے اعضاء و اجزا ہیں۔ نہ وہ صاحب جہات ہے۔ نہ داہنے، نہ بائیں، نہ آگے نہ پیچھے۔ نہ اوپر نہ نیچے۔ اسے کوئی مقام احاطہ نہیں کر سکتا وہ نہ زمانے کے تحت آتا ہے۔ نہ وہ کسی جگہ میں حلول کئے ہوئے ہے نہ وہ عزلت گزیں ہے۔ نہ کسی چیز کے ساتھ متصل ہے۔ نہ وہ ایسی صفات کے ساتھ متصف ہے جن کے ساتھ مخلوق متصف ہے۔ نہ وہ متناہی ہے۔ نہ اسے ناپا جا سکتا ہے۔ نہ وہ کسی جہت کی طرف مائل ہے۔ اور نہ محدود ہے۔ نہ والد ہے نہ مولود ہے۔ نہ اقدار اسے احاطہ کئے ہوئے ہیں اور نہ حجاب۔ نہ حواس اسے پا سکتے ہیں نہ انسان، نہ وہ کسی انسان کے مشابہ ہے نہ کسی مخلوق کے۔ نہ اس پر آفات ومصائب کا نزول ہوتا ہے ہر وہ چیز جو دماغ اور وہم میں آ سکتی ہے وہ اس کے مشابہ نہیں۔ وہ تمام مخلوقات سے پہلے اور ان کا خالق ومبدع ہے۔ وہ ہمیشہ سے عالم قادر اور حیّ ہے۔ اور اسی طرح رہے گا۔ آنکھیں اسے دیکھ نہیں سکتیں۔ اور اوہام اسے پا نہیں سکتے۔ وہ کانوں سے نہیں سنتا۔ وہ ہے مگر اور چیزوں کی طرح نہیں ہے۔ وہ عالم وقادر ہے۔ مگر اہل علم وقدرت کی طرح نہیں ہے۔ وہ خود اپنا قیم ہے کوئی دوسرا اس کا قیم نہیں۔ اس کے سوا کوئی معبود نہیں۔ اس کا کوئی شریک اور وزیر نہیں۔ تخلیق میں اس کا کوئی مددگار نہیں۔ اس نے دنیا کو کسی نمونہ پر پیدا نہیں کیا۔ نہ اس پر کسی چیز کی تخلیق دشوار ہے

نہ اسے نفع سے تعلق ہے۔ نہ ضرر سے۔ نہ سرور سے۔ نہ لذتوں سے۔
نہ اسے آلام و تکالیف لگتے ہیں۔ نہ وہ فانی ہے۔ نہ عاجز ہے۔ نہ ناقص
ہے۔ نہ اس کے بیوی ہے۔ نہ بچہ ہے۔" (مقالات الاسلامیین)

بقول قرآن کریم :-

" اس کو نہ نیند آتی ہے نہ اونگھ۔ وہ سب کو دیکھتا ہے۔ اسے کوئی نہیں دیکھ سکتا۔ وہ سب کو دیتا ہے۔ مگر اسے کسی سے کچھ لینے کی حاجت نہیں۔ وہ دنیا اور آسمانوں کی ہر چیز کا مالک ہے۔ کائنات کی کل موجودات اس کے قبضہ و تصرف میں ہیں۔ وہ سب ملکوں کا بادشاہ ہے۔ اور سب بادشاہوں کا شہنشاہ ہے۔ جس کو چاہتا ہے۔ حکومت عطا کرتا ہے جس سے چاہتا ہے چھین لیتا ہے۔ جس کو چاہتا ہے۔ عزت بخشتا ہے جس کو چاہتا ہے ذلت دیتا ہے۔ جس کو چاہتا ہے غریب بنا کر اپنی یاد میں مشغول کر دیتا ہے۔ اور جس کو چاہتا ہے۔ امیر بنا کر اپنی یاد سے غافل کر دیتا ہے۔ جسے چاہتا ہے لڑکا دیتا ہے جسے چاہتا ہے لڑکی دیتا ہے۔ جسے چاہتا ہے دونوں دیتا ہے۔ جسے چاہتا ہے۔ بالکل ان سے محروم کر دیتا ہے جسے چاہتا ہے زندگی بخشتا ہے۔ جسے چاہتا ہے موت کی نیند سلا دیتا ہے۔ وہی سب کا روزی رساں ہے۔ وہی سب کا حاجت روا ہے۔ وہی سب کا مشکل کشا ہے۔ وہی سب کا دستگیر ہے۔ وہ جسے فائدہ پہنچانا چاہے اسے کوئی دوسرا نقصان نہیں پہنچا سکتا۔ اور جسے وہ نقصان پہنچانا چاہے اسے کوئی دوسرا بچا نہیں سکتا۔ اسے ذرہ ذرہ کا علم ہے۔ اس کا علم ہر چیز کو احاطہ کئے ہوئے ہے۔ مگر کوئی اس کے علم کا احاطہ نہیں کر سکتا۔ غرض کہ اس سے کوئی چیز چھپی ہوئی نہیں۔ وہ جو چاہتا ہے ہو جاتا ہے۔ مگر ہم جو چاہیں۔ تو ضروری نہیں کہ ویسا ہو جائے۔ کیونکہ وہ قادر و مختار

ہے۔ اور ہم عاجز و بے بس ہیں۔ اس کی خوبیوں کا کوئی شمار نہیں۔ اس کائنات کے ندی نالوں، دریاؤں اور سمندروں کو سیاہی بنالیں اور کل درختوں اور پودوں کے قلم بنا ڈالیں۔ تب بھی وہ اس کی صفات قلمبند کرنے کے لئے ناکافی ہیں۔" (القرآن)

فرشتے اور جن

حق تعالیٰ نے جب اپنی قدرتوں کو آشکارا کرنا چاہا۔ تو اس نے سب سے پہلے نور کو پیدا کیا۔ اور اسی نور سے پہلی مخلوق یعنی فرشتوں کی تخلیق ہوئی۔ نورانیت کے اثر سے یہ طبعاً اطاعت شعار اور عبادت گزار پیدا ہوئے۔ غرور و تکبر کی بجائے ان پر خوف و خشیت کا غلبہ طاری رہا۔ اسی لئے یہ ہر وقت اللہ جلشانہٗ سے خائف رہتے ہیں۔ اور انہیں بارگاہِ رب العزت سے جو بھی حکم ملتا ہے۔ اسے بلا تاخیر اور بلا چون و چرا فوراً بجالاتے ہیں۔ قرآن کریم نے ان کا ذکر ان الفاظ میں کیا ہے:۔

" آسمان اور زمین میں جتنے جاندار اور فرشتے ہیں۔ سب اللہ تعالیٰ کو سجدہ کرتے ہیں۔ اور وہ غرور نہیں کرتے۔ اور وہ اپنے پروردگار سے جو ان سے بالا دست ہے۔ ڈرتے رہتے ہیں۔ اور ان کو جو حکم ملتا ہے۔ وہ بجالاتے ہیں"۔ (النحل ۱۴/۱۶)

ایک دوسرے مقام پر ان کا یوں ذکر آیا ہے کہ:۔

" وہ اس کی عبادت سے عار نہیں کرتے اور نہ تھکتے ہیں۔ رات دن تسبیح میں لگے رہتے ہیں۔ اور سست نہیں ہوتے۔" (الانبیاء ۱۷/۲۱)

حضرت جابر بن عبداللہؓ سے روایت ہے۔ کہ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ساتوں آسمانوں میں ایک قدم کے برابر یا بالشت بھر یا ہتھیلی جتنی بھی خالی جگہ نہیں ہے۔ کہ کوئی نہ کوئی فرشتہ اس میں مصروفِ قیام نہ ہو۔ یا کوئی فرشتہ مصروفِ سجدہ نہ ہو۔

یا کوئی فرشتہ مصروفِ رکوع نہ ہو۔ پھر جب قیامت کا دن آئیگا۔ تو سب فرشتے مل کر (باوجود اس ہمہ وقت کی عبادت کے) عرض کریں گے کہ خداوندا۔ ہم تیری عبادت کا کوئی حق ادا نہیں کر سکے۔ ہاں بس اتنا ہے۔ کہ ہم نے تیرے ساتھ کسی کو شریک نہیں ٹھہرایا۔ اور شرک میں مبتلا نہیں ہوئے۔ (معجم طبرانی)

گویا حق تعالیٰ کی یہ ایسی مخلوق ہے۔ جس کی سرشت میں اطاعت ہے۔ بغاوت نہیں۔ اسے آسمانوں میں بسایا گیا ہے۔ اور نظم کائنات پر مامور کیا گیا ہے۔ جبرائیل علیہ السلام ان کے سردار ہیں۔ جن کے حضرت اسرافیل۔ حضرت میکائیل اور عزرائیل رفقاء کار ہیں۔ جو مختلف فرائض انجام دیتے ہیں۔ اور اسی مخلوق کو عرش معلیٰ اٹھانے اور اس کا طواف کرنے کا شرف حاصل ہے۔

فرشتوں کے بعد جو دوسری مخلوق پیدا کی گئی وہ جن ہیں۔ جن کا ذکر قرآن کریم میں ان الفاظ میں آیا ہے:-

وَالْجَآنَّ خَلَقْنٰهُ مِنْ قَبْلُ مِنْ نَّارِ السَّمُوْمِ (الحجر ۲۷/۱۴)

اور جن کو ہم (انسان سے) قبل گرم آگ سے پیدا کر چکے تھے۔

جنوں کو زمین پر آباد کیا گیا۔ یہ چونکہ آگ کی پیداوار ہیں۔ اس لئے ان کی سرشت میں بڑی تیزی اور تندی پائی جاتی ہے وہ ہر وقت زمین پر خون خرابہ اور دنگا فساد کرتے رہتے تھے فرشتے ان کی دیکھ بھال سے تنگ آگئے تھے۔ اور انہوں نے باری تعالیٰ کے حضور میں ان کی شکائیت پہنچانی شروع کر دی تھی۔ تو ایک دفعہ فرشتوں کی گذارش پر حق تعالیٰ نے تمام آسمانوں کے دروازے کھول دینے کا حکم فرمایا۔ ان تمام فرشتوں کو زمین پر جنات کے حالات سے آگاہ فرمایا اور حکم دیا کہ تمام جنات سے زمین کو صاف کر دیا جائے۔ چنانچہ اس حکم کی فوراً

تعمیل کی گئی۔ اور جنات کو پہاڑوں اور سمندروں میں دھکیل دیا گیا۔ اور ان سے زمین بالکل صاف ستھری کر دی گئی۔

مقام ابلیس

ابلیس بھی انہی جنوں میں سے ہے کیونکہ اسکا اپنا بیان جو قرآن نے نقل کیا ہے۔ یہ ہے کہ "میں آگ سے ہوں۔ اس لیے میں انسان سے برتر ہوں جو مٹی سے ہے"۔ یہ بڑا عالم۔۔۔ فاضل اور عبادت گزار تھا۔ جنوں کا امام تھا۔ زمین کے چپہ چپہ پر اس نے عبادت کی تھی۔ اور کوئی ٹکڑہ زمین ایسا نہ تھا جس پہ اس نے سجدہ نہ کیا ہو۔ اس لئے یہ عند اللہ بڑا مقرب اور پسندیدہ تھا۔ جسکی وجہ سے اسے تمام آسمانوں پر آنے جانے کی اجازت اور آزادی تھی۔

تخلیق انسان

انسان کی تخلیق کے متعلق قرآن کریم میں یوں ذکر آیا ہے کہ:۔

(۱) اللہ تعالیٰ نے انسان کو گوندھی ہوئی بدبودار مٹی سے پیدا کیا۔

(۲) ہم انسان کو کھنکھناتی ہوئی مٹی سے پیدا کیا۔

(۳) ہم نے انسان کو رنگدار مٹی سے پیدا کیا۔

روایات میں ان کی تفصیل یوں آئی ہے۔ کہ حضرت انسان کی پیدائش کے وقت فرشتوں کو حکم خداوندی ہوا۔ کہ مٹی اکٹھی کی جائے۔ حضرت جبرائیل زمین سے مٹی لینے گئے تو ایک زمین نے انکار کر دیا۔ وہ واپس آ گئے۔ اور کہا کہ ان کو زمین مٹی نہیں دیتی۔ اس کے بعد حضرت اسرافیل کو حکم ہوا۔ تو انہیں بھی دوسری زمین نے مٹی دینے سے انکار کر دیا اور وہ بھی ناکام واپس لوٹے۔ اس پر حضرت میکائیل کو بھیجا گیا۔ وہ ایک اور ٹکڑہ زمین پر پہنچے۔ مگر وہ بھی مٹی دینے سے انکاری ہوئی۔ اس کے بعد حضرت عزرائیل کو حکم ہوا۔ وہ زبردستی سب زمینوں سے مختلف رنگوں کی مٹی اٹھا لائے۔ ان مختلف زمینوں کی مٹی کو خوب ملایا گیا۔ اور جب سب

یک رنگ ہوگئیں. تو پھر ان کو گوندھا گیا. اور کچھ عرصہ کے لئے اسے الگ رکھ دیا گیا. ایک روایت کے مطابق جب اس پر چالیس سال گزر گئے. تو اس مٹی کو تیزاب سے آگ دے کر اس میں کیمیاوی اثرات پیدا کئے گئے. جس سے یہ مٹی خمیر بن کر ریزہ ریزہ یعنی آیٹم کی شکل میں بدل گئی. اس سے حضرت انسان کے مختلف بت تراشے گئے. ان میں سے ایک کو انسان کی شکل کے مطابق بنایا گیا. جسے حق تعالیٰ نے پسند فرمایا. اس کو آگ میں پکایا گیا. اور اور وہ کھنکھناتی آواز دینے لگا. پھر اس میں حق تعالیٰ نے اپنی روح کا کچھ حصہ پھونکا. و نفخت فیہ من روحی جس سے حضرت آدم نمودار ہوئے.

عظمت انسان

پیدائش آدم کے بعد باری تعالیٰ العرش معلیٰ پر جلوہ افروز ہوئے ملائکہ. آدم اور ابلیس سب موجود تھے. اللہ تعالیٰ نے فرشتوں کو فرمایا اِنِّی جَاعِلٌ فِی الْاَرْضِ خَلِیْفَۃً کہ میں زمین میں اپنا نائب یعنی خلیفہ پیدا کرنا چاہتا ہوں. انہوں نے جواب دیا یا باری تعالیٰ! ہم پہلے ہی جنات کا تماشا دیکھ چکے ہیں. کیا آپ پھر زمین پر خون خرابہ اور غارت گری کرانا چاہتے ہیں. اللہ تعالیٰ نے فرمایا. جو کچھ میں جانتا ہوں. وہ تم نہیں جانتے. اس پر اللہ تعالیٰ نے دنیا میں پیدا ہونے والی تمام ضروری اشیاء اور انبیاء کے نام آدم کو بتلا اور سکھلا دیئے. پھر انکو فرشتوں پر ظاہر کر کے ان سے ان کے نام پوچھے. تو انہوں نے یہ کہتے ہوئے معذوری ظاہر کی کہ لا علم لنا الا ما علمتنا ہمیں تو صرف ان چیزوں کا علم ہے. جن کا آپ نے ہمیں علم بخشا ہے. اس پر باری تعالیٰ آدم سے مخاطب ہوئے کہ ان تمام چیزوں کے نام فرشتوں کو بتلائے تو حضرت آدم نے ان تمام چیزوں کے نام گنوا دیئے. اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ وہ ارض و سما کی تمام خفیہ چیزوں کا علم رکھتے ہیں. اور ان سب چیزوں کا بھی علم رکھتے ہیں. جو کہ تم ظاہر

کرتے ہو یا چھپاتے ہو۔ اس طرح اللہ تعالیٰ نے فرشتوں پہ اپنی اور حضرت آدم کی بزرگی ظاہر اور ثابت کردی۔

شیطنتِ ابلیس

باری تعالیٰ نے فرشتوں کو حکم دیا کہ وہ حضرت آدم کو سجدۂ تعظیم ادا کریں۔ تو ما سوائے ابلیس کے تمام فرشتوں نے اسے سجدہ کیا۔ جب اس سے اس کی وجہ پوچھی گئی۔ تو ابلیس نے جواب دیا کہ وہ بدبودار مٹی سے پیدا کئے ہوئے شخص کو کیونکر سجدہ کرنے لگا۔ جبکہ آپ نے اسے رنگدار مٹی سے پیدا کیا ہے۔ اور حضرت آدم کی طرف اشارہ کرکے کہنے لگا ذرا اس کی شکل تو ملاحظہ کیجئے۔ اس کو مجھ پر فضیلت دی گئی ہے۔ اگر آپ مجھے قیامت تک مہلت دیں۔ تو میں ما سوا تھوڑے لوگوں کے اس کی ساری اولاد کو اپنے قبضہ میں کر لوں۔ اس متکبرانہ انداز گفتگو پر باری تعالیٰ نے غصہ میں فرمایا۔ نکل جاؤ یہاں سے! تم روز قیامت تک ملعون قرار دیئے گئے ہو۔ جاؤ اپنے وعظ اور حرب ربانی سے جتنا جی چاہے زور لگالو۔ ان پر جتنے گھوڑے تم نے دوڑانے ہیں، دوڑالو۔ اور جتنے پیادے ان پر چھوڑنے ہیں، چھوڑ ڈالو۔ انہیں اولاد اور دولت کے جتنے چکمے دینے ہیں۔ دے لو۔ اور ان سے جتنے وعدے کرنے ہیں کر لو۔ تمہیں کھلی چھٹی ہے۔

ابلیس نے جب دیکھا کہ وہ مردود و ملعون ہو کر شیطان بن گیا ہے۔ تو اس نے انتہائی جرأت اور جسارت کے ساتھ درخواست کی کہ یا رب! اب مجھے روز قیامت تک مہلت عطا فرما کر میں حضرت انسان اور اس کی اولاد کو گمراہ کر سکوں۔ حق تعالیٰ نے اس کی یہ درخواست منظور فرمالی۔ اور اس کے ساتھ ہی اسے یہ بات بھی کھول کر بتلا دی۔ کہ جو میرے بندے، میرے احکام پر نیک نیتی سے عمل پیرا ہوں گے۔ ان کا تو کچھ نہ بگاڑ سکے گا۔ اور

نہ ان پر تیرا زور چل سکے گا۔ اس طرح حق تعالیٰ نے اسی وقت حزب اللہ اور حزب الشیطان کا حدود دارلعبہ مقرر فرما دیا۔ کہ اللہ والوں پر شیطان کا داؤ نہیں چل سکے گا۔ یہ صرف انہیں فریب دے سکے گا۔ جو اس کے ہم مشرب اور ہم مسلک ہوں گے۔

جنّت سے اخراج

اس کے بعد حضرت آدم کو جنت میں بھیجدیا گیا۔ جہاں وہ بوجہ تنہائی اداس رہنے لگے۔ تو انہیں عالم خواب میں ایک حسین وجمیل عورت دکھلا کر ان سے پوچھا گیا کہ کیا اسے رفیقِ حیات بنانا پسند کرو گے؟ تو انہوں نے کہا کہ اگر ایسی صورت پیدا ہو جائے۔ تو بہت ہی شکر گزار ہوں گا۔ چنانچہ قادر مطلق نے اپنی قدرت کاملہ سے حضرت آدم کی پسلی سے اماں حوّا کو پیدا کیا۔ اور اس کے جوان ہونے پر حضرت آدم سے ان کا نکاح ہوا۔ اور ان کو بھی حضرت آدم کے ساتھ جنت میں بھیجدیا۔ اور ہدایت کی کہ اس میں جہاں چاہو۔ رہو۔ پھرو۔ کھاؤ۔ پیو۔ لیکن شجر ممنوعہ کے قریب مت جاؤ۔ ورنہ فتکونا من الظالمین! تم حد سے تجاوز کرنے والوں میں شمار کیئے جاؤ گے! شیطان کے دل میں آتش حسد بھڑک اٹھی کہ اسے تو جنت سے نکال دیا گیا اور آدم کو جنت کا وارث بنا دیا گیا۔ اس لئے اس نے اسے جنت سے نکلوانے کے لئے سانپ سے یارانہ گانٹھا جس کی اس وقت چار ٹانگیں تھیں۔ اور جنت کے جانوروں میں بڑا مقبول اور حسین تھا۔ شیطان اس کے منہ میں چھپ کر حضرت آدم کے پاس پہنچا۔ اور انہیں ورغلانے لگا۔ انہوں نے اس کی آواز پہچان لی۔ اور اس کی بات ماننے سے انکار کر دیا۔ اس کے بعد یہ حضرت حوّا کے پاس پہنچا۔ اور انہیں یہ فریب دیا کہ میں نے اللہ اور فرشتوں کی گفتگو اپنے کانوں سے سنی ہے۔ وہ آپ کو جنت سے نکال کر زمین پر بھیجنا چاہتا ہے۔ اس لئے آپکو شجر ممنوعہ کا پھل کھانے سے منع کیا

کیونکہ جو اس کا پھل کھا لیتا ہے۔ جنت اس کی ملکیت ہو جاتی ہے۔ اور وہ ہمیشہ جنت میں رہتا ہے۔ اسی لئے اس درخت پر پہرے بٹھائے ہوئے ہیں۔ جنہیں آپ خود دیکھ سکتی ہیں چنانچہ یہ فوراً شجر ممنوعہ کے پاس پہنچیں فرشتوں نے انہیں روکنا چاہا۔ مگر اللہ تعالیٰ نے فرشتوں کو روکنے سے منع کر دیا۔ کہ انہیں میں خود منع کر چکا ہوں۔ اگر انہوں نے میرا کہنا نہ مانا۔ تو خود سزا بھگتیں گی۔ چنانچہ فرشتوں نے قدغن اٹھا لی۔ اور حضرت حوا نے شجر ممنوعہ کا پھل کھا لیا جس سے فوری طور پر انہیں کوئی تکلیف نہ ہوئی۔ اور انہوں نے یہ قصہ حضرت آدم کو سنایا۔ اتنے میں شیطان بھی پھر سانپ کے منہ میں بیٹھ کر وہاں پہنچ گیا۔ اور اس نے بھی حضرت آدم کو بہکایا۔ جنہوں نے اس کے قریب میں آکر اس درخت کا پھل کھا لیا۔ جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ :-

۱ - حضرت آدم اور حضرت حوا کو جنت سے نکل جانے اور ایک مدت مقررہ تک زمین کا چکر کاٹنے کا حکم مل گیا۔

۲ - سانپ کو چاروں ٹانگیں سے محروم کر کے پیٹ کے بل رینگنے پر مجبور کر دیا گیا۔

۳ - شیطان کا آسمانوں میں داخلہ ممنوع قرار دے دیا کہ جونہی یہ آسمان کے قریب پہنچے اس پر آگ برسائی جائے۔ اور

۴ - ان سب کو ایک دوسرے کا دشمن بنا دیا گیا۔

اس وقت حضرت آدم کو اپنی غلطی کا احساس ہوا۔ اور انہوں نے رو رو کر ان الفاظ میں رب العزت سے معافی مانگی۔

ربنا ظلمنا انفسنا و	یا اللہ! ہم نے اپنے اوپر ظلم کیا۔ ہم سے
ان لم تغفر لنا و ترحمنا	غلطی ہوئی۔ اگر آپ ہم پر رحم نہیں کریں گے

ولتکونن من الخاسرین — تو ہم ہمیشہ ہمیشہ کے لئے نقصان اٹھانے والوں سے ہو جائیں گے

جس پر حق تعالےٰ نے انہیں معاف کر دیا۔ مگر انہیں شیطان اور سانپ کے ساتھ جنت سے نکال دیا گیا۔ جنت سے اخراج کے وقت حضرت آدم اور حضرت حوّا کو کھول کر بتا دیا گیا کہ

"میں آپ کی ہدایت و رہنمائی کے لئے وقتاً فوقتاً اپنے احکام صادر کرتا رہوں گا۔ آپ میں سے جو لوگ ان احکامات کی تعمیل کریں گے۔ ان کے لئے نہ کوئی غم ہو گا۔ اور نہ ہی کوئی فکر! مزے سے زندگی بسر کریں۔ لیکن جو کوئی میرے احکام کی نافرمانی کرے گا۔ اور میری یاد سے غافل ہو جائے گا۔ اس پر معیشت (دنیاوی زندگی) تنگ ہو جائے گی۔ وہ قیامت کے دن اندھا اٹھایا جائے گا۔ اور ہمیشہ ہمیشہ کے لئے دوزخ میں رہے گا۔" (القرآن)

حقیقت انسانی

انسان کو گو احسن تقویم کے سانچہ میں ڈھال کر اس دنیا میں بھیجا گیا۔ مگر اس کا سلسلہ توالد و تناسل ایک حقیر۔ ناچیز۔ ناپاک قطرہ سے چلایا گیا۔ اور اس کے پیٹ کے اندر گندگی بھر دی گئی جو اسے ہر وقت اٹھائے پھرنا ہے۔ تاکہ یہ اپنی اصلیت اور حقیقت کو نہ بھولے اور شیطان کی طرح اپنے حسب و نسب پر غرور نہ کرنے لگے۔ اس کے علاوہ اس میں آزمائش کے لئے کچھ خامیاں بھی رکھ دی گئیں۔ جیسا کہ قرآن کریم میں آیا ہے کہ انسان کو فطرۃً ظالم۔ بخیل۔ ناشکرا، جاہل۔ جھگڑالو۔ جلد باز اور کمزور پیدا کیا گیا ہے عقل قلیل عطا کی گئی۔ بعض امور میں اسے با اختیار اور بعض میں بے بس

بنا دیا گیا۔ اور اس کی تعلیم و تربیت کے لئے انبیا، اور صحائف بھیجے گئے۔ تاکہ یہ ان کی ہدایات اور احکامات کے مطابق زندگی بسر کر کے اپنی خلقی خامیوں کو خوبیوں میں بدل دے اور شیطان اس کی ان فطری خامیوں اور کمزوریوں سے فائدہ نہ اٹھا سکے۔

شیطان کا کام

حق تعالےٰ کا یہ بھی بڑا فضل ہے کہ اس نے انسان کو شیطان کے فریب سے بچانے کے لئے قرآن کریم کے ذریعہ اس کے طریق کار کی بھی وضاحت کر دی۔ کہ شیطان کا کام انسان کو نیکی سے باز رکھنا، برائی بے حیائی کے کاموں پر آمادہ کرنا اور جھوٹ بولنے کی ترغیب دینا ہے۔ اس کے دل میں وسوسے پیدا کرنا اور اسے یادِ الٰہی سے غافل کرنا اور ایک دوسرے سے لڑانا ہے۔ انسان سے جھوٹے وعدے کرنا اور اسے غلط امیدیں دلانا ہے۔ اور جب وہ اس کے دامِ فریب میں پھنس کر برائی یا گناہ کر بیٹھتا ہے تو پھر اپنی بریت جتانے کے لئے اس سے الگ ہو جاتا ہے اور اسے کہتا ہے کہ میرا تم پر زور تھوڑا ہی تھا تم نے تو خود میرا کہا مانا ہے اس لئے مجھے الزام مت دو۔ خدا نے تمہیں عقل کس لئے دی تھی؟ (القرآن)

اس لئے حق تعالےٰ قرآنِ مجید میں صاف صاف فرما دیا ہے،۔

"شیطان تمہارا جانی دشمن ہے تم بھی اس کے جانی دشمن بن جاؤ۔ اس کے دوست نہ بنو۔ جو کوئی رحمٰن کو چھوڑ کر شیطان کو دوست اور رفیق بنائے گا وہ ازسرتاپا خسارہ ہی خسارہ میں رہے گا اور میری یاد سے وہی غافل ہو گا جس پر شیطان مسلط ہو گا"

آزمائش و امتحان

غرض کہ شیطان اور انسان دونوں ایک حکم خداوندی کے انکار کی پاداش میں زمین پر بھیجے گئے۔ شیطان نے

عزدر کیا اس لئے وہ توہمیشہ کے لئے مردود ومقہور ہوا. مگر انسان نے معافی مانگ لی اس لئے اسے امتحان کا دوسرا موقعہ دیا گیا اور شیطان کو انسان کی آزمائش کے لئے مہلت دی گئی تاکہ وہ اپنے آپ کو عملاً جنت کا مستحق ثابت کرکے واپس وہاں پہنچ سکے، جہاں سے نکالا گیا تھا۔ اور اس کی ہدایت و رہنمائی کے لئے انبیاء اور صحائف بھیج دیئے تاکہ وہ رحمٰن کے پیغام اور شیطان کے کام سے آگاہ رہے۔ اور شیطان کے جال میں نہ پھنسے، اتنی عنایات کے بعد بھی اگر انسان رحمٰن سے بغاوت اور شیطان کی اطاعت کرتا ہے تو پھر اسے اپنا انجام خود ہی سوچ لینا چاہیئے کہ کیا ہوگا!

(۱۱)

خدا، خلافت اور انسان

ڈاکٹر سید زاہد علی واسطی

تخلیقِ آدم

تخلیقِ آدم کے وقت جب فرشتوں کو جمع کیا گیا اور زمین پر انسان کی خلافت کا اعلان کیا جانے لگا تو پوری نسل آدم کو جو قیامت تک پیدا ہونے والی تھی۔ اللہ تعالیٰ نے بہ یک وقت وجود و شعور بخش کر اپنے سامنے حاضر کر لیا۔ اور ان سے شہادت لی کہ تمہارا رب میں ہوں اور اعلان فرمایا کہ تم پر زمین و آسمان سب کو اور خود تمہارے باپ آدم کو گواہ ٹھہراتا ہوں تاکہ تم قیامت کے دن یہ نہ کہہ سکو کہ ہم کو یہ علم نہیں تھا۔ خوب جان لو کہ اللہ کے سوا تمہارا نہ کوئی خالق ہے اور نہ کوئی رب ہے۔ تم میرے ساتھ کسی کو شریک نہ ٹھہرانا۔ میرے سوا کسی سے نہ مانگنا اور صرف میری ہی عبادت کرنا۔

خدا تعالیٰ نے فی الواقع تمام انسانوں کو جنہوں نے قیامت تک پیدا ہونا ہے۔ بیک وقت زندگی، شعور اور قوتِ گویائی عطا فرمائی۔ اور اپنی ذاتِ اقدس کے بارے میں تعلیم دی۔ اس اجتماع پر اگر کوئی کوتاہ نظر یا تنگ نظر یقین نہ کر سکے تو وہ خود اپنا جواب دہ ہے۔ جب قادرِ مطلق رب عزّ و جل انسان جیسی ذی شعور اور صاحبِ فہم و ادراک مخلوق کو انفرادی اور تدریجی طور پر نسل در نسل پیدا کر سکتا ہے۔ تو روزِ محشر مجموعی طور پر بھی وہ دوبارہ زندہ کر دینے پر قادر ہے۔ بروزِ ازل، عدم سے وجود میں لاتے وقت بیک وقت قوت شعور و گویائی عطا فرما دینا بھی اس صانع علیم کے دائرہ اختیار سے باہر نہیں ہو سکتا۔ لہٰذا یہ امر بھی ناقابلِ یقین نہیں یا قابلِ تعجب نہیں کہ اللہ کی ربوبیت کا اقرار انسان کو

فطرۃً ودیعت کیا ہو اور بوقت آفرینش انسان جیسی صاحب تصرف واختیارات مخلوق کو زمین پر بحیثیت خلیفہ مامور کرتے وقت اللہ تعالیٰ نے حلف وفاداری لیا ہو۔

رمزِ خلافت خلیفہ وہ ہوتا ہے جو کسی کی مِلک میں اس کی تفویض کردہ اختیارات اس کے نائب کی حیثیت سے استعمال کرتا ہے۔ اس کے ذاتی اختیارات قطعی نہیں ہوتے۔ بلکہ اصلی مالک یا مالکِ حقیقی کے عطا کردہ ہوتے ہیں۔ وہ اپنی منشار کے مطابق کام کرنے کا کوئی حق نہیں رکھتا بلکہ اس کا وجود صرف مالک کے احکامات کی تعمیل۔ اور اس کی منشار کو پورا کرنے کے لئے مخصوص ہوتا ہے۔

جب تمہارے رب نے فرشتوں سے کہا کہ زمین پر ایک خلیفہ بنانے والا ہوں انہوں نے کہا کہ :-

"کیا آپ زمین پر کسی ایسے کو مقرر کرنے والے ہیں۔ جو اس نظام کو بگاڑ دے اور خون ریزیاں کرے۔ آپ کی حمد و ثنا کے ساتھ تسبیح اور آپ کی تقدیس تو ہم ہی کرتے ہیں"

فرمایا (اللہ تعالیٰ نے) "میں خوب جانتا ہوں۔ تم کچھ نہیں جانتے"
(البقر ۳۰)

مفسرین کا اجماع ہے کہ اس جواب سے فرشتوں کا مدعا ہرگز یہ نہیں تھا کہ خلافت انہیں دیدی جائے۔ یا اللہ تعالیٰ کی رہنمائی مقصود تھی۔ بلکہ ان کا مطلب یہ تھا کہ حضور فاطر السموات والارض ہیں جو چاہیں کر سکتے ہیں۔ مگر حضور کے فرامین کی تعمیل مکمل ہو رہی ہے۔ احکامات بطریق احسن بجائے جاتے ہیں۔ اب کس چیز کی کمی ہے۔ یا شاید انسان سے قبل کوئی اور مخلوق اللہ تعالیٰ نے پیدا کی ہو گی۔ جس نے فتنہ وفساد کیا ہو گا جس کا حوالہ

فرشتوں نے پیش کیا کہ پھر خوں ریزیاں ہوں گی ۔ ہم سے کیا کوتاہی ہو رہی ہے ۔ جو ایک خلیفہ کی ضرورت محسوس ہو رہی ہے ۔ جس کا جواب رب العالمین نے دیا کہ :۔

"ہم جانتے ہیں ۔ تم کچھ نہیں جانتے "

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ہر فرشتے کا علم صرف اس ہی ایک شعبہ تک محدود ہے ۔ جس شعبہ میں اس کی ڈیوٹی ہے یا اس کا تعلق ہے ۔ مثلاً ہوا کے انتظام پر جو فرشتے مامور ہیں وہ صرف ہوا کے متعلق جانتے ہیں ۔ مگر پانی کے بارے میں نہیں جانتے ۔ ان کو جو حکم دیا جاتا ہے ۔ ان کا کام صرف ان کی بجا آوری ہے ۔ تحقیق ۔ تجسس ۔ دریافت ۔ ان کا کام نہیں مگر انسان کو ان کے برعکس جامع علم دیا گیا اور مجموعی طور پر فرشتوں سے زیادہ ہر علم کی جامعیت بخشی گئی ۔ سوجھ بوجھ ۔ ذکر و فکر ۔ عمل و تفہیم کی ماہیت سے آگہی دی گئی ۔ جبکہ یہ سب کچھ فرشتوں کو میسر نہیں ۔

پس اس دنیا میں انسان کو خدا نے اپنا خلیفہ مقرر فرما دیا ۔ خلیفہ ہونے کی حیثیت سے انسان کا فرض صرف اتنا ہے کہ اپنے مالک کی بندگی کرے ۔ مالک کے تفویض کردہ ہدایات پر عمل کرے ۔ ان تمام اختیارات کا تصرف جو مالک نے دیئے ہیں ۔ نہایت دیانتداری سے کرے تاکہ جب مالک کے سامنے روز حشر پیش ہو تو جس قدر مدت مالک کی زمین پر رہا ہے ۔ اس کا حساب مالک کے روبرو رکھ دینے میں عار محسوس نہ کرے ۔

دعوتِ فکر

دنیا میں عجائبات قدرت الٰہی اس قدر ہیں کہ نہ انسان کا شمار کر سکتا ہے اور نہ ان کا مکمل ادراک کر سکتا ہے ۔ قرآن حکیم میں جگہ جگہ کارخانہ کائنات کی حکمت اور اس کی مناسبت سمجھا سمجھا کر انسان کو بتایا گیا ہے ۔ بڑے فصیح اور موثر انداز میں بنی نوعِ انسان کو اس مسئلہ پر ایمان لانے کا مکلف کیا گیا ہے ۔ فلسفہ و عقلیہ

دلائل ومباحث سے پُرپیچ مسائل کو عقل انسانی میں سمونے کی تدبیر و تذکیر سے کام لیا گیا.
جس کی مثال چودہ سو سال میں کوئی پیش نہ کرسکا۔ آپ بھی ملاحظہ فرمائیں .

- "اس کی نشانیوں میں سے ہے کہ تمہارے لئے تم ہی سا جوڑا پیدا کیا۔ تاکہ اس سے دل کو چین رہے . اور ایک عجیب قسم کی محبت اور دل کی گھلاوٹ تم میں رکھی . سمجھنے والوں کے لئے اس میں بہت سی نشانیاں ہیں"
- "لوگو! اگر تم کو مرنے کے بعد جی اٹھنے میں کچھ شک ہے تو ہم نے تم کو (پہلی بار بھی تو) پیدا کیا تھا (یعنی ابتدا میں) مٹی سے پھر اس سے نطفہ بنا کر پھر اس سے خون کا لوتھڑا بنا کر پھر اس سے بوٹی بنا کر جس کی بناوٹ کامل بھی ہوتی ہے اور ناقص بھی . تاکہ تم پر (اپنی خالقیت) ظاہر کردیں . اور ہم جس کو چاہتے ہیں ایک معیاد مقرر تک پیٹ میں ٹھہراتے ہیں. پھر تم کو بچہ بنا کر نکالتے ہیں. پھر تم جوانی کو پہنچتے ہو . اور بعض (قبل بڑھاپا) مرجاتے ہیں . اور بعض بہت خراب عمر کی طرف آجاتے ہیں . کہ بہت کچھ جاننے کے باوجود بھی لاعلم ہوجاتے ہیں . اور (اسے دیکھنے والے) تو دیکھتا ہے کہ (ایک وقت میں) زمین خشک پڑی ہے . پھر ہم جب مینہ برساتے ہیں تو وہ شاداب ہوجاتی ہے اور ابھرنے لگتی ہے . اور طرح طرح کی بارونق چیزیں اگتی ہیں . ان چیزوں سے ظاہر ہوتا ہے . خدا ہی برحق ہے . اور یہ کہ وہ مردوں کو زندہ کرتا ہے اور ہر چیز پر قدرت رکھتا ہے"

"ان ہی نشانیوں میں سے کہ تم کو مٹی سے پیدا کیا . پھر اب تم انسان ہو جابجا پھیلے ہوئے"

- "اس کی نشانیوں میں سے بجلی بھی۔ جس میں کڑک کا خوف اور مینہ کا طمع ہے کہ پانی برسنے سے مری ہوئی زمین زندہ ہو جاتی ہے۔"
- آسمان سے اندازہ کے موافق مینہ برساتا ہے۔ پھر اس کو زمین میں ٹھہراتا ہے۔ پھر اس کے سبب سے تمہارے لئے باغوں میں بہت سے میوے اور کھجوریں اور انگور پیدا کرتا ہے۔ جن کو تم کھاتے ہو۔ پہاڑ میں سے درخت اگاتا ہے۔ جس سے تیل نکلتا ہے۔"
- تمہارے لئے تو جانوروں میں بھی بڑی نصیحت ہے۔ ان کی چھاتیوں میں سے جو کچھ نکلتا ہے اس کو تم پیتے ہو اور بہت سے فائدے اٹھاتے ہو۔ بعض جانور تمہارے کھانے میں آتے ہیں۔ جانور بھی تم کو اٹھائے پھرتے ہیں اور کشتیاں بھی تم کو اٹھا کر لے جاتی ہیں۔"
- "اس نے بنائی ہے رات اور دن۔ سورج اور چاند جو اپنے اپنے دائرے میں پھرتے رہتے ہیں۔"
- بلکہ تم نے اپنے پروردگار کو نہیں دیکھا کہ وہ سائے کو کس طرح دراز کرتا ہے اور اگر وہ چاہتا تو اس کو (بے حرکت) ٹھہرا دیتا۔ پھر سورج کو اس کا رہنما بنا دیا۔ پھر ہم اس کو آہستہ آہستہ اپنی طرف سمیٹ لیتے ہیں۔ اور وہی تو ہے جس نے تمہارے لئے رات کو پردہ اور نیند کو آرام بنا دیا۔ اور دن کو اٹھ کھڑے ہونے کا وقت ٹھہرایا۔ اور وہی تو ہے جو اپنی رحمت کے مینہ کے آگے ہواؤں کو خوشخبری بنا کر بھیجتا ہے۔ اور ہم آسمان سے صاف ستھرا ہوا پانی برساتے ہیں تاکہ اس سے شہر مردہ (یعنی بنجر زمین) کو زندہ کریں۔ پھر ہم اسے

بہت سے چوپایوں اور انسانوں کو جو ہم نے پیدا کئے پلاتے ہیں"

یہ تھے چند اقتباسات جو قرآن حکیم سے ہم نے پیش کئے ۔ آپ غور فرمائیں کہ قرآن میں استدلال موجود ہے کسی جگہ یہ بات نہیں کہی گئی کہ خدا وحدہ لاشریک پر آپ بے سمجھے ایمان لے آئیں ۔ قرآن کا منشاء قطعاً یہ نہیں ہے کہ وجود خالق کُل کو انسان بغیر سوچ بچار کئے تسلیم کرلے ۔ یا اس وجہ سے مان لے کہ پیغمبروں نے فرمایا ہے ۔ بلکہ صاف صاف اپنی موجودات کی دلیلوں سے عجائبات قدرتِ الٰہی کو بتا بتا کر ۔ گنا گنا کر ۔ دکھلا دکھلا کر صانع عظیم کی برتری پر ایمان لانے کو کہا گیا ہے ۔ اللہ تعالیٰ نے اسی قرآن کے بارے میں فرمایا ہے ۔:۔

لَقَدْ اَنْزَلْنَاۤ اِلَیْكُمْ كِتٰبًا فِیْهِ ذِكْرُكُمْ ؕ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ (الانبیاء ۔ ۱۰)

(ترجمہ) "ہم نے تمہاری طرف ایسی کتاب نازل کی ہے ۔ جس میں تمہارا تذکرہ ہے ۔ کیا تم سمجھتے نہیں"

قرآن کا مطالعہ فرمائیے ۔ آپ کو اس میں ایسی کوئی بات نہ ملے گی جو آپ کو خواہ مخواہ خدا کو قادر مطلق تسلیم کرنے پر مجبور کردے ۔ اس کی بجائے واشگاف الفاظ میں انسان کو غور و فکر ۔ تذکیر و تدبیر ۔ عقل و بصیرت کے دروازے کھول کر سمجھنے کی دعوت دی گئی ہے ۔ قرآن کے بیانات کو لازم قرار دیا گیا ہے ۔ کہ یہ ان لوگوں کے لئے ہیں جو عقل رکھتے ہیں (یُبَیِّنُهَا لِقَوْمٍ یَّعْلَمُوْنَ) ایسا ہی طرزِ تکلم اور استدلال آپ کو جگہ جگہ قرآن حکیم میں ملے گا ۔ ملاحظہ فرمائیے :۔

لَعَلَّكُمْ تَعْقِلُوْنَ (تاکہ تم سمجھو) لَعَلَّكُمْ تَتَفَكَّرُوْنَ (تاکہ تم سوچو) اَفَلَا تَذَكَّرُوْنَ (تم سوچتے کیوں نہیں) اَفَلَا تَشْكُرُوْنَ (تم شکر کیوں نہیں کرتے) ایسی دعوت سیر و فکر ۔

ایسا انصرام مشاہدات ۔ ایسا انشراحِ صواب کس بات کی دلالت کرتا ہے ۔ ذرا سوچئے تو سہی ! دنیاوی علوم و فنون میں کمال کا شمار بھی خدا تعالیٰ کی نعمتوں میں ہی سے ہے ۔ تمدن و معاشرہ کی پیدا کی ہوئی عیش پرستیوں میں پڑ کر خوف آخرت سے بے فکر و بے نیاز ہو جانا ۔ قانون قدرت کی حدود کو توڑ کر فسق و فجور میں خود کو ڈال دینا ۔ خدا کی عظمت ، ربوبیت اور انسان کی عبودیت کو فراموش کر دینے پر خدا اپنی مخلوق " انسان " سے جس کو اشرف المخلوقات ہونے پر فخر ہے اور خلیفۃ الارض کہنے پر فرحاں ہے ۔ کیا قطعی بازپرس نہ کرے گا ؟ کیا کسی قسم کا مواخذہ نہ کیا جائے گا ؟ کیا کسی قسم کی جواب طلبی نہ کی جائے گی ۔ یہ آپ کی بھول ہے ۔ ضرور ایسا ہوگا ! جب ہر آقا اپنے غلام یا ملازم سے بازپرس کرتا ہے ۔ تو کیا آپ کا مالک آپ سے بازپرس نہ کرے گا ؟

ایں خیال است و محال است جنوں

اندازِ فکر

جو لوگ نفس انسانی سے مغلوب ہو کر حیوانیت کی راہ پر گامزن ہو جاتے ہیں ۔ جن کا اندازِ فکر تبدیل ہو جاتا ہے ۔ عبودیت الٰہی سے مائل بہ شرک ہو جاتے ہیں ۔ جن کے فکر و فہم میں راست بینی اور افتادِ مزاج میں راست روی نہیں رہتی ۔ سیرت و کردار ، خواہشات و جذبات کے تابع ہو جاتے ہیں ان پر انفرادی عذاب بھی آتے ہیں ۔ مگر جب یہ خصائل عام ہو جاتے ہیں ۔ اخلاق و اعمال صالح کا فقدان ہو جاتا ہے ۔ چیرہ دستیوں کے مہیب سائے فرد سے افراد اور افراد سے قوم پر پڑنے لگتے ہیں ۔ خدا کے قانون خلافت میں خلاف ورزیاں سرزد ہوتی ہیں تو پھر فرد کی جگہ تمام قوم قابلِ مواخذہ ہو جاتی ہے اور اس قوم کا کوئی باشندہ بھی محض اس بنا پر مواخذہ سے بری نہیں ہو سکتا کہ اس نے ذاتی طور پر کوئی

خلاف ورزی نہیں کی بلکہ اس کو اللہ خدائے عزّوجل کے سامنے اپنی صفائی کے لیئے لازماً اس امر کا ثبوت مہیّا کرنا پڑے گا کہ اس نے اپنی بساط بھر اپنی استطاعت کے بموجب اصلاح عام کی کوشش کی تھی۔ حضور محمد رسول اللہ علیہ وسلم سے ایک حدیث مروی ہے۔

" اللہ عزّوجل خاص لوگوں کے جرائم پر عام لوگوں کو سزائیں نہیں دیتے۔ جب تک عامۃ الناس کی یہ حالت نہ ہو جائے کہ وہ اپنی آنکھوں کے سامنے بُرے کام ہوتے ہوئے دیکھیں اور وہ ان کاموں کے خلاف اظہار ناراضگی کرنے پر قادر ہوں اور پھر بھی کوئی اظہار ناراضگی نہ کریں۔ پس جب لوگوں کا یہ حال ہو جاتا ہے تو خداوند ذوالجلال خاص و عام سب کو دکھ دینے والے عذاب میں مبتلا کر دیتے ہیں "

یہ بات اس طرح ذہن نشین فرمائیے کہ جب کوئی وبائی مرض کسی شہر میں شدّت سے پھیل جائے اور اس کے دفاعی انتظامات حسب ضرورت نہ کرلیے جائیں تو آہستہ آہستہ اس امر کی ہر ممکن توقع ہوتی ہے کہ شہر مبتلا کے چند گھر چاہے جس قدر ستھرے کیوں نہ ہوں متاثر ہو جائیں گے۔ پھر وبائی مرض یہ نہیں دیکھتا کہ ہزار خاندانوں میں سے کوئی خاندان کتنا مصفا ہے۔ اس کی لپیٹ سے شاذ ہی کوئی بچتا ہے۔ اخلاقی مرضوں کا حال بھی یہی ہے۔ اگر وہ انفرادی طور پر بعض افراد میں موجود رہیں اور صالح سوسائٹی ان پر اپنی کثرت تعداد سے غالب ہو جاوے تو وہ دبے رہیں گے۔ مگر جب سوسائٹی کی اجتماعی حالت ناقص و ابتر ہو جاوے اور اخلاقی امراض کو دبانے کی قوت سوسائٹی میں ختم ہو جائے تب بے حیائی۔ فحاشی۔ بداعمالیوں۔ گمراہیوں۔ فسق و فجور۔ شرک۔ الحاد۔ زندقہ کو اعلیٰ لاعلان اچھلنے کی نوبت پہنچ جاتی ہے۔ اور صالح افراد قلیل المتعداد ہونے کی وجہ سے

اپنی آواز بلند نہیں کر سکتے اور سوسائٹی کی اجتماعی برائیوں پر ساکت و صامت ہو جاتے ہیں۔ تو من حیث القوم وہ بھی اسی سوسائٹی کے فرد کی حیثیت سے اسی وبائی مرض کا شکار ہوتے ہیں اور مجموعی طور پہ تمام سوسائٹی بہ الفاظ دیگر تمام قوم پہ عذابِ الٰہی نازل ہو جاتا ہے۔

نشاناتِ عبرت

قرآن پاک ان حقیقتوں کی اس طرح تفصیل بیان کرتا ہے:۔

"جب ہم نے نوحؑ کو اس کی قوم کی طرف بھیجا (اس نے کہا) میں تم لوگوں کو صاف صاف خبردار کرتا ہوں کہ اللہ کے سوا کسی کی عبادت نہ کرو۔ ورنہ مجھے اندیشہ ہے کہ تم پر ایک دردناک عذاب آئے گا"

الغرض حضرت نوحؑ سے بہت رد و کد کے بعد ان کی قوم نے جواب دیا:۔

"اے نوح! تم نے ہم سے جھگڑا کیا اور بہت کیا۔ اب تو بس وہ عذاب لے آؤ جس کی تم ہمیں دھمکی دیتے ہو۔ اگر تم سچے ہو"۔

نوحؑ نے جواب دیا:۔

"وہ تو اللہ ہی لائے گا۔ اگر چاہے گا اور تم اتنی طاقت نہیں رکھتے کہ اسے روک لو" "یہاں تک کہ جب ہمارا حکم آ گیا اور وہ تنور اُبل پڑا۔ ہم نے کہا ہر قسم کے جانوروں کا ایک ایک جوڑا کشتی میں رکھ لو۔ اور ان لوگوں کو جو ایمان لے آئے" (ہود ۴۰، ۲۳، ۲۶)

حضرت نوحؑ کی قوم نے خدائی اور استحقاق بندگی میں دوسرے شریک بنا تے اوہام و تعصبات ان کے پیش رفت بن گئے۔ خدا اور کائنات کے متعلق مفروضہ نظریات گھڑ لئے۔ اپنے نبی کے پند و نصائح پر کان نہ دھرے۔ اپنی غلطیوں کے احساس و ادراک

کرنے کی بجائے لغویات بکنے لگے اور پھر وہ ہوا جو آج تک دنیا کو یاد ہے۔ ایک شام بحکم ربّی ایک طوفان آیا۔ جس کی ابتدار ایک تنور سے پانی کا چشمہ ابلنے سے ہوئی۔ پھر ایک طرف موسلا دھار بارش شروع ہوگئی۔ دوسری طرف زمین سے جگہ جگہ چشمے پھوٹنے لگے۔ اس طرح یہ قوم اس طوفان میں تباہ و برباد ہوگئی۔

قومِ عاد

عاد عرب کی قدیم ترین قوم تھی۔ اس قوم میں اللہ تعالیٰ نے حضرت ہود کو نبی بنا کر بھیجا۔ جو کہ بدکرداری اور شرک کی نجاستوں سے اپنی قوم کو نجات دلانے پر مامور ہوئے وہ دینِ مبین کی ترغیب و تبلیغ کرتے تھے۔ قرآن پاک میں یہ واقع اس طرح درج ہے۔

"اور عاد کی طرف ہم نے ان کے بھائی ہود کو بھیجا۔ اس نے کہا۔ اے برادرانِ قوم! اللہ کی بندگی کرو اور اس کے سوا تمہارا کوئی خدا نہیں ہے۔ پھر کیا تم غلط روی سے پرہیز نہ کرو گے۔ اس کی قوم کے سرداروں نے جو اس کی بات ماننے سے انکار کر رہے تھے۔ جواب میں کہا ہم تو تمہیں بے عقلی میں مبتلا سمجھتے ہیں اور ہمیں گمان ہے کہ تم جھوٹے ہو۔" اس نے کہا۔ اے برادرانِ قوم! میں بے عقلی میں مبتلا نہیں ہوں بلکہ میں رب العالمین کا رسول ہوں۔ تم کو اپنے رب کے پیغامات پہنچاتا ہوں اور ایسا خیر خواہ ہوں جس پر بھروسہ کیا جا سکتا ہے۔ کیا تمہیں اس بات پر تعجب ہوتا ہے۔ کہ تمہارے پاس تمہاری اپنی قوم کے ایک انسان کے ذریعہ یاد دہانی آئی ہے۔ تاکہ وہ تمہیں خبردار کرے۔ بھول نہ جاؤ کہ تمہارے رب نے نوح کی قوم کے بعد تمہیں اس کا جانشین بنایا اور تمہیں طاقتور بنایا۔ اللہ کی قدرت کے کرشمے یاد رکھو۔ امید ہے کہ فلاح پاؤ گے۔ انہوں نے جواب دیا: کیا تو ہمارے پاس اس لیے آیا ہے کہ ہم اکیلے خدا

کی عبادت کریں اور انہیں چھوڑ دیں جن کی عبادت ہمارے باپ دادا کرتے آئے ہیں ۔ اچھا تو لے آ وہ عذاب جس کی تو ہمیں دھمکی دیتا ہے ۔ اگر تو سچا ہے ہود نے کہا تم پر رب کی پھٹکار پڑ گئی اور اس کا غضب تم پر ٹوٹ پڑے کیا تم مجھ سے ان ناموں پر جھگڑتے ہو جو تم نے اور تمہارے باپ دادا نے (خداؤں کے) رکھ لئے ہیں ۔ جن کے لئے اللہ کی کوئی سند نہیں ہے۔"

(الاعراف ۷۱ - ۶۵)

پھر کیا ہوا ۔ تاریخ شاہد ہے عاد اولیٰ تباہ و غارت ہو گئی ۔

پھر قوم ثمود کی باری آتی ہے ۔ یہ عاد کے بعد معروف ترین قوم تھی ۔ زمانہ جاہلیت کی شاعری میں اس کے بے بہا اذکار موجود ہیں ۔ قرآن پاک میں اس کا تذکرہ اس طرح موجود ہے :۔

قوم ثمود کا انجام

"اور ثمود کی طرف ہم نے ان کے بھائی صالح کو بھیجا ۔" اس نے کہا ۔ اے برادران قوم اللہ کی بندگی کرو ۔ اس کے سوا تمہارا کوئی خدا نہیں ہے ۔ مگر قوم کے سرداروں نے پورے تمرد کے ساتھ اپنے رب کے حکم کی خلاف ورزی کی اور صالح سے کہا ۔ لے آ وہ عذاب جس کی تو ہمیں دھمکی دیتا ہے ۔ اگر تو واقعی پیغمبر ہے ۔ آخر کار ایک دل دہلا دینے والا عذاب نازل ہوا ۔ اور تمام قوم تباہ ہو گئی ۔"

(الاعراف ۷۹ ، ۷۲)

اللہ تعالیٰ نے عاد کے بعد ثمود کو اس قوم کا جانشین مقرر فرمایا ۔ خوش حالی عطا فرمائی ۔ صناعی اور فن سنگ تراشی میں یہ قوم ید طولیٰ رکھتی تھی ۔ سرسبز و شاداب باغات سے نوازا ۔ سربلند عمارات کا مالک بنایا ۔ آخر کار اس قوم ثمود نے کئی پشتیں گذرنے کے

بعد خدا کو بھلا دیا۔ بداعمالیاں اور اخلاقی کجرویاں عام ہوگئی اور لوگ مفسد بن گئے۔ خدائے وحدہ لاشریک کے شریک بنانے لگے۔ تب اللہ تعالیٰ نے حضرت صالح علیہ السلام کو اپنا رسول بنا کر اس قوم میں بھیجا تاکہ ان کی اصلاح کی جا سکے۔ مگر قوم نے نہ صرف آپ کا کہنا نہ مانا بلکہ آپ کی تکذیب کی اور علی الاعلان خدا کے شریک ٹھہرائے اور ان کی عبادت سے باز نہ آئے۔

قوم لوط کی تباہی

حضرت لوط، حضرت ابراہیم کے بھتیجے تھے۔ مدت تک آپ شام، فلسطین و مصر میں گشت لگا کر دعوت تبلیغ دیتے رہے۔ پھر پیغمبری مل گئی۔ اور قوم اہل سدوم کی اصلاح پر متعین فرمائے گئے۔ یہ قوم ہم جنسی جیسے خلاف فطرت افعال کی مرتکب تھی۔ اخلاقی جرائم، پست کرداری میں اپنا ثانی نہیں رکھتی تھی۔ یہ لوگ صرف بے حیا اور بدکردار ہی نہ تھے بلکہ اخلاقی پستی میں اس حد تک گر چکے تھے کہ اپنے درمیان چند نیک انسانوں اور نیکی کی طرف راغب کرنے والوں اور ان کو بدفعلیوں سے ٹوکنے والوں کا وجود تک برداشت نہ کرتے تھے۔ بدی ان کے اذہان میں اس قدر سرایت کر چکی تھی کہ اصلاح کی آواز بھی گوشِ نصیحت نیوش نہ بن سکی۔ اللہ تعالیٰ کی جانب سے ان بدکرداروں کے استیصال کا فیصلہ فرمایا گیا اور بہ حکم ربی اس قوم پر پتھروں کی ایسی بارش ہوئی کہ تمام قوم فنا فی النار ہوگئی۔ علاقہ سدوم کی تباہی کا زمانہ اہل فن کے تازہ ترین تخمینہ کے مطابق ۲۰۶۱ء ق۔م کا بازیافت کیا گیا ہے۔ چار پانچ لاکھ کی آبادی چند شہر اس طرح سطح زمین سے غائب ہوگئے کہ ان وجود تک باقی نہ رہا۔

وَمِنَ النَّاسِ مَن يَتَّخِذُ .... وَاَنَّ اللّٰهَ شَدِيدُ الْعَذَابِ (البقرہ ۱۶۵)

(ترجمہ)" اور کچھ لوگ ایسے بھی ہیں جو اللہ کے سوا دوسری ہستیوں کو اس کا ہم پلہ۔ ہمسر

اور مدِ مقابل بنا لیتے ہیں ۔ وہ ان سے ایسی محبت کرتے ہیں ۔ حالانکہ ایمان والوں کو سب سے زیادہ اللہ سے محبت کرنی چاہیئے اور کاش ! جو کچھ ان ظالموں کو عذاب دیکھ کر سوجھنے والا ہے ۔ وہ آج ہی ان کو سوجھ جائے کہ ساری قوتیں اور سارے اختیارات کا مرکز اللہ ہی کی ذات ہے اور یہ کہ اللہ کی پکڑ بے حد سخت ہے ۔"

بنی مدیان کی بربادی

حضرت ابراہیم علیہ السلام کی تیسری بیوی ـــــ قطورا سے جو اولاد ہوئی بنی مدیان کہلائی ۔ بنی مدیان حجاز کے شمال مغرب میں بحر احمر کے قریب بستے تھے ۔ وہ بھی پہلے سنت ابراہیمی کے پیرو تھے ۔ اور خدائے وحدہ لاشریک پر ایمان رکھتے تھے ۔ حضرت ابراہیم سے تقریباً سات سو سال کے بعد بنی مدیان کی حالت ابتر ہونے لگی ۔ شرک کی نجاست نے اس قوم کو آن لیا ۔ ہماری طرح معاملات تجارت میں بد معاملگی اور بد دیانتی اس قوم کا طرۂ امتیاز بن گئی ۔ فساد ۔ جھوٹ و خیانت میں ملوث ہو گئے ۔ راست بازی و دیانت رخصت ہو گئی ۔ حضرت شعیب علیہ السلام کو اس قوم کی درستگی سپرد فرمائی گئی ۔ آپ نے جب قوم بنی مدیان کو پیغام الٰہی سنایا جس کا قرآن میں اس طرح ذکر ہے ۔

" اے برادران قوم ! اللہ کے سوا کوئی معبود نہ بناؤ ۔ تمہارے پاس رب کی طرف سے رہنمائی آ گئی ہے ۔ لہٰذا وزن اور پیمانے درست کرلو ۔ لوگوں کو ان کی چیزوں میں گھاٹا نہ دو اور زمین پر فساد نہ کرو ۔ آنکھیں کھول کر دیکھو مفسدوں کا (پیشتر ازیں) کیا انجام ہوا ۔ اس قوم کے سرداروں نے جو انتہائی تکبر میں مبتلا تھے ۔ جواب دیا ۔ اے شعیب ! ہم تجھے اور ان لوگوں کو جو ایمان

لائے ۔ اس بستی سے نکال دیں گے ۔ ورنہ تم لوگ ہماری ملت میں واپس آجاؤ" قوم کے سرداروں نے جو شعیب کی بات ماننے سے انکار کر چکے تھے ۔ کہا" لوگو! اگر تم نے شعیب کی پیروی کی تو برباد ہو جاؤ گے ۔ مگر ہوا یہ کہ ایک دل دہلا دینے والی آفت نے ان کو آن لیا ۔ اور وہ منکر اپنے گھروں میں شب کو اوندھے پڑے کے پڑے رہ گئے" (الاعراف ۹۲،۸۸)

اصولاً ایک تباہی کے بعد دوسری تباہی آئندہ نسلوں اور قوموں کے لئے عبرت کا باعث اور دیدہ ور کے لئے مشعلِ راہ بن جانی چاہیئے تھی ۔ اپنے پیش رو قوموں کے زوال و انجام سے آنے والی قوموں کو راہنمائی حاصل کرنی چاہیئے تھی ۔ مگر انسان جو خلیفۃ الارض اور اشرف المخلوقات بننے کا داعی ہے ۔ وہ مصائب اور آفات میں تو زاری اور تضرع کرنے لگتا ہے ۔ مگر آسودگی اور فراخی میں پھر بھول جاتا ہے ۔ حالانکہ اگر وہ عقل سے کام لے تو سمجھ سکتا ہے کہ کچھ مدت پہلے وہ قومیں جن کی سطوت کے جھنڈے گڑے ہوئے تھے ۔ وہ لوگ جو عظمت کی اوجِ ثریا تک پہنچ چکے تھے ۔ انہیں فکر و عمل کی کن غلطیوں نے بربادیوں کی اتاہ گہرائیوں میں پہنچا دیا ۔ جس حاکم مقتدر نے کل ان غلطیوں پر مواخذہ کیا تھا ۔ آج بھی ہم پر اسی ذاتِ عالی وقار کا اقتدار مسلط ہے ۔ انسان کی اسی مکار عادت کو قرآن پاک میں کس صراحت کے ساتھ بیان فرمایا گیا ہے ۔ ملاحظہ فرمائیں ۔

وَاِذَا مَسَّ الْاِنْسَانَ الضُّرُّ .... مَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ (یونس ۱۲۰)

(ترجمہ) اور جب انسان کو تکلیف پہنچتی ہے تو لیٹا ہوا ۔ بیٹھا ہوا اور کھڑا ہوا ہمیں پکارتا ہے ۔ پھر جب ہم اس تکلیف کو اس سے دور کر دیتے ہیں تو دبے لحاظ ہو جاتا ہے ، اس طرح گزر جاتا ہے کہ گویا تکلیف پہنچنے پر ہمیں پکارا ہی نہ تھا ۔ اس

طرح حد سے گزرنے والوں کو ان کے اعمال آراستہ کرکے دکھلائے گئے ہیں۔"

بنی اسرائیل

جب حضرت موسیٰ علیہ السلام قوم بنی اسرائیل کے نجات دہندہ کی حیثیت سے فرعون مصر کے سامنے پیش ہوتے ہیں اور فرعون کو اولاً اللہ تعالیٰ کی بندگی کی جانب مائل ہونے کی پیشکش فرماتے ہیں۔ ثانیاً چونکہ بنی اسرائیل اصلاً ایک موحد قوم تھی اور اس وقت ایک مشرک بادشاہ کے ظلم و ستم کا تختۂ مشق بنی ہوئی تھی۔ اس وجہ سے موسیٰ علیہ السلام نے مطالبہ کیا کہ وہ ان موحدوں کو اس مشرکانہ فضا سے دور الگ ایک خطۂ زمین پر آباد کریں گے۔ تاکہ ان کی قوم خدا کی عبادت کر سکے۔

فرعون بحر روم کے سواحل پر شام سے لیبیا تک کے علاقہ کا ایک مطلق العنان بادشاہ تھا اور خود الوہیت اور مظہریت کا مدعی تھا۔ بلکہ معبود بنا ہوا تھا۔ انسانوں سے اپنی کُلّی اطاعت و عبادت کا مطالبہ کرتا تھا۔ فرعون نے جب موسیٰ سے رسالت کا دعویٰ سنا۔ عصا اور ید بیضا کی نشانیاں بچشم خود دیکھیں اور ماہرین فن جادوگری نے بالاتفاق فیصلہ کر دیا کہ موسیٰ جو چیز پیش کر رہے ہیں۔ وہ ہرگز ہرگز جادو نہیں ہے۔ مگر فرعون نے نہ ایمان لانا تھا نہ لایا۔ اس پر خدا کا عذاب نازل ہوا۔ تمام ملک میں ایک حسرتناک قحط پڑا۔ ٹڈیاں نازل ہوئیں اور سرزمین کا تمام غلہ کھا گئیں۔ تمام قوم نقل مکانی کرنے پر مجبور ہو گئی۔ اللہ تعالیٰ کی وعید نازل ہوتی اور وہ سب سمندر میں غرق ہو گئے۔ بنی اسرائیل کو اللہ تعالیٰ نے سمندر سے باآسانی گذار دیا۔ اور یہ لوگ فلسطین میں جا کر آباد ہو گئے۔ پھر جب اس قوم نے نافرمانیاں شروع کر دیں تو ان کو بندر بنا دیا گیا تاکہ ذلیل و خوار ہوں۔ اور ان کے حاکم اور رہنماؤں کو ہدایت و بصیرت سے بری کر دیا۔ قرآن پاک اس طرح بیان فرماتا ہے:۔

(ترجمہ) "اور رب نے اعلان کیا کہ وہ قیامت تک ایسے لوگ ان پر مسلط کرتا رہے

گا جوان کو بدترین عذاب دیں گے ": (الاعراف ۱۶۷)

اِبتلاو مُبتلا زمین پر ایسے انسان بھی ہیں جو گناہ کی نجاست و کثافت کو معمولات قرار دیتے ہیں اور خدا تعالیٰ کی طرف سے جو آزمائش کے مواقع فراہم کیے جاتے ہیں۔ ان کو اپنی ذات کے لیے بہتر تصور کرتے ہیں۔ کہ ان سے کوئی پوچھنے والا نہیں ہے۔ مگر جب ٹھوکر لگتی ہے کسی مشکل میں پھنس جاتے ہیں۔ تو انہی گناہوں سے تائب ہونے کے وعدے اور دعائیں مانگنی شروع کر دیتے ہیں۔ اور جب مشکلات رفع ہو جاتی ہیں تو پھر متاع حرص ہوس۔ لہو ولعب میں قلابازیاں کھانے لگتے ہیں۔ خوشحالی کے دور میں بھول کر بھی اللہ رسول کے احکامات کی بجا آوری نہیں کرتے۔

(ترجمہ) اور جب ہم انسان کو نعمت بخشتے ہیں تو رو گرداں ہو جاتا ہے اور پہلو پھیر لیتا ہے۔ اور جب اسے تکلیف پہنچتی ہے تو ناامید ہو جاتا ہے "

(بنی اسرائیل ۸۳)

وَاِذَا مَسَّكُمُ الضُّرُّ فِی الْبَحْرِ ضَلَّ مَنْ تَدْعُوْنَ .... وَكَانَ الْاِنْسَانُ كَفُوْرًا"

(بنی اسرائیل ۶۷)

(ترجمہ) "اور جب تم کو دریا میں تکلیف پہنچتی ہے (ڈوبنے کا خطرہ ہوتا ہے) تو جن کو تم پکارتے ہو۔ سب اس (پروردگار) کے سوا گم ہو جاتے ہیں۔ پھر جب وہ تم کو بچا کر خشکی کی طرف لے جاتا ہے تو تم منہ پھیر لیتے ہو اور انسان بڑا ہی ناشکرا ہے "

الغرض اللہ کی نافرمان قوموں پر اسی طرح عذاب آتے رہے۔ انسان اپنی نافرمانیوں میں اور بد عہدیوں میں جب بھی تجاوز کرنے لگا تو اس کو سزا ملتی رہی

یہ عذاب اور ابتلا میں ہمیشہ سیلاب ۔ قحط ۔ گرانی ۔ زلزلوں اور آتش زدگیوں کی صورتوں میں رونما ہوتے رہے اور ہوتے ہیں ۔ سمجھنے والوں کے لیے ان میں بڑی نشانیاں ہیں ۔ آج کل کے گھمبیر دور میں جب سائنسدان بام فلک کے دروازہ پہ دستک دے رہے ہیں ۔ ہم روزانہ ایسے واقعات سنتے ہیں کہ فلاں جگہ زلزلے سے لاکھوں افراد زمین دوز ہو گئے سیلاب سے ہزاروں لقمہ اجل بن گئے ۔ ہوائی حادثوں ۔ سمندری جہازوں کی غرقابی ۔ فحاشی اور عریانی کی آماجگاہوں میں آتش زدگی درس عبرت کی حیثیت رکھتی ہے ۔ ستم تو یہ ہے کہ آنکھوں سے پڑھتے ہیں ۔ دیکھتے ہیں کانوں سے سنتے ہیں ۔ خدا پر یقین رکھتے ہیں مگر خدا کے احکامات کی تعمیل سے روگردانی بھی کرتے ہیں ۔ خدا کو مانتے ہیں مگر خدا کی باتوں کو نہیں مانتے ۔

قُلْ مَنْ يَرْزُقُكُمْ مِنَ السَّمَآءِ .... فَسَيَقُولُونَ اللّٰهُ ج (یونس ۳۱)

(ترجمہ) ان سے پوچھو تم کو کون آسمان اور زمین سے رزق دیتا ہے ؟ یہ سماعت یہ بصارت کی قوتیں کس کے اختیار میں ہیں ؟ کون جاندار کو بے جان اور بے جان کو جاندار سے نکالتا ہے ۔ کون اس نظام عالم کی تدبیر کر رہا ہے ؟ وہ ضرور کہدیں گے کہ اللہ !

کاروبار

بڑے بڑے ملحدوں کو میں نے مصیبت اور آڑے وقت میں خدا کو پکارتے ہوئے دیکھا ہے ۔ سنا ہے ۔ مشرکین عرب خود اس راز کو جانتے تھے کہ آلام و مصائب میں خدا ہی کی ذات کام آتی ہے ۔ جیسا کہ آپنے اوپر کی تحریر میں ملاحظہ فرمایا کہ جب تم کسی مشکل میں پھنس جاتے ہو تو خدا کو یاد کرتے ہو مگر جب وقت ٹل جاتا ہے تو خدا کو بھول ہی نہیں جاتے بلکہ اس کے ساتھ دوسروں کو بھی اپنی استمداد اور دعاؤں میں شریک کر لیتے ہو ۔ دوسروں سے حاجت روائی کے طلبگار ہوتے ہو ۔ حالانکہ خوب سمجھتے ہو کہ ابتلا میں کوئی کام نہیں آتا ۔ اپنے اطراف و جوانب میں نگاہ ڈالیے کافر و مشرک تو رہے ایک طرف

کثیر تعداد مسلمانوں میں ایسی ملے گی جو خود کو دائرہ اسلام میں رکھنے کے دعوے دار ہیں۔ خدا کے مُبدی، مُعید اور مُحیی و مُمیت ہونے پر ایقان رکھتے ہیں۔ قرآن میں یہ بھی پڑھتے ہیں

مَالَكَ مِنَ اللّٰهِ مِن وَّلِيٍّ وَّلَا نَصِيرٍ ۔

(ترجمہ: اے نبی) اللہ کے سوا آپ کا نہ کوئی کارساز ہے نہ مددگار۔

پھر بھی صالحین و اکابرین و فقراء کے مزاروں پر۔ خود ساختہ ولی اور پیروں کے آستانوں پر جا کر ان سے دعائیں مانگتے ہیں۔ ان پیروں فقیروں اور غیر اللہ کو اپنا حاجت روا اور مشکل کشا سمجھتے ہیں اور ان سے ویسی محبت اور عقیدت رکھتے ہیں۔ جو اللہ تعالیٰ سے رکھنے کا حکم ہے بعض خانقاہوں پر اور بعض خانقاہوں کے سجادہ نشینوں کے قدموں پر سجدہ کرتے نظر آتے ہیں اور ان سے مرادیں مانگتے نہیں تھکتے اور ان ہی سے ہی امیدیں وابستہ کئے ہوئے ہیں۔ اللہ تعالےٰ نے اس لئے اپنی خلافت انسان کو نہ دی تھی کہ وہ خدا کے علاوہ دوسروں سے طلب گاری کرے۔ اس پاک پروردگار نے اپنا رحم فرمایا جو حضور محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو نبوت سے سرفراز فرمایا اور ہماری قوم کو نبی برحق دیا۔ اس ہادی اعظم نبیِ معظم نے کبھی خواہش نہ کی کہ کوئی انسان اس کے روبرو جھکے۔ اسی پیغمبرِ انسانیت سے ایک مشہور حدیث مروی ہے کہ اگر تمہارے جوتے کے تسمہ ٹوٹ جائیں تو بھی اللہ ہی سے مانگنے چاہئیں۔ اگر نمک کی ضرورت ہو تو وہ بھی اللہ سے مانگیں۔ یعنی جو چیز بھی مطلوب ہو۔ اللہ سے مانگیں غیر اللہ سے نہ مانگیں۔ قرآن واشگاف الفاظ میں جگہ جگہ کہتا ہے کہ خدا اور اس کے رسول کا کہنا مانو مگر انسان نہ فرمودہ ربّانی پر عمل پیرا ہوتا ہے۔ نہ احکامات رسولؐ کی فرمانبرداری کرتا ہے بلکہ ان کی تکذیب کرتا ہے۔ قرآن پڑھتا ہے مگر سمجھتا نہیں کہ یہ فعل اس کو اللہ کی رحمت سے دور اور اس کی ناراضگی و غضب سے قریب تر کرتا ہے۔ اللہ تعالیٰ

کا فرمان ہے :۔

" کیا لوگوں نے یہ سمجھ رکھا ہے کہ وہ بس اتنا کہنے پر چھوڑ دیئے جائیں گے کہ ہم ایمان لائے اور ان لوگوں کو آزمایا نہیں جائے گا۔ حالانکہ ہم ان سب لوگوں کی آزمائش کر چکے ہیں جو اُن سے پہلے گزر چکے ہیں ۔ اللہ کو ضرور یہ دیکھنا ہے کہ سچے کون ہیں اور جھوٹے کون ہیں "

اللہ تعالیٰ نے اہل ایمان کو باور اور ذہن نشین کرانے کی یہ صریح کوشش کی ہے کہ آزمائش ہی وہ کسوٹی ہے ۔ جس سے کھرے کھوٹے کی پہچان ہوتی ہے ۔ اللہ تعالیٰ سے عشق حقیقی بے دلائل ، بغیر جبر و اکراہ ، جس سے ایمان کے عزم و ثبات میں قطعاً لغزش نہ ہو ، وہ ہی خلیفۃ الارض کہلانے کا مجاز ہو سکتا ہے ۔ اور اسی کو اللہ تعالیٰ کی جانب سے سرفرازی اور بخشش کا وعدہ ہے ۔ درحقیقت یہ صرف صادق الایمان انسانوں کا حصہ ہے ۔ جو قرآن میں صاف صاف بیان کر دیا گیا ہے :۔

وَلَنَبْلُوَنَّكُمْ بِشَيْءٍ مِّنَ الْخَوْفِ .... وَبَشِّرِ الصّٰبِرِيْنَ (البقرہ ۵۵)

(ترجمہ) ہم آزمائش میں ڈالیں گے ۔ کسی قدر خوف اور بھوک سے مال سے ۔ جانوں اور پھلوں کے نقصان سے تو صبر کرنے والوں کو بشارت سنا دو "

اللہ تعالیٰ نے جس قدر بھی صحائف آسمانی جن جن قوموں پر نازل فرمائے ۔ ان سب میں اپنی فرمانبرداری کے وعدے جو انسان سے بوقت آفرینش نسل آدم لئے گئے تھے یاد دلائے ۔ وقتاً فوقتاً اُن کی یاد دہانی کے لئے رسول ۔ صالحین ۔ اکابرین ۔ مجددین ہر قوم و ملت میں قائم فرمائے ۔ جنہوں نے اپنی زندگیاں انتہائی کٹھن اور سنگلاخ راستوں پر چل چل کر دین متین کی خاطر نذر کر دیں اہل ایمان پر اپنے قول و عمل سے واضح کر دیا کہ آخرت کی

کامرانیوں کے لیے ہمارے دعویٰ خلافت کے مطابق عمل بھی چاہیئے۔ اگر خدا کے نائب ہونے کا دعویٰ کرتے ہو تو زبانی جمع خرچ سے کام نہ چلے گا جب تک ہر دعوے کو آزمائشوں کے وسیع ریگزار سے نہ گزار دگے۔ تاکہ اپنے دعویٰ حق گوئی کا بیّن ثبوت فراہم کر سکو۔ یہ بات بالکل عام فہم ہے کہ آپ انتہائی قابل ترین اساتذہ سے درس لیتے رہیں اعلیٰ ترین مصنفوں کی کتابوں کا مطالعہ کرتے رہیں۔ مگر قابلیت کی ڈگری حاصل کرنے کے لیے یہ امر لازم ہے کہ آپ یونیورسٹی (دارالعلوم) کے بنائے ہوئے قواعد وضوابط کے مطابق امتحان بھی پاس کریں۔ تب ہی معلوم ہو سکتا ہے کہ آپ سند یافتہ ہیں یا نہیں۔ دنیا و آخرت کی عنایات بے بہا سے فیضیاب ہونے کے لیے بس زبان سے کہہ دینا کافی نہیں کہ ہم مسلمان ہیں بلکہ مسلمان بننے کے لیے امتحانی مراحل سے گزرنا اور ثبوت دینا بہت ضروری ہے۔ اپنے خالق، اپنے مالک کی خاطر مشقتیں اٹھانی ہونگی۔ جان و مال کا زیاں برداشت کرنا ہوگا۔ طرح طرح کی دشواریاں اور سختیاں جھیلنی ہوں گی۔ مصائب و آلام سے دوچار ہونا ہوگا۔ خوف و طمع کا سامنا کرنا ہوگا۔ ہر وہ چیز جسے محبوب سمجھتے ہو راہِ خدا میں قربان کرنی ہوگی۔ خطرات و شدائد کے شکنجے میں سے گزرنا ہوگا۔ پھر جو مسلمان خدائے وحدہ لاشریک سے عشق حقیقی کی صلاحیت و استعداد پر پورا اترے گا۔ وہی جزا و عنایاتِ ربی کا مستحق ٹھہرے گا۔

پھر دعویٰ خلافت؟

انسان کا سفلہ پن ملاحظہ کیجیے۔ اِدھر خلافت کا دعویٰ کرتا ہے اُدھر اس کے چھچھورے پن اور افلاس تدبر کا یہ حال ہے کہ اگر پیسہ ہاتھ میں آجاتا ہے تو اپنا ذہنی توازن کھو بیٹھتا ہے۔ خوشحال یا زور آور ہو گیا تو اکڑ رہا ہے۔ غرور سے گردن اکڑی ہوئی ہے۔ سینہ تنا ہوا ہے۔ اگر

کسی کے ہاتھ کرسی اقتدار آگئی تو ہم چوں ما دیگرے نیست کے مصداق اس کو چھوڑنے کو تیار نہیں۔ اپنے اسلاف سے سبق نہیں سیکھتا۔ سچ مچ اپنے آپ کو خدا کا نائب نہیں (نعوذ باللہ) خدا سمجھنے لگتا ہے۔ وقت کی گردش کا خیال نہیں رکھتا ہے۔ قیصر و کسریٰ کی کرسیاں نہ رہیں۔ جارج ششم جس کی حکومت میں کبھی سورج غروب نہ ہوتا تھا، نہ رہا۔ سوچ لو جو تخت دیتا ہے، وہی تختہ دار پر بھی لٹکا دیتا ہے۔

انسان کو اللہ تعالیٰ نے افضل ترین مخلوق بنایا۔ اپنا نائب قرار دیا۔ اس کے باوجود غیر اللہ سے حاجت روائی فریاد رسی۔ گڑگڑانا۔ یہ سب کیا؟ سوچیے تو سہی! عالم اسباب پر حکمرانی۔ غیب کے اسرار و رموز دانی جو اللہ عزوجل کی مخصوص صفات ہیں اور یہ صرف اللہ کا ہی حق ہے کہ بندہ اس کو مقتدا اعلیٰ تسلیم کرے۔ اسی کے آگے اعتراف بندگی کرے۔ اسی سے امیدیں وابستہ کرے۔ اسی ذات والاصفات سے ظاہر و باطن میں ڈرے۔ غیر اللہ سے محبت ممنوع نہیں۔ انسان کو اپنے ماں باپ۔ بھائی بہن۔ بیوی بچوں سے محبت کرنا فطری امر ہے۔ صحابہ کرام۔ آئمہ شریعت و طریقت۔ بزرگان دین سے محبت بھی مستحب ہے۔ مگر وہ محبت ہمیں خلیفہ بنانے والے خالق کو ناپسند ہے جو درجہ ربوبیت تک پہنچا دے خدا کی خدائی میں حصہ دار بنا دے۔ ایمان متقاضی ہے کہ خالق و مخلوق کی اطاعت میں فرق ہونا ضروری ہے۔ اس کی سند قرآن ہے۔ ملاحظہ فرمائیے:۔

اِتَّخَذُوْا اَحْبَارَهُمْ وَرُهْبَانَهُمْ اَرْبَابًا مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ ۔

(ترجمہ) ان لوگوں نے اللہ کو چھوڑ کر اپنے عالموں اور درویشوں کو خدا بنا رکھا ہے۔

درحقیقت بات یہ ہے کہ انسان میں غیر شعوری طور پر اللہ تعالیٰ کی طرف میلان اور اس ذات قادر و مقتدر ہستی سے دلی وابستگی تو ہوتی ہے مگر چونکہ ضعیف الاعتقاد

لیا تو واضح رہے کہ اللہ کی الوہیت میں اس کو شریک کر لیا۔ استعانت۔ استمداد عجز و نیاز۔ توکل وہ اعمال ہیں جن میں انسان اگر خدا کے علاوہ کسی کو شریک کرے تو اوّل تو الوہیت کی یگانگت قائم نہیں رہ سکتی۔ ثانیاً یہ قانونِ خلافت کے منافی ہے کہ اپنے مصدرِ اعلیٰ سے تعلق توڑ کر دوسری جگہ جوڑ لیا جاتے۔

مولانا حالی نے چند اشعار میں اس سبق کا خوب نقشہ کھینچا ہے۔ ملاحظہ فرمائیں:-

کہ ہے ذاتِ واحد عبادت کے لائق
زبان اور دل کی شہادت کے لائق
اسی کے ہیں فرمان اطاعت کے لائق
اسی کی ہے سرکار خدمت کے لائق
لگاؤ تو لو اُس سے اپنی لگاؤ
جھکاؤ تو سر اُس کے آگے جھکاؤ
مُبرّا ہے شرکت سے اُس کی خدائی
نہیں اُس کے آگے کسی کو بڑائی



(۱۲)

خدا اور اُس سے ہمارا تعلق

(وحید الدین خان)

تعارف اسلام اس کائنات کا ایک خدا ہے جو اس کا خالق اور مالک ہے۔ خدا نے ایک خاص سکیم کے تحت ہم کو پیدا کیا ہے، جس کا علم وہ اپنے مخصوص اور منتخب بندوں کے ذریعہ ہم تک بھیجتا ہے، جن کو ہم رسول کہتے ہیں۔ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم اس سلسلے کے آخری رسول ہیں اب تمام دنیا کو آپؐ کی پیروی کرنی ہے۔ جو شخص آپ کی دعوت کو پائے اور پھر اس کو قبول نہ کرے وہ صرف آپ ہی کا انکار نہیں کرتا، بلکہ درحقیقت خدا کے تمام نبیوں کا انکار کر دیتا ہے، ایسا شخص خدا کا وفادار نہیں بلکہ اس کا باغی ہے اور خدا کی رحمتوں میں اس کے لئے کوئی حصہ نہیں ہے۔ یہ ہے مختصر طور پر اسلام کا تعارف، جس کی مجھے اس مضمون میں تشریح کرنی ہے۔

خدا کا وجود سب سے پہلے اس سوال کو لیجئے کہ اس کائنات کا ایک خدا ہے، بعض لوگ اس بات کو نہیں مانتے۔ ان کا کہنا ہے کہ یہ سارا کارخانہ محض ایک اتفاقی حادثے کے طور پر وجود میں آگیا ہے، اور اپنے آپ چلا جا رہا ہے۔

ہکسلے کے الفاظ ہیں: چھ بندر ایک ایک ٹائپ رائٹرے کر بیٹھ جائیں اور اربوں اور کھربوں سال تک الل ٹپ طریقے سے ان کو پیٹتے رہیں تو ہو سکتا ہے کہ ان کے سیاہ کئے ہوئے کاغذات کے ڈھیر میں کسی صفحے پر شکسپیئر کی ایک نظم نکل آئے۔ اسی طرح اربوں

اور کھربوں سال تک مادے کے اندھے عمل کے دوران میں بالکل اتفاق سے بن گئی ہے ـــــ

یہ جواب جس نے صدیوں سے بہت سے لوگوں کو فریب میں مبتلا کر رکھا ہے۔ یہ دراصل کوئی جواب نہیں ہے۔ بلکہ محض چند الفاظ کا مجموعہ ہے۔ کیونکہ اتفاق یا حادثہ بذاتِ خود کوئی چیز نہیں ہے۔ پھر جو چیز خود ہی اپنا وجود نہ رکھتی ہو وہ کسی دوسری چیز کو وجود میں لانے کا سبب کس طرح بن سکتی ہے، یہی وجہ ہے کہ کائنات کی یہ تشریح کائنات کے اوپر بالکل چسپاں نہیں ہوتی، یہ محض ایک بےبنیاد دعویٰ ہے۔ جو ذہنوں میں گھڑ لیا گیا ہے۔ اور کائنات کی حقیقی ساخت سے اس کا کوئی تعلق نہیں ہے۔ اس کے برعکس خدا کا تصور کائنات کے ساتھ بالکل ہم آہنگ ہو جاتا ہے، وہ خود کائنات کے اندر سے بول رہا ہے۔

کائنات اتنی پُرحکمت اور اتنی منظم ہے کہ اس کا تصور نہیں کیا جا سکتا کہ وہ کسی اتفاقی حادثے کے طور پر وجود میں آگئی ہو۔ زمین پر جاندار چیزوں کی بقا کے لیے جو حالات ضروری ہیں، وہ نہایت مکمل طور پر یہاں موجود ہیں۔ کیا محض اتفاق کے نتیجے میں اتنے عمدہ حالات پیدا ہو سکتے ہیں۔

زمین اپنے محور پر ایک ہزار میل فی گھنٹہ کی رفتار سے لٹو کی مانند گھومتی ہے۔ اگر زمین کی رفتار ایک سو میل فی گھنٹہ ہوتی تو ہمارے دن اور رات اب کے دن اور رات سے دس گنا زیادہ لمبے ہوتے۔ زمین کی تمام ہریالی اور ہماری بہترین فصلیں سو گھنٹے کی مسلسل دھوپ میں جھلس جاتیں اور جو بچ رہتیں وہ لمبی رات میں سردی کی نذر ہو جاتیں۔

سورج جو ہماری زندگی کا سرچشمہ ہے، اپنی سطح پر بارہ ہزار ڈگری فارن ہیٹ سے دہک رہا ہے۔ یہ حرارت اتنی زیادہ ہے کہ بڑے بڑے پہاڑ بھی اس کے سامنے جل کر راکھ ہو جائیں گے۔ مگر وہ ہماری زمین سے اتنے مناسب فاصلے پر ہے کہ یہ دائمی انگیٹھی، ہمیں ہماری ضرورت سے ذرّہ بھر زیادہ گرمی نہ دے سکے۔ اگر سورج دُگنے فاصلہ پر چلا جائے تو زمین پر اتنی سردی پیدا ہو گی کہ ہم سب لوگ جم کر برف ہو جائیں گے اور اگر وہ آدھے فاصلے پر آ جائے تو زمین پر اتنی حرارت پیدا ہو گی کہ تمام جاندار اور تمام پودے جل بھُن کر خاک ہو جائیں گے۔

زمین کا کرۂ فضا میں سیدھا کھڑا نہیں ہے، بلکہ ۲۳ درجے کا زاویہ بناتا ہوا ایک طرف کو جھکا ہوا ہے۔ یہ جھکاؤ نہ ہوتا تو سمندر سے اٹھتے ہوئے بخارات سیدھے شمال یا جنوب کو چلے جاتے اور ہمارے براعظم برف سے ڈھکے رہتے۔

چاند ہم سے تقریباً ڈھائی لاکھ میل کے فاصلے پر ہے۔ اس کی بجائے اگر وہ صرف ایک لاکھ میل دور ہوتا تو سمندروں میں مدوجزر کی لہریں اتنی بلند ہوتیں کہ تمام کرّۂ ارض دن میں دو بار پانی میں ڈوب جاتا اور بڑے بڑے پہاڑ موجوں کے ٹکرانے سے گھس کر ختم ہو جاتے۔

یہ ہماری کائنات کے چند نہایت معمولی اور بالکل سادہ واقعات ہیں۔ ان کے سوا بیشمار ایسے واقعات ہیں جو ظاہر کرتے ہیں کہ ہماری زمین پر ان کا اجتماع محض اتفاقی طور پر نہیں ہو سکتا۔ اور نہ محض اتفاق انہیں باقی رکھ سکتا ہے۔ یقیناً کوئی ہے جو ان واقعات کو وجود میں لایا ہے، اور ان کو اس قدر منظم طریقہ پر مسلسل باقی رکھے ہوئے ہے۔ کائنات اتنی مربوط اور منظم ہے کہ جب بھی ہم اس کے کسی واقعہ کو

بیان کرتے ہیں تو در حقیقت ہم اس کو محدود کر دیتے ہیں، کائنات کے ایک ایک جزو کے اندر اتنی حکمتیں ہیں کہ جب بھی ہم اس کی کسی حکمت کا ذکر کرتے ہیں تو ایسا محسوس ہوتا ہے گویا ہم اس کو ایک کمتر درجے کی چیز بنا کر پیش کر رہے ہیں، ایسی ایک کائنات کو خدا کی مخلوق ماننا اگر کسی کو خلافِ عقل معلوم ہوتا ہے تو اس سے زیادہ خلافِ عقل بات یہ ہے کہ اس کائنات کو بے خدا فرض کر لیا جائے۔

بعض لوگ کہتے ہیں کہ اگر خدا نے سب چیزیں پیدا کی ہیں تو خود خدا کو کس نے پیدا کیا ہے۔ مگر یہ ایک ایسا سوال ہے جو ہر حال میں پیدا ہوتا ہے، خواہ ہم خدا کو مانیں یا نہ مانیں۔ ہم دو میں سے کسی ایک چیز کو بلا سبب ماننے پر مجبور ہیں۔ یا خدا کو بے سبب مانیں، یا کائنات کو۔ ہمارے سامنے ایک عظیم کائنات ہے جس کو ہم دیکھتے ہیں، جس کو ہم محسوس کرتے ہیں۔ مجبور ہیں کہ اس کائنات کے وجود کو تسلیم کریں۔ ہم اس کا انکار نہیں کر سکتے۔ پھر ہم یا تو یہ کہیں کہ کائنات خود سے وجود میں آگئی ہے یا یہ کہیں کہ کوئی اور ہستی ہے جس نے اس کو بنایا ہے، دونوں صورتوں میں ہم کسی نہ کسی کو بلا سبب تسلیم کریں گے۔ پھر کیوں نہ ہم خدا کو بلا سبب مان لیں جس کو ماننے کی صورت میں ہمارے تمام سوالات کا جواب مل جاتا ہے۔ جب کہ کائنات کو بلا سبب ماننے کی شکل میں کوئی مسئلہ حل نہیں ہوتا۔ وہ تمام سوالات جو اس مسئلے کے ارد گرد پیدا ہوتے ہیں وہ سب کے سب بدستور باقی رہتے ہیں ——

بعض لوگوں نے فلسفیانہ موشگافی کے ذریعہ یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ کائنات کوئی چیز ہی نہیں ہے۔ سب کچھ صرف ہمارا وہم ہے، مگر ایک شخص جب یہ بات کہتا ہے تو ٹھیک اسی وقت وہ کائنات کے وجود کو تسلیم کر لیتا ہے۔ آخر یہ

سوال ہی کیوں پیدا ہوا کہ کائنات کوئی چیز ہے یا نہیں۔ سوال کا پیدا ہونا خود ظاہر کرتا ہے کہ کوئی چیز ہے جس کے بارے میں سوال درپیش ہے، اور کوئی ہے جس کے ذہن میں یہ سوال پیدا ہو رہا ہے۔ اس طرح فلسفۂ تشکیک بیک وقت انسان اور کائنات دونوں کو تسلیم کرلیتا ہے۔

خدا کے ساتھ ہمارا تعلق

خدا کو ماننے کے بعد فوراً یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اس کے ساتھ ہمارا تعلق کیا ہے۔ پچاس سال پہلے یہ خیال کیا جاتا تھا کہ اگر خدا کا کوئی وجود ہے بھی تو اس سے ہمارا تعلق نہیں ہو سکتا، مگر جدید کوانٹم نظریہ کے ذریعہ خود سائنس نے اسکی تردید کردی ہے۔ پہلے یہ سمجھا جاتا تھا کہ کائنات ایک مشین ہے جو ایک مرتبہ حرکت دینے کے بعد مسلسل چلی جارہی ہے۔ اس نظریے پر سائنس دانوں کو اسقدر یقین تھا کہ انیسویں صدی کے آخر میں برلن کے پروفیسر مارکس پلانک نے جب روشنی کے متعلق بعض ایسی تشریحات پیش کیں جو کائنات کے مشین ہونے کو غلط ثابت کررہی تھیں تو اس پر سخت تنقیدیں ہونے لگیں، اور اس کا مذاق اڑایا گیا، مگر اس نظریے کو زبردست کامیابی ہوئی اور بالآخر وہ ترقی کرکے جدید کوانٹم نظریہ کی صورت میں آج علم طبیعیات کے اہم اصولوں میں شمار کیا جاتا ہے[1]

پلانک کا نظریہ اپنی ابتدائی شکل میں یہ تھا کہ قدرت چھلانگوں کے ذریعہ حرکت کرتی ہے ۱۹۱۷ء میں آئن شٹائن نے اس بات کی وضاحت کی کہ پلانک کا نظریہ صرف عدم تسلسل ثابت نہیں کرتا بلکہ زیادہ انقلاب انگیز نتائج کا حامل ہے۔ یہ اصولِ تعیین کو اس

---

[1] تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو۔ ماڈرن سائنٹفک تھاٹ، صفحات ۱۷ ۔۔ ۲

کے بلند مقام سے معزول کر رہا ہے۔ جو اس سے پہلے عام فطرت کے تمام واقعات کا رہنما سمجھا جاتا تھا۔ قدیم سائنس نے بڑے وثوق سے اعلان کیا تھا کہ قدرت صرف ایک ہی راستہ اختیار کر سکتی ہے جو سبب اور نتیجے کی مسلسل کڑیوں کے مطابق اس کے آغاز سے لے کر انجام تک معیّن ہو چکا ہے۔ مگر اب معلوم ہوا کہ یہ محض ناقص مطالعہ کا نتیجہ تھا۔ پہلے یہ کہا جاتا تھا کہ خدا کو اگر ماننا ہی ہے تو سببِ اوّل کے طور پر اسے مان لو ورنہ آج کائنات کو خدا کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ اب معلوم ہوا کہ کائنات صرف حرکتِ اوّل کے لیے کسی محرک کی محتاج نہیں تھی، بلکہ وہ ہر آن حرکت دیئے جانے کی محتاج ہے۔ کوانٹم نظریہ دوسرے لفظوں میں یہ بتاتا ہے کہ کائنات ایک خود چالو مشین نہیں ہے، بلکہ وہ ایک ایسی مشین ہے جس کو ہر آن چلایا جا رہا ہے۔ ایک حی وقیوم ہستی کا مسلسل فیضان ہے جو اس کو باقی رکھے ہوئے ہے۔ اگر ایک لمحے کے لیے بھی وہ اپنا فیضان واپس لے لے تو ساری کائنات اس طرح ختم ہو جائے گی، جیسے سینما گھر میں بجلی کا سلسلہ ٹوٹنے سے پردۂ سیمیں کے سارے واقعات غائب ہو جاتے ہیں، اور ناظرین کے سامنے ایک سفید کپڑے کے سوا اور کچھ نہیں رہتا۔ گویا اس دنیا کا ہر ذرّہ اپنے وجود اور حرکت کے لیے ہر آن قادرِ مطلق سے اجازت طلب کرتا ہے۔ اس کے بغیر وہ اپنی ہستی کو قائم نہیں رکھ سکتا۔

کائنات کے ساتھ خدا کا یہ تعلق خود بتاتا ہے کہ انسان کے ساتھ اس کا تعلق کیا ہونا چاہیئے ظاہر ہے کہ جس نے ہمیں خلق کیا ہے، جو ہمارے لیے تمام موزوں ترین حالات کو مسلسل باقی رکھے ہوئے ہے اور ان کو ہمارے حق میں ہموار کرتا رہتا ہے جو ہر آن ہماری پرورش کر رہا ہے۔ اس کا ہمارے اوپر یہ لازمی حق ہے کہ

ہم اپنے مقابلے میں اس کی برتر حیثیت کو تسلیم کریں ۔ اور بالکل اس کے بندے بن جائیں ۔ انسان جن قدروں سے واقف ہے ، ان میں سب سے نمایاں اور اہم ترین قدر یہ ہے کہ احسان کرنے والے کا احسان مانا جائے ۔ محسن خواہ اپنی طرف سے نہ دبائے مگر جو احسان مند ہے وہ خود اس کے سامنے دب جاتا ہے ۔ محسن کے آگے اس کو نظر اٹھانے کی ہمت نہیں ہوتی ۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ خدا کا خدا ہونا خود ہی اس بات کا تقاضا کرتا ہے کہ ہم اس کی خدائی کو تسلیم کریں اور اس کی مرضی پوری کرنے کو اپنی زندگی کا مقصد بنائیں ۔ بندے کی طرف سے خدا کی اطاعت کے لئے اس کے سوا کسی اور دلیل کی ضرورت نہیں ۔

مگر بات صرف اتنی ہی نہیں ہے ، یہ صرف حق شناسی کا تقاضا نہیں ہے کہ ہم خدا کی خدائی اور اس کے مقابلے میں اپنی بندگی کو تسلیم کریں ۔ حقیقت یہ ہے کہ ہمارے لئے اس کے سوا کوئی راہ بھی نہیں ہے ۔ ہماری زندگی کے سارے مسائل خدا سے متعلق ہیں ۔ ہم کو جو کچھ ملے گا ، اسی سے ملے گا ، اس کے سوا کوئی اور ہمیں کچھ نہیں دے سکتا ۔ ہم اس کائنات میں اس قدر عاجز اور مجبور ہیں کہ خدا کی مدد کے بغیر ایک لمحہ کے لئے اپنا وجود باقی نہیں رکھ سکتے ۔ پھر خدا کو چھوڑ کر آخر ہم اور کہاں جا سکتے ہیں ۔

ذرا غور کیجئے یہ ہندوستان کی شمالی سرحد پر ہمالیہ پہاڑ کا ڈھائی ہزار میل لمبا سلسلہ کس نے قائم کیا ہے ۔ ہم نے یا خدا نے ۔ ؟ اگر ہمالیہ پہاڑ نہ ہوتا تو خلیج بنگال سے اٹھنے والی جنوب مشرقی ہوائیں جو ہر سال ہمارے لئے بارش لاتی ہیں ۔ بالکل پانی نہ برساتیں اور سیدھی روس کی طرف نکل جاتیں جس کا نتیجہ یہ ہوتا کہ تمام شمالی

ہندوستان منگولیا کی طرح ریگستان ہوتا۔

آپ کو معلوم ہے کہ سورج اپنی غیر معمولی کشش سے ہماری زمین کو کھینچ رہا ہے، اور زمین ایک مرکز گریز قوت کے ذریعہ اس کی طرف کھنچ جانے سے اپنے آپ کو روکتی ہے اور اس طرح وہ سورج سے دور رہ کر فضا کے اندر اپنا وجود باقی رکھے ہوئے ہے۔ اگر کسی دن زمین کی یہ قوت ختم ہو جائے تو وہ تقریباً چھ ہزار میل فی گھنٹہ کی رفتار سے سورج کی طرف کھنچنا شروع ہو جائے گی، اور چند ہفتوں میں سورج کے اندر اس طرح جا گرے گی جیسے کسی بہت بڑے الاؤ کے اندر کوئی تنکا گر جائے۔ ظاہر ہے کہ زمین کو یہ طاقت ہم نے نہیں دی ہے بلکہ اس خدا نے دی ہے جس نے زمین کو پیدا کیا ہے۔

کائنات کے جس حصے میں ہم رہتے ہیں اس کا نام نظام شمسی ہے، اگر آپ کسی دور دراز مقام پر بیٹھ کر اس نظام کا مشاہدہ کر سکیں تو آپ دیکھیں گے کہ انتھاہ خلا کے اندر ایک آگ کا گولا بھڑک رہا ہے جو ہماری زمین سے تیرہ لاکھ گنا بڑا ہے۔ جس سے اتنے بڑے بڑے شعلے نکلتے ہیں جو کئی کئی لاکھ میل فضا میں اڑتے چلے جاتے ہیں، اسی کا نام سورج ہے۔ پھر آپ ان سیاروں کو دیکھیں گے جو سورج کے چاروں طرف اربوں میل کے دائرے میں پروانوں کی طرح چکر لگا رہے ہیں ان دوڑتی ہوئی دنیاؤں میں ہماری زمین نسبتاً ایک چھوٹی دنیا ہے جس کی گولائی تقریباً پچیس ہزار میل ہے۔ یہ ہمارا نظام شمسی ہے جو بظاہر بہت بڑا معلوم ہوتا ہے، مگر کائنات کی وسعت کے مقابلے میں اس کی کوئی حیثیت نہیں۔ کائنات میں اتنے بڑے بڑے ستارے ہیں جن کے اوپر ہمارا پورا نظام شمسی رکھا جا سکتا

ہے۔ اس بے انتہا وسیع اور عظیم کائنات میں ہماری زمین فضا میں اڑنے والے ذرّے سے بھی زیادہ حقیر ہے۔ ہم ایک چھوٹے سے کیڑے کی مانند اس ذرّے سے چمٹے ہوئے ہیں اور خلا میں ایک کبھی نہ ختم ہونے والے سفر میں مصروف ہیں۔

یہ کائنات کے اندر ہماری حیثیت ہے، غور کیجئے انسان کس درجہ حقیر ہے اور خارجی طاقتوں کے مقابلے میں کس قدر عاجز ہے۔ پھر جب ہماری حیثیت یہ ہے تو ہم خالقِ کائنات سے مدد طلب کرنے کے سوا اور کیا کر سکتے ہیں۔ جس طرح ایک چھوٹے بچےّ کی ساری کائنات اس کے ماں باپ ہوتے ہیں، اس کی زندگی، اسکی ضرورتوں کی تکمیل اور اس کے مستقبل کا انحصار بالکل اس کے والدین کے اوپر ہوتا ہے۔ اسی طرح بلکہ اس سے کہیں زیادہ انسان اپنے رب کا محتاج ہے۔ ہم خدا کی مدد اور اس کی رہنمائی کے بغیر اپنے لئے کسی چیز کا تصور نہیں کر سکتے وہی ہمارا سہارا ہے اور اسی کی طرف ہمیں دوڑنا چاہیئے۔

اس تفصیل سے یہ بات واضح ہوگئی کہ انسان خدا کی رہنمائی اور اس کی مدد کا محتاج ہے خدا کی طرف سے انسان کی یہی حیثیت قرار پاتی ہے۔ اور خود انسان کے لئے بھی اس کے سوا چارہ نہیں ہے کہ وہ خدا سے اپنے لئے مدد اور رہنمائی کی درخواست کرے۔

معرفت کا حصول

یہاں پہنچ کر جب ہم اپنے گرد وپیش کی دنیا پر غور کرتے ہیں تو ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ کائنات کے خالق کی طرف سے اپنی مخلوقات کے لئے مدد اور رہنمائی کا ایک مستقل عمل جاری ہے۔ جس کو جس چیز کی ضرورت ہے اس کو وہ چیز پہنچائی جا رہی ہے ایک معمولی بھڑ کی مثال لیجئے۔

جانوروں کی دانائی

بھڑ کا طریقہ ہے کہ وہ انڈے دینے سے پہلے زمین میں ایک گڑھا کھودتی ہے۔ اور ایک ٹڈے کو قابو میں کرکے اس کو گڑھے میں رکھ دیتی ہے، ایسا کرنے وقت وہ نہایت صحت کے ساتھ ٹڈے کے اس خاص عصبی مقام پر ڈنگ مارتی ہے جس سے ٹڈا مرتا نہیں صرف بے ہوش رہتا ہے اور تازہ گوشت کا ذخیرہ بن جاتا ہے[1]۔
بھڑ اب اس بیہوش ٹڈے کے ارد گرد انڈے دیتی ہے تاکہ انڈوں سے نکل کر بچے اس زندہ ٹڈے کو دھیرے دھیرے کھاتے رہیں۔ کیونکہ مردہ گوشت ان بچوں کے لئے مہلک ہے۔ اتنا انتظام کر لینے کے بعد بھڑ وہاں سے اڑ جاتی ہے۔ اور پھر کبھی آکر اپنے بچوں کو نہیں دیکھتی۔ مگر اس کے باوجود بھڑ کا یہ بچہ جب بڑا ہوتا ہے تو وہ بھی ٹھیک ٹھیک اسی عمل کو دہراتا ہے۔ ساری بھڑیں اس کام کو زندگی میں ایک بار اور پہلی بار بالکل ٹھیک ٹھیک انجام دیتی ہیں، غور کیجیے کہ وہ کون ہے جو اس بھڑ کے بچے کو سکھاتا ہے کہ اپنی نسل کو جاری رکھنے کے لئے وہ بھی آئندہ وہی عمل کرے جو اس کے ماں باپ نے اس کے ساتھ کیا تھا۔ حالانکہ اپنے ماں باپ کے عمل کو اس نے کبھی نہیں دیکھا۔

دوسری مثال اس لمبی مچھلی کی ہے جسے انگریزی میں ایل کہتے ہیں۔ یہ عجیب وغریب جاندار اپنی زندگی کی جوانی میں ہر جگہ کے آبی مرکزوں اور ندیوں سے نکل نکل کر جزیرہ موڑا کے پاس سمندر کے ایک گہرے تہہ میں جاتے ہیں۔ یورپ کی

---

[1] اسی حیرت انگیز عمل کو دیکھ کر فلسفی برگساں نے کہا تھا "کیا بھڑ نے کسی مدرسے میں ماہر عضویات کی تعلیم حاصل کی ہے"!

ایلین اٹلانٹک میں تین ہزار میل کا راستہ طے کر کے یہاں پہنچتی ہیں۔ وہیں یہ سب مچھلیاں بچے دے کر مر جاتی ہیں۔ یہ بچے جب آنکھ کھولتے ہیں تو اپنے آپ کو ایک سنسان آبی مرکز میں پڑا ہوا پاتے ہیں۔ ان کے پاس بظاہر معلومات حاصل کرنے کا کوئی ذریعہ نہیں ہوتا، پھر بھی وہ وہاں سے لوٹ کر دوبارہ انہیں کناروں پر آ لگتے ہیں جہاں سے ان کے والدین چلے گئے تھے۔ وہ آگے بڑھتے ہوئے اپنے ماں باپ والی ندیوں جھیلوں اور آبی مرکزوں میں پہنچ جاتے ہیں، یہی وجہ ہے کہ کسی بھی آبی مرکز سے ایلیں ہمیشہ کے لئے غائب نہیں ہو جاتیں۔ اور یہ سب کچھ اس طرح ہوتا ہے کہ امریکہ کی کوئی ایل یورپ میں نہیں ملتی اور نہ یورپ کی کوئی ایل امریکہ کے سمندروں میں پائی جاتی ہے، آمد و رفت کی یہ معلومات انہیں کہاں سے حاصل ہوتی ہیں۔

پیغام رسانی کا عظیم ذریعہ

یہ کام "وحی" کے ذریعہ ہوتا ہے۔ وحی، پیغام رسانی کے اس مخفی سلسلے کو کہتے ہیں جو خدا اور اس کی مخلوقات کے درمیان جاری ہے۔ کوئی مخلوق زندگی گذارنے کے لئے کیا کرے اور خالقِ کائنات نے اپنی مجموعی سکیم کے اندر اس کے ذمے جو فرض عائد کیا ہے۔ اس کو کس طرح انجام دے، اسی کو بتانے کا نام وحی ہے۔ اس وحی کی دو قسمیں ہیں، ایک وہ جس کا تعلق انسان کے سوا دوسری مخلوقات سے ہے، اور دوسری وہ جس کا تعلق انسان سے ہے ——— انسان کے سوا جتنی زندہ مخلوقات اس زمین پر پائی جاتی ہے۔ وہ سب کی سب ارادے سے خالی ہے۔ ان کا کام کسی سوچے سمجھے فیصلے اور ارادے کے تحت نہیں ہوتا بلکہ ایک غیر شعوری قسم کے طبعی میلان کے تحت ہوتا ہے جس کو ہم جبلت کہتے ہیں۔ یہ گویا ایک طرح کی زندہ مشینیں ہیں جو محدود دائرے میں اپنا متعین عمل کر کے ختم ہو جاتی ہیں۔ اس قسم کے جاندار دنیا

کے لئے ترک و اختیار کا کوئی سوال نہیں۔ اس لئے ان کے پاس جو وحی آتی ہے وہ حکم اور قانون کی شکل میں نہیں آتی بلکہ جبلت یا عادتِ فطری کی شکل میں آتی ہے۔ ان کی ساخت اس طرز کی بنادی جاتی ہے کہ وہ ایک مخصوص کام کو بار بار دہراتے رہیں۔ مگر انسان ایسی مخلوق ہے جو فیصلے کی قوت رکھتا ہے۔ وہ اپنے ارادے سے کسی کام کو کرتا ہے اور کسی کام کو نہیں کرتا۔ وہ ایک کام کرنا شروع کرتا ہے پھر اسے بالقصد چھوڑ دیتا ہے اور ایک کام نہیں کرتا اور بعد کو اسے کرنے لگتا ہے اس سے ظاہر ہوا کہ انسان بھی اگرچہ اسی طرح خدا کا بندہ ہے جس طرح اس کی دوسری مخلوقات، مگر اس کو حالتِ امتحان میں رکھا گیا ہے۔ جو کام دوسری مخلوقات سے عادتِ فطری کے تحت لیا جارہا ہے۔ انسان کو وہی کام اپنے فیصلے اور ارادے سے کرنا ہے یہی وجہ ہے کہ انسان کے پاس وحی آتی ہے وہ حکم اور قانون کی شکل میں آتی ہے۔ دوسرے لفظوں میں عام حیوانات پر وحی ان کی فطرت میں پیوست کردی گئی ہے۔ اور انسان کی وحی خارج سے اسے دی جاتی ہے۔ عام حیوانات کو کیا کرنا ہے۔ اس کا علم وہ پیدائشی طور پر اپنے ساتھ لے کر آتے ہیں اس کے برعکس انسان جب عقل و ہوش کی عمر کو پہنچتا ہے تو خدا کی طرف سے پکار کر اسے بتایا جاتا ہے کہ تم کو کیا کرنا چاہیئے اور کیا نہیں کرنا چاہیئے —— اس پیغام رسانی کا ذریعہ رسالت ہے، جو شخص یہ پیغام لیکر آتا ہے اس کو ہم رسول کہتے ہیں۔ اس کا طریقہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے بندوں میں سے ایک نیک بندے کو چن لیتا ہے اور اس کے قلب پر اپنا پیغام اتارتا ہے اس طرح وہ شخص براہِ راست خدا سے اسکی مرضی کا علم حاصل کرکے دوسرے انسانوں تک پہنچاتا ہے۔ رسول گویا وہ درمیانی

کڑی ہے جو بندے کو اس کے خدا سے جوڑتی ہے۔

خدا و رسول

مولانا نعیم صدیقی لکھتے ہیں:-

"دنیا میں ایسے ناقص ذہن کے لوگ کم ہی پائے گئے ہیں —— اور اس دور الحاد میں بھی کم ہیں —— جو مطلقاً خدا کی ہستی کا انکار کرنیوالے ہوں۔ آدمی جس کائنات میں پیدا ہوتا ہے اور زندگی گزارتا ہے۔ وہ اپنے بنانے والے کے وجود پر اتنی بدیہی شہادتیں اپنے اندر رکھتا ہے کہ انکا انکار کرنے کیلئے سخت درجے کی بلادتِ ذہن اور ایک انتہائی اندھے پن کی ضرورت ہے۔ پوری کائنات تو بڑی چیز ہے۔ اس عجائب خانے کا ہر شعبہ اور ہر حصہ، اس کُل کا ہر پرزہ، اس تعمیر کا ہر ذرہ، انسانی بصیرت کیلئے ایک ایسا ورقِ معرفت ہے کہ جسکی آیات اپنے مطالعہ کرنیوالے کو صرف اس حقیقت تک لے جاکر نہیں چھوڑ دیتیں کہ سورجوں اور چاندوں، دریاؤں اور پہاڑوں، ہواؤں اور گھٹاؤں، بجلیوں اور خرمنوں، کلیوں اور کانٹوں، چوپایوں اور پرندوں کی اس دنیا کا ایک بنانے والا ہے۔ بلکہ یہ آیات دنیا کے خالق کی بہت سی صفات کو بھی واضح کر دیتی ہیں۔ مادّے اور قوت کا یہ کارخانہ بول بول کر کہہ رہا ہے کہ اس کا بنانیوالا اور چلانے والا کُلی ارادہ و اختیار کا مالک ہے۔ وہ علیم و خبیر اور سمیع و بصیر ہے۔ وہ حکیم اور دانا ہے۔ وہ رحیم و کریم ہے۔ وہ عالم الغیب والشہادۃ ہے وہ فوق الفوق اور وراء الوراء ہے۔ وہ بے نیاز اور غیر محتاج ہے۔ وہ حیّ و قیوم ہے۔ وہ قائم و دائم ہے۔ وہ واحد و یکتا ہے! دنیا کے اس درسِ معرفت کو جھٹلانے کے بعد پھر اس قفل کی کوئی کلید نہیں رہتی۔ پھر اس معمے کا کوئی حل نہیں رہتا۔ پھر اس الجھاؤ کو سلجھانے کی کوئی فکری بنیاد باقی نہیں رہتی۔ پھر اس لفظ میں کوئی معنی

پیدا نہیں کیے جا سکتے۔ پھر اس کُل کے اجزاء میں کوئی منطقی ربط قائم نہیں کیا جا سکتا پھر اس غزل کا نہ کوئی مطلع و مقطع رہتا ہے۔ نہ وزن و بحر اور نہ قافیہ و ردیف۔ چنانچہ انسانیت من حیثیت المجموع، یا بالفاظ دیگر بنی آدم کے نوعی ذہن نے ہمیشہ خدا کے وجود کو مانا ہے۔ اور اس حد تک اسکی صفات کو بھی تسلیم کیا ہے۔

لیکن کائنات کی آیات جب انسان کو یہاں پہنچا دیتی ہیں۔ تو ایک اہم تر سوال خود بخود اٹھ کھڑا ہوتا ہے اور وہ یہ کہ اگر خدا ہے۔ تو اس سے انسان کا رشتہ کس نوعیت کا ہے؟ آیا اسکے کچھ مطالبات انسان سے ہیں؟ آیا وہ کوئی ذمہ داری اس پر ڈالتا ہے؟ آیا وہ اس سے کسی امر میں اطاعت و تسلیم چاہتا ہے؟ آیا وہ اسے کوئی ضابطہ و قانون دیتا ہے؟ آیا وہ اس سے کوئی حکم منوانا چاہتا ہے۔ اور کسی سے اسے روکتا ہے؟ آیا وہ کسی بات سے خوش یا ناخوش ہوتا ہے؟ اگر ہوتا ہے تو کن باتوں سے؟ اسکی مرضی کیا ہے؟ اسکی پسند و ناپسند کیا ہے؟

انبیاء کی دعوت کا عنوان

اس سوال کا جواب دینے کیلئے کبھی ایسا نہیں ہوا کہ خدا خود زمین پر اتر آیا ہو۔ پھر وہ ایک ایک فردِ انسانی کے پیچھے اپنی دعوت لئے دوڑتا پھرے۔ بلکہ انسانی ہدایت کیلئے اس نے انسانوں ہی میں سے رہنما اٹھائے اور انسانی نظام تہذیب و تمدّن کو صالح بنیادوں پر استوار کرانے کیلئے اس نے خود انہی میں سے معمار کھڑے کئے۔ اصل میں آدمی کی فطرت اور اسکی ساخت ایسی نہیں ہے کہ حقیقتِ مطلق کا ادراک براہِ راست کر سکے۔ اسکے حواس اطلاق کی فضاؤں میں بالکل جواب دے دیتے ہیں۔ وہ کسی پیغام کو بھی اخذ کر سکتا ہے کہ وہ تعینات و تحدیدات کے سانچوں میں ڈھال کے اس کے سامنے لایا جائے۔ یہی نہیں۔ اسکی فطرت کے تقاضے اسطرح بھی پورے نہیں ہو

سکتے کہ فرشتے اسکے سامنے دعوت کا علم اٹھائیں اور اسکی قیادت کا فرض سرانجام دیں اسکا محدود دماغ اپنی فکر کے چراغ براہِ راست انوارِ الٰہی سے کبھی روشن نہیں کر سکا۔ بلکہ وہ ایمان و عقیدہ کے دیے صرف اس شعلۂ حقیقت سے جلا سکا ہے۔ جو اللہ تعالٰی نے انبیاء کے انسانی دماغوں ہی کے اندر فروزاں کیا ہے۔ آدمی کو جو کان دیئے گئے ہیں۔ وہ اللہ کی آواز کو اسی صورت میں سن سکتے ہیں۔ جبکہ وہ انسانی منطق سے بلند ہوئی ہو۔ اسکے جذبات میں تاثر جبھی پیدا ہوتا ہے۔ جبکہ اللہ کی پسند و ناپسند پہلے انبیاء کے اندر مطلوبہ جذبات کی لہریں اٹھا دے۔ وہ اخلاقی نمونہ اگر حاصل کر سکتا ہے۔ اور سیرت کا کوئی چربہ لے سکتا ہے۔ تو نہ براہِ راست اللہ تعالٰی سے۔ اور نہ اسکے فرشتوں یا کسی فوق الانسانی مخلوق سے۔ بلکہ اپنے ہی جیسے انسانی افراد سے لے سکتا ہے۔ وہ جب کبھی بھی اللہ کے دین کی بنیادوں پر منظم ہوا ہے۔ تو اپنی فطرت کی محدودیتوں کی وجہ سے خود اپنی ہی کی طرح کے کسی انسان کے گرد منظم ہوا ہے۔ اور اسلامی انقلاب کا سپاہی جب بھی وہ بنا ہے تو اپنے ابنائے نوع کے زیر قیادت ہی بنا ہے۔ انسانی فطرت کی انہی خصوصیات کے لحاظ سے اللہ تعالٰی نے ہر دور میں بہترین افرادِ انسانی کو اس مقصد کیلئے منتخب کیا ہے کہ ایک طرف انکے قلوب اللہ تعالٰی سے الہام و القاء حاصل کریں اور دوسری طرف وہ عام انسانوں کیلئے الہامی دعوت کے دیانتدار ترجمان اور انسانی پیکر میں اسکے تفصیلی تقاضوں کا عملی مظہر ہوں۔

اطاعتِ رسالت

پس کائنات خدا کے وجود اور اسکی بعض صفات کی گواہی دیدینے کے بعد انسان کو جس مقام پر چھوڑ دیتی ہے۔ اس مقام سے آگے چلنے کیلئے یعنی خدا کی مرضی اسکی ہدایت۔ اسکے قانون، اسکی پسند و ناپسند کو معلوم کر کے زندگی کو اسکے مطابق بنانے

کیلئے انبیاء کا مرہونِ منت ہوئے بغیر چارہ نہیں۔ خدا کی ہستی کی محدود سی معرفت کیلئے تو انفس و آفاق کی آیات مدد دیتی ہیں۔ لیکن اسکی اطاعت کیلئے رسالت کا دامن تھامنا ناگزیر ہے۔ دوسرے لفظوں میں انسانی زندگی کی صلاح و فلاح مجرد ایمان باللہ پر منحصر نہیں ہے۔ بلکہ ایمان بالرسالت بنیادی طور پر اسکے لئے ضروری ہے۔ فکر کا نہاں خانہ اگر مظاہرِ کائنات کے چراغوں سے کسی قدر روشن ہو بھی جائے تو بھی عمل کی وادیاں اسوقت تک اندھیاری رہتی ہیں۔ جب تک کہ انبیاء کے جلائے ہوئے دیوں سے انکو منوّر نہ کیا جائے۔ محض خدا کے تصور کے بل پر زندگی ـــــ اور نظامِ زندگی ـــــ کی تعمیر ممکن نہیں ہے۔ بلکہ خدا کے تصور کو سنگِ اساس کی حیثیت دیکر جب اس تعمیر کو برپا کرنا ہو تو اسکا سارا مسالہ اور اسکا فنِ تعمیر اور اسکا نقشۂ تعمیر صرف انبیاء ہی کے ذریعہ مل سکتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اسلامی فکر کے حاملین نے بالاتفاق یہ حقیقت تسلیم کی ہے کہ ایمان بالرسالت کے بغیر ایمان باللہ بے کار ہے۔ جیسے کسی شہنشاہ کی وفاداری کا اقرار بغیر اسکے مقرر کردہ وائسرائے یا گورنر یا چیف جسٹس یا کمانڈر انچیف کی وفاداری عملاً بیکار ہے۔ مجرد ایمان باللہ (بلکہ یوں کہیئے کہ ایمان بر ذاتِ الٰہی) ایک جامد عقیدہ ہے کہ جس سے نہ عملی زندگی کا درخت نمودار ہو سکتا ہے اور نہ اس پر پھل آسکتا ہے۔ اس عقیدے کے بیج سے اگر عملی زندگی کا درخت اُگ سکتا ہے۔ اور اگر اس پر برگ و بار آسکتا ہے تو صرف اسطرح کہ تعلیماتِ انبیاء سے اسکی آبیاری کیجائے محض ایمانِ طالبہ سے تصوف پیدا ہو سکتا ہے۔ یوگ پیدا ہو سکتا ہے۔ رہبانیت پیدا ہو سکتی ہے۔ لیکن کوئی نظامِ زندگی، کوئی تہذیب، کوئی معاشرت، کوئی تمدن اور کوئی معیشت پیدا نہیں ہو سکتی۔ ایمان باللہ سے نظامِ زندگی اس صورت میں رونما ہوتا ہے جبکہ ایمان بالرسالت ساتھ ساتھ موجود ہو۔"

---

(۱۳)

دورِ جدید کے تازہ خدا

(از سیّد محمد قطب المصری)

بت پرستی کی لعنت

آج دنیا کی نصف آبادی عہد قدیم کی طرح بت پرستی کی لعنت میں گرفتار ہے۔ بھارت، چین اور دنیا کے کئی اور ممالک کی مثال اس سلسلہ میں پیش کی جاسکتی ہے۔ رہی باقی دنیا، تو اس کا غالب حصّہ ایک اور معبود باطل کے دام فریب میں گرفتار ہے۔ اس نئے معبود باطل نے انسانی افکار و جذبات کی دنیا میں عہد قدیم کی بت پرستی سے کچھ کم بگاڑ پیدا نہیں کیا۔ آج کے انسان کو سیدھی راہ سے بھٹکانے میں اس کا بہت بڑا حصّہ ہے۔ اس تازہ معبود باطل کا اصطلاحی نام ہے ——— جدید سائنس!

اہل مغرب کی تنگ نظری

کائنات کے بارے میں معلومات حاصل کرنے کا وسیلہ ہونے کے لحاظ سے سائنس کو بے پناہ اہمیت حاصل ہے۔ اور اسی اعتبار سے اسکے ابتک کے کارناموں کی فہرست بھی بڑی مرعوب کن ہے۔ مگر اسکی یہ ساری کامیابیاں اسوقت حسرتوں اور نامرادیوں میں بدل گئیں جبکہ اہل مغرب نے سائنس کو اُلوہیت کے مقام پر بٹھا دیا۔ اور اسے اپنی محبتوں، عقیدتوں اور اطاعتوں کا واحد مرکز بنالیا۔ اہل مغرب کی اسی افسوسناک غلطی کا نتیجہ یہ ہوا کہ انھوں نے تجرباتی سائنس EMPIRICAL SCIENCE کے تجربہ و مشاہدہ کے محدود

وسائل کے سوا علم و معلومات کے باقی وسائل سے اپنے آپ کو محروم کرلیا۔ اور انسانیت اپنی منزلِ مقصود کے قریب آنے کی بجائے اس سے اور دور ہوگئی۔ انسان کے سامنے ترقی اور سعی و جہد کے جو لامحدود امکانات تھے۔ وہ اہلِ مغرب کی تنگ نظری اور مادی سائنس کی ناگزیر محدودیتوں کی نظر ہو گئے کیونکہ سائنس جو عقل کے پروں سے اڑتی ہے۔ انسانیت کی بلند پروازی کا ساتھ نہیں دے سکتی۔ جو عقل اور روح دونوں سے مدد حاصل کرتی ہے۔ اور تب کہیں اپنے خالق کا قرب اور حقیقت نفس الامری کا واضح اور صحیح شعور حاصل کرنے کے قابل ہوتی ہے۔

سائنس کی مبالغہ آمیز اہمیت

سائنس کی برتری کے مدعی یہ بھی کہتے ہیں کہ صرف سائنس ہی انسان پر حیات و کائنات کے سربستہ راز منکشف کرسکتی ہے۔ اس لئے حقیقت اور صداقت وہ ہے جسکی تائید سائنس کرے۔ باقی سب خرافات اور دفتر بے معنی ہے۔ اپنے جوشِ بیان میں یہ حضرات یہ بھول جاتے ہیں کہ اپنے حیرت انگیز کارناموں کے باوجود سائنس ہنوز اپنے ابتدائی دور میں ہے۔ اب بھی بے شمار ایسے مسائل ہیں۔ جن کے بارے میں اس کی معلومات ناقص اور ناقابلِ اعتبار ہیں۔ کیونکہ اس کا دائرہ اثر محدود ہے۔ اس کا مشاہدہ سطحی ہے۔ اور اس میں یہ صلاحیت ہی نہیں ہے کہ وہ حقیقت کی تہ میں اتر سکے۔ لیکن یہ سب کچھ دیکھتے ہوئے بھی یہ حضرات دعویٰ کرتے ہیں کہ روح نام کی کوئی شئے سرے سے کوئی وجود ہی نہیں رکھتی۔ ان کے نزدیک اپنے حواس کی حدود کو پھلانگ کر کوئی انسان پردۂ غیب میں مستور دنیا سے اپنا رشتہ استوار ہی نہیں کرسکتا۔ خواہ یہ رشتہ

عالمِ خواب میں قائم ہو یا انتقالِ خیال[1] (Telepathy) اسکا واسطہ بنے۔ جدید دور میں روح کے وجود سے انکار کی بنیاد کسی تجربے یا مشاہدے پر ہرگز نہیں ہے بلکہ اسکی وجہ تجرباتی سائنس اور اسکے ناکافی اور غیر موزوں آلات کی نارسائی ہے۔ جس کے باعث وہ اسرارِ فطرت کی نقاب کشائی میں بری طرح ناکام رہی ہے۔ غالباً مشیت ایزدی کے نزدیک ان اعلیٰ حقائق کو انسانی ادراک کی براہِ راست گرفت سے باہر رکھنا ہی حکمت و مصلحت کا تقاضا تھا۔ مگر کم فہموں کے لیے۔ یہی بات ضلالت اور انکار کا باعث بن گئی ہے۔ اور وہ بزعمِ خویش یہ سمجھ بیٹھے کہ دنیا میں روح کا سرے سے کوئی وجود ہی نہیں ہے۔

دورِ حاضر کی علمی جہالت

الغرض یہ وہ "علمی جہالت" ہے۔ جس میں دورِ جدید کا انسان مبتلا ہے۔ اس سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ آج اسلام کی کتنی شدید ضرورت ہے کیونکہ صرف اسی طرح سے انسان جدید و قدیم خرافات کی دلدل سے نجات پا سکتا ہے۔ انسانی حماقت پہلے بت پرستی کی صورت میں ظاہر ہوتی تھی۔ اب وہی سائنس پرستی کی شکل میں موجود ہے۔ انسانی عقل و روح کو اسوقت تک حقیقی آزادی نصیب نہیں ہو سکتی۔ جب تک کہ وہ قدیم و

---

[1] انتقالِ خیال کو موجودہ دور میں ایک واقعہ تسلیم کیا جاتا ہے جسکی نمایاں تاریخی مثال حضرت عمرؓ کی ہے۔ ایک بار خطبہ جمعہ کے دوران آپنے یکایک سلسلہ بیان کو منقطع کر کے سینکڑوں میل دور اپنے فوجی کمانڈر ساریہؓ سے خطاب کیا اور فرمایا "اے ساریہؓ! پہاڑ کی جانب۔ اے ساریہؓ پہاڑ کی جانب" ! حضرت ساریہؓ نے سینکڑوں میل دور یہ الفاظ سنے اور فوراً پہاڑ کی سمت مڑ گئے۔ اور اسطرح آپ کی فوج دشمن سے محفوظ رہی۔ جو کمین گاہوں میں چھپا ہوا تھا۔

وجدید تمام خرافات سے آزاد نہ ہو۔ اور اسکی راہ صرف ایک ہے اور وہ ہے اسلام۔ یہی وہ مقام ہے۔ جہاں اسلام انسانیت کی واحد امید بن کر نمودار ہوتا ہے۔ اسلام ہی مذہب اور سائنس کی مزعومہ کشمکش کو مصالحت میں بدل سکتا ہے۔ اور بالآخر اسی مصیبت زدہ دنیا کو امن و سلامتی سے مالا مال کرسکتا ہے۔ جس کو وہ اہل مغرب کی حماقتوں کے طفیل کھو چکی ہے۔

یورپ اور قدیم یونان

جدید یورپ قدیم یونان کا تہذیبی وارث ہے۔ یہ تہذیبی ورثہ رومن ایمپائر کی وساطت سے یورپ تک پہنچا۔ قدیم یونانی تہذیب میں انسان اور اسکے دیوتاؤں کے باہمی تعلقات کی تصویر بڑی بھیانک ہے۔ وہ ایک دوسرے کے مخالف اور دشمن ہیں۔ ان میں مستقل ٹکراؤ اور کھینچا تانی کی کیفیت نظر آتی ہے۔ چنانچہ قدرت کے سربستہ رازوں کو افشا کرنے میں انسان کو جو کامیابیاں حاصل ہوئی ہیں۔ وہ اسکے نزدیک دیوتاؤں کی عاجزی اور بے بسی کی غماز ہیں۔ اور انسان سے بزور چھینا جھپٹی کرکے ان سے حاصل کی ہیں۔ ورنہ اگر ان حاسد اور بے بس تعداؤں کا بس چلتا تو وہ کبھی انسان کو تحقیق و اکتشاف کے کسی شعبہ میں کامیاب نہ ہونے دیتے۔ اور انسان ان ساری آسائشوں اور سہولتوں سے محروم ہو جاتا۔ جو قدرت کے خزانوں پر دسترس پانے کے نتیجے میں اسکو حاصل ہیں اس یونانی نقطۂ نظر سے سائنس کی ہر نئی کامیابی اپنے حاسد دیوتاؤں کے خلاف انسان کی فتح و کامرانی کا نیا اعلان اور اسکی برتری کا اثبات ہے۔

یورپ کی تہذیبی روح

یونانی تہذیب کی یہی وہ خبیث روح ہے۔ جو جدید یورپ کے تحت الشعور میں اب بھی کارفرما ہے۔ اس

کا اظہار کہیں تو حقائق و واقعات کی تعبیر و توجیہ میں ہوتا ہے۔ اور کہیں خدا کے بارے میں یورپی رویے میں۔ یہی وجہ ہے کہ جدید یورپی سائنس دان سائنس کی کامرانیوں کو کچھ اس انداز سے پیش کرتا ہے کہ گویا یہ انسان نے کسی برتر قوت سے لڑکر حاصل کی ہیں اور ان کے نتیجے میں فطرت کی قوتوں کو اپنا تابع بنالیا ہے۔ چنانچہ اَن دیکھے خدا کے سامنے انسان جس عجز و نیازمندی کا اظہار کرتا چلا آیا ہے۔ اسکی اصل وجہ اسکے نزدیک انسان کا اپنا "احساسِ عجز" ہے۔ مگر سائنس کو فطرت کے خلاف جو بے پناہ کامیابیاں حاصل ہو رہی ہیں۔ ان کے نتیجے میں یہ انسانی احساسِ عجز رفتہ رفتہ خود بخود مٹ جائیگا۔ اور بالآخر وہ دن بھی آجائیگا۔ جب انسان خود اپنا خدا ہوگا۔ مگر اسکے لئے ضروری ہے کہ انسان کو حیات و ممات کے تمام سربستہ راز معلوم ہوں۔ اور وہ تجربہ گاہ میں حیات کی تخلیق پر قادر ہو۔ اسی لئے آج کا سائنس دان تجربہ گاہ میں زندگی کی تخلیق کو اولین اہمیت دیتا ہے۔ کیونکہ اسکے خیال میں یہ کارنامہ انجام دینے کے بعد اس میں اور ان دیکھے خدا میں کوئی فرق باقی نہیں رہیگا۔ اور وہ اپنے سوا کسی اور کے رو برو جھکنے کی ضرورت سے بے نیاز ہو جائیگا۔

امید کی آخری کرن

جدید مغربی دنیا آج جن روحانی امراض میں مبتلا ہے۔ یہ ان میں سب سے زیادہ خطرناک ہے۔ اس نے انسان کی زندگی کو عذاب بنا دیا ہے۔ انسانیت کو افتراق و انتشار کے جہنم میں جھونک رکھا ہے۔ انسان آپس ہی میں ایک دوسرے سے دست و گریبان ہو رہے ہیں۔ زندگی میں امن و سکون اور اطمینان باقی ہے۔ اور نہ حسن و دلکشی۔ اس حالت میں البتہ امید کی ایک آخری کرن باقی ہے ـــــــ اسلام! بے خدا مغرب کی لائی ہوئی تباہ کاریوں

سے بچنے کے لئے قانونِ خداوندی کی اطاعت کے سوا اب اور کوئی چارہ باقی نہیں یہ انسان کو زندگی کا ایک صحت مند نقطۂ نظر عطا کرتا ہے۔ اور اسکو بتاتا ہے کہ دنیا میں تجھے جو علمی۔ مادی اور روحانی کامیابیاں نصیب ہوتی ہیں۔ وہ دراصل تمہارے رحیم و شفیق رب کی مہربانی کا نتیجہ اور اسکا فضل ہے۔ اپنی ان کامرانیوں کو تم اپنے ابنائے نوع کی خدمت کا ذریعہ بناؤگے۔ تو وہ تم سے خوش ہوگا اور تمہیں انعام دیگا۔ تمہارا رب حصولِ علم کی لگن یا اسرارِ فطرت کی جستجو سے غضبناک نہیں ہوتا۔ کیونکہ اسکو اس بات کا کوئی اندیشہ نہیں ہے کہ اسکی مخلوق میں سے کوئی اپنے علم کے بل بوتے پر کبھی اس کی خدائی کے لئے خطرہ بھی بن سکتا ہے۔ اسکا غضب صرف اس وقت بھڑکتا ہے۔ اور ان لوگوں پر بھڑکتا ہے۔ جو اپنے علم و فضل اور سائنس کی معلومات کو اپنے ابنائے نوع کی فلاح و بہبود کی بجائے ان کی تباہی اور بربادی میں صرف کرتے ہیں۔

اخلاق و اعمال کے لحاظ سے آج دنیا جس مقام پر کھڑی ہے۔ آج سے چودہ سو سال پہلے بھی وہ اسی مقام پر کھڑی تھی۔ اسوقت اسلام ہی نے اس کو باطل معبودوں اور جھوٹے خداؤں سے نجات دلائی تھی۔ آج کے جھوٹے خداؤں سے بھی اسلام ہی انسانیت کو چھٹکارا دلا سکتا ہے۔ ان خداؤں نے آج استبداد۔ شہنشاہیت۔ سامراج اور سرمایہ داری کے لبادے اوڑھ رکھے ہیں۔ ایک طرف سنگدل سرمایہ دار غریب مزدوروں کا خون چوس چوس کر اپنی تجوریاں بھر رہے ہیں اور دوسری طرف پرولتاری ڈکٹیٹر شپ کے نام پر کچھ لوگ اپنی خدائی کے ٹھاٹھ جمائے بیٹھے ہیں۔ یہ لوگ عوامی آزادی کے نام پر لوگوں کی آزادیوں کو پامال کرتے ہیں اور دعویٰ یہ کرتے ہیں کہ وہ عوام کی مرضی پوری کر رہے ہیں۔

عالمی استعماری کیمپ

آج دنیا دو مخالف کیمپوں ——— سرمایہ داری اور اشتراکیت ——— میں بٹی ہوئی ہے اور یہ دونوں ایک دوسرے کے خلاف صف آرا ہیں۔ کیونکہ ان میں سے ہر ایک دنیا پر اپنا تسلط جمانا چاہتا ہے۔ اور عالمی منڈیوں اور اہم جنگی مقامات پر قبضہ کرنے کا آرزومند ہے۔ مگر اپنے تمام اختلافات کے باوجود ان دونوں میں ایک قدر مشترک پائی جاتی ہے اور وہ یہ ہے کہ دونوں کا نقطۂ نظر استعماری ہے۔ اور دونوں یکساں طور پر اقوام عالم کو اپنا غلام بنانا چاہتے ہیں۔ چنانچہ دونوں اس بات کے لئے کوشاں ہیں کہ وہ زیادہ سے زیادہ انسانی اور مادی ذرائع و وسائل پر قابض ہو جائیں۔ دوسرے انسانوں کی حیثیت ان کی نگاہوں میں بے زبان حیوانوں سے زیادہ نہیں (جنھیں وہ اپنی اصطلاح میں عددی قوت Man Power کہتے ہیں) یا پھر وہ محض آلاتِ کار ہیں۔ جنکی بدولت وہ اپنے ان مذموم مقاصد کی تکمیل کر سکتے ہیں۔

ایک تیسرا بلاک

اگر دنیائے اسلام استعمار کے اس وحشیانہ غلبہ و قہرمانی کے خلاف متحد ہو جائے تو بین الاقوامی رقابتوں اور حریفانہ کشاکش کی جس سے امن عالم کو شدید خطرات ہیں۔ مؤثر طور پر روک تھام ہو سکتی ہے۔ مسلمان ممالک اپنی صفوں میں اتحاد پیدا کرلیں تو وہ بڑی آسانی سے ایک تیسرا ——— مسلم بلاک ——— بن سکتے ہیں۔ اگر اسطرح کا کوئی بلاک وجود میں آجائے۔ تو وہ عالمی سیاست میں مرکزی اہمیت کا حامل بن سکتا ہے۔ کیونکہ جغرافیائی لحاظ سے یہ مسلمان ممالک نئی اور پرانی دنیا کے عین وسط میں واقع ہیں۔ اپنی اس جغرافیائی پوزیشن کی بدولت مسلمان ممالک اپنے قومی و ملّی مفاد کے پیشِ نظر بلا روک

ٹوک جیب کے ساتھ چاہیں گے۔ ملیں گے اور مشرقی یا مغربی استعمار کا آلہ کار بننے کی بجائے وہ اپنے حقیقی مفادات کے لئے مشترکہ جدوجہد کر سکیں گے۔

انسانیت کی واحد امید

اسلام انسانیت کی واحد امید ہے اور اسی سے اسکا مستقبل وابستہ ہے۔ موجودہ نظریاتی کشمکش میں نظریہ اسلام کی کامیابی ہی انسان کی نجات کی ضامن بن سکتی ہے۔ مگر اسلام کی فتح کی اس قدر اہمیت کے باوصف اس کا حصول بھی محض فریب نظر یا ناممکن الحصول نہیں۔ آج اسلامی نظام کا قیام اس طرح ممکن ہے جسطرح پہلے تھا۔ بشرطیکہ وہ تمام لوگ جو اس کے دائرے میں داخل ہیں۔ اور اب تک محض زبان سے اسکی اطاعت کا دم بھرتے رہے ہیں۔ آج ہی یہ عہد کرلیں۔ کہ وہ اسلام کو دنیا پر غالب و کامران کئے بغیر چین سے نہیں بیٹھیں گے۔ تو اسکے لئے انہیں کسی بیرونی طاقت کی مدد کی ضرورت بھی انشاء اللہ نہیں پڑے گی مگر جدید انسان کے لئے اسلام کی فتح کا مطلب ہوگا۔ ہر لحظہ سر پر منڈلاتے والے تیسری عالمگیر جنگ کے خطرہ کا خاتمہ، اعصابی عوارض، بیماریوں اور نفسیاتی تناؤ کا سد باب بالفاظ دیگر ———— مسرتوں، خوشیوں اور امن و چین سے بھرپور خوشگوار زندگی!

ایک اعتراض کا جواب

ممکن ہے یہ بات سن کر کہ اسلام انسان کے لئے آزادی اور امن و سکون کا پیغام ہے۔ بعض لوگوں کے ذہنوں میں یہ سوال ابھرے کہ پھر اسلام خود مسلمانوں کو ان ظالم اور جابر آمروں کے تسلط سے کیوں نجات نہیں دلاتا۔ جنہوں نے آج ساری دنیائے اسلام کو آزادی سے محروم کرکے پابہ جولان کر رکھاہے۔ اور جو اسلام کے نام پر مسلمانوں کو تذلیل و تحقیر کا تختہ مشق بنا رہے ہیں۔ اسکا مختصراً جواب یہ ہے کہ اگرچہ یہ صحیح ہے کہ یہ

آمرین مطلق اسلام کا نام استعمال کرتے ہیں ۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ ان کی حکومتوں میں اسلام کو کوئی اختیار یا مقام حاصل نہیں ہے ۔ اور نہ انکی زندگیوں میں یا انکے گرد وپیش اسکی کوئی جھلک ہی نظر آتی ہے ۔ یہ نام نہاد مسلمان اس گروہِ انسانی سے تعلق رکھتے ہیں ۔ جسکے متعلق خود اللہ جلشانہ کا ارشاد ہے کہ "جو لوگ اللہ کے نازل کردہ قانون کے مطابق فیصلہ نہ کریں ۔ وہی ظالم ہیں" (۵:۴۴)

یہ مسلمان آمر جس اسلام کی طرف ہم کو بلاتے ہیں اور چاہتے ہیں کہ وہ اسکو اپنی زندگیوں میں رہنما بنائیں ۔ اسکا اس "اسلام" سے دور کا بھی واسطہ نہیں ۔ جس کو شرق جدید کے یہ مسلمان حکمران اپنانے کا دعویٰ کرتے ہیں ۔ ان حکمرانوں کے دلوں میں قانون ربانی کا کوئی احترام یا لحاظ نہیں پایا جاتا ۔ وہ جب چاہتے ہیں ۔ اسکے احکام دفرامین کو پسِ پشت ڈال کر من مانی کرنے لگتے ہیں ۔ اور اس میں ذرہ بھر بھی حجاب محسوس نہیں کرتے ۔ اپنے معاملات زندگی میں انہیں اس سے روشنی اور ہدایت لینے کی کبھی ضرورت محسوس نہیں ہوتی ۔ نہ ان کی وفاداریاں صرف اسی کیلئے خاص ہیں ۔ وہ جہاں اپنے حسب منشاء کوئی چیز پاتے ہیں ۔ اسکو اختیار کر لیتے ہیں ۔ خواہ یہ یورپ کے کسی ملک کے انسانی قوانین ہوں ۔ یا شریعت کے احکام ۔ اور جو چیز ان کی خواہشات اور مصلحتوں کے خلاف پڑتی ہے ۔ اسکو اٹھا کر پرے پھینک دیتے ہیں ۔ یہ لوگ نہ انسانوں کے وفادار ہیں ۔ نہ خدا کے ۔ وہ انسان اور خدا دونوں سے زیادتی اور گستاخی کے مجرم ہیں ۔ کیونکہ انکار کا معیار ردوقبول ، حق وصداقت نہیں ہے ۔ بلکہ ذاتی مصلحتیں اور حرص وہوا ہے ۔

ہم جس اسلام سے آشنا ہیں ۔ وہ مغرور بادشاہوں اور خود سر وجابر مستبد

حکمرانوں کے وجود کو بھی برداشت نہیں کرتا۔ یہ ان کو بھی اسی طرح خدائی قانون کے شکنجے میں کس کر رکھتا ہے۔ جسطرح عام لوگوں کو۔ اور جو اسکے لئے تیار نہ ہوں تو انہیں ہمیشہ ہمیشہ کے لئے نیست و نابود کر دیتا ہے۔ جس پر خود قرآن اور تاریخ شاہد عدل ہے

اسلام اس بات کی اجازت نہیں دیتا کہ کوئی آمر اپنے جیسے دوسرے انسانوں پر خدا اور اسکے رسولؐ کی مرضی کے خلاف اپنا بنایا ہوا قانون ٹھونسنے کی کوشش کرے۔ اسلام کی حکومت میں حکمران، خدا اور خلق دونوں کے سامنے جواب دہ ہوتا ہے۔ اسلامی ریاست اپنے شہریوں کو نہ صرف اپنے اندر کے جابر اور مستبد حکمرانوں کے شر سے محفوظ رکھتی ہے بلکہ بیرونی جارحیت سے بھی اُنکا دفاع کرتی ہے۔ خواہ یہ جارحیت سامراجی استحصال کی صورت میں ظاہر ہو یا کوئی اور صورت اختیار کرلے۔

مغرب کی ترقی کی حقیقت

اس میں کوئی شک نہیں کہ جدید مغرب نے سائنس کے میدان میں بے پناہ کامیابیاں حاصل کی ہیں۔ مگر انسانیت کے میدان میں یہ ہنوز انتہائی پسماندہ اور وحشی ہے سائنس نے اسے مادی خوشحالی عطا کی ہے۔ مگر اچھے انسان نہیں دیئے۔ جسکی وجہ سے انسانیت کا ارتقاء رک سا گیا ہے۔ دل اعلیٰ انسانی قدروں کے احترام سے خالی ہیں۔ جدید تہذیب نے روح سے زیادہ مادہ پر زور دیا ہے۔ اور روحانیت کے مقابلہ میں محسوسات کو ترجیح دی ہے۔ جسکا نتیجہ اب یہ نکلا ہے کہ افراد بلند اجتماعی مقاصد کی بجائے اپنے ذاتی عیش و آرام اور خود غرضانہ مقاصد کے حصول کو زیادہ اہم سمجھنے لگے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ جدید انسان جسمانی لذتوں کی تلاش ہی میں سرگرداں نظر آتا ہے۔ ظاہر ہے کہ اس صورت حال کو انسان کی ترقی یا انسانیت کا ارتقاء نہیں کہا جاسکتا

کیونکہ انسان کی یا انسانیت کی ترقی کا مطلب صرف مادی اور سائنسی ترقی ہی نہیں ہے ہے۔ بلکہ محسوسات اور حیوانی خواہشات کے غلبہ سے کامل آزادی بھی اسکے مفہوم میں شامل ہے۔ یہی وہ مقام ہے۔ جہاں اسلام ہماری دستگیری کرتا ہے۔ کیونکہ صرف وہی انسانیت کو حقیقی ترقی وارتقار سے ہمکنار کر سکتا ہے۔

حقیقی ترقی کا پیمانہ

تیز رفتار طیاروں۔ ایٹم بموں۔ ریڈیو اور روشن برقی قمقموں کو ترقی نہیں کہہ سکتے۔ ان کو ترقی کے مترادف قرار دینا غلط بینی ہے اور بس۔ کیونکہ یہ چیزیں ترقی کو ماپنے کا کوئی انسانی پیمانہ ہمیں دینے سے یکسر قاصر ہیں اگر حقیقی ترقی کو معلوم کرنا ہے تو یہ دیکھیے کہ کیا انسان کو اپنی حیوانی خواہشات اور جذبات پر کامل قابو حاصل ہے۔ یا وہ ان کے ہاتھوں میں ابھی تک کھلونا بنا ہوا ہے؟ اگر انسان اب بھی اپنی خواہشات نفس کے سامنے بے بس اور عاجز ہے۔ اور وہ ان سے اوپر اٹھ کر کوئی بات سوچ ہی نہیں سکتا۔ تو سمجھ لیجیے کہ انسان حقیقی ترقی سے ابھی کوسوں دور ہے اور بحیثیت انسان اس کی حالت علم وفضل اور سائنس کے میدانوں میں ان تمام خیرہ کن کامیابیوں کے باوجود قابل رحم ہے۔ کجاکہ اسکو ترقی یافتہ اور کامیاب قرار دیا جائے۔

ترقی کا یہ معیار مذہب اور اخلاقیات کا خودساختہ اور خانہ ساز معیار نہیں ہے۔ جسکو کہیں باہر سے لاکر انسان پر ٹھونس دیا گیا ہو۔ یہ محض واہمہ بھی نہیں بلکہ واقعہ ہے اور اسکی صداقت پر خود تاریخ گواہ ہے۔ جو ہمیں بتاتی ہے۔ کہ اسکی جڑیں فطرت انسانی اور حقیقت نفس الامری میں پیوست ہیں چنانچہ یہ ایک اٹل تاریخی حقیقت ہے کہ اس اخلاقی اور انسانی معیار کو چھوڑ کر جب کوئی قوم عیش وعشرت

میں مبتلا ہوئی ۔ تو پھر وہ کبھی اس قابل نہ ہوسکی ۔ کہ اپنی سابقہ قوت وعظمت ، وقار اور دبدبے کو قائم رکھ سکے ۔ اور انسانیت کے مجموعی ارتقار اور فلاح میں کوئی کارنامہ سرانجام دے سکے ۔ قدیم یونان ہو ۔ یا ایران ۔ رومن ایمپائر کی تباہی ہو ۔ یا عہدِ عباسیہ کے اواخر میں خود مسلمانوں کی سطوت وعظمت کا زوال ۔ ان سب میں اسی عیاشی اور لذت کوشی کے تباہ کن اثرات کارفرما نظر آتے ہیں ۔ دورِ جدید کی تاریخ میں عیاش فرانسیسی قوم کے اس شرمناک کردار کو کون بھلا سکتا ہے ۔ جو دوسری جنگ عظیم میں اس نے پیش کیا ؟ دشمن کے سامنے ہتھیار ڈالنے میں اس قوم نے ذرا بھی تاخیر نہ کی ۔ بلکہ ایک ہی ہلہ میں اسکے سامنے سرنگوں ہوگئی ۔ اور دشمن کا ایک وار بھی نہ سہہ سکی ۔ کیونکہ اسکے افراد کو اپنے ملک ووطن کے دفاع سے کہیں زیادہ اپنی جان ومال اور ذاتی آرام وآسائش کی پڑی ہوئی تھی ۔ اپنی قوم کی عظمت رفتہ اور اسکی شہرت ونیک نامی سے بھی زیادہ انہیں اسبات کی فکر کھائے جارہی تھی کہ جس طرح بھی بن سکے ، انکا دارالحکومت پیرس اور اسکے ناچ گھر دشمن کی بمباری سے بچ جائیں ۔

غرضیکہ اپنی تمام تر ترقیوں اور کامرانیوں کے باوجود سائنس ، جو دورِ جدید کے خدا کی حیثیت رکھتی ہے ، ابھی تک اس قابل نہیں ہوسکی کہ فطرت انسانی میں کوئی بنیادی تغیر واصلاح رونما کرسکے ۔ کیونکہ خود سائنس بھی خدائی قانون کا ایک جزو ہے ۔ وہی خدائی قانون ، جو حالات وواقعات سے آزاد اور ان سے برتر ہے : ۔

فَلَنْ تَجِدَ لِسُنَّتِ اللّٰهِ تَبْدِيْلًا ج   سو تم اللہ کے دستور کو کبھی بدلتا ہوا نہ پاؤ گے ۔

اگرچہ دوسرے باطل خداؤں کے قانون ہر روز بدلتے رہتے ہیں ۔

امریکہ اور ترقی

بعض ناواقف کہتے ہیں کہ امریکہ کے لوگ دنیاوی لذات اور محسوسات میں غرق ہیں۔ مگر اس کے باوجود انہیں دنیا میں قوت اور شوکت حاصل ہے اور مادی پیداوار کے لحاظ سے ان کا ملک دنیا میں بلند ترین مقام پر فائز ہے۔ اسمیں کوئی شک نہیں کہ مادی اور روحانی لحاظ سے امریکہ اقوام عالم کی برادری میں ابھی ایک نوجوان قوت ہے۔ مگر جوانی میں اکثر پوشیدہ امراض دبے رہتے ہیں۔ اور بظاہر انکی کوئی علامات نظر نہیں آیا کرتیں۔ کیونکہ معاشرتی نظام میں ابھی اتنی قوت مدافعت موجود ہوتی ہے۔ کہ وہ مختلف امراض کی بیرونی علامات کو نمایاں ہونے ہی نہ دے۔ مگر دیدہ بینا اس قسم کے کسی معاشرے کی ظاہری صحت مندی اور چمک دمک سے دھوکا نہیں کھا سکتی اور نہ دلکش اور دلفریب ظاہری پردہ میں پنہاں مہلک امراض کے آثار و علامات اس سے اوجھل رہ سکتے ہیں۔ یہ حقیقت کہ اخلاقی لحاظ سے امریکہ کی حالت مغرب کی دوسری قوموں سے کچھ بھی بہتر نہیں۔ مندرجہ ذیل خبروں سے بآسانی سمجھ میں آسکتی ہے۔

پہلی اخباری اطلاع کے مطابق امریکہ کی وزارت خارجہ نے اپنے تینتیس ۳۳ ملازموں کو قابل اعتراض اخلاقی چال چلن اور اپنے ملک کے راز دشمنوں پر افشا کرنے کے الزام میں ملازمت سے برطرف کر دیا ہے۔ دوسری خبر یہ ہے کہ اسوقت تک امریکی فوجی بھگوڑوں کی تعداد ایک لاکھ بیس ہزار تک پہنچ چکی ہے۔ امریکی فوج کی مجموعی عددی قوت کو سامنے رکھا جائے تو بھگوڑوں کی یہ تعداد خاصی بڑی معلوم ہوتی ہے۔ حالانکہ امریکی قوم ابھی اپنے عالم شباب سے گزر رہی ہے۔ اور عالمی قیادت اور بالا دستی کے خواب دیکھ رہی ہے۔ ان کے علاوہ جس تیزی سے بھنگ۔ چرس اور افیون کا دور دورہ چل رہا ہے اور جرائم کی تعداد روز بروز بڑھ رہی ہے ان سے سمت کا بآسانی تعین کیا جاسکتا ہے کہ ہوا کا رخ کدھر

ہے۔ مگر یہ تو محض ابتدا ہے اگر امریکی قوم زندگی کے بارے میں اپنی موجودہ مادہ پرستانہ روش سے باز نہ آئی تو اسکا انجام بھی بالآخر لازماً وہی ہوکر رہے گا۔ جو اس جیسی پہلی قوموں کا ہو چکا ہے کیونکہ یہی اٹل قانونِ فطرت ہے۔ جس سے تاریخ بھری پڑی ہے۔

امریکی تصویر کا تاریک پہلو

مندرجہ بالا حقائق سے امریکی تصویر کا صرف ایک ہی رخ نمایاں ہوتا ہے۔ اگر آپ اسکے دوسرے رخ میں جھانک کر دیکھیں تو معلوم ہو گا کہ اپنی مادی پیداوار۔ جوانی اور بے پناہ وسائل و ذرائع کے باوجود امریکی قوم اعلیٰ اخلاقی قدروں اور اصولوں کے میدان میں حیرتناک حد تک بانجھ ہو چکی ہے۔ کیونکہ من حیث القوم وہ سراسر مادی لذآت اور خواہشات میں ڈوبی ہوئی ہے اور اب تک خالص حیوانی سطح سے اوپر اٹھ کر مسائل کا جائزہ لینے کی توفیق اس کو شاذو نادر ہی ہوئی ہے۔ سیاہ فام امریکیوں سے جو انسانیت سوز اور وحشیانہ سلوک امریکہ میں روا رکھا جاتا ہے۔ وہ امریکی قوم کی اس پست اور قابلِ رحم اخلاقی حالت کا آئینہ دار ہے۔ انسانیت پر حیوانیت کا اس قدر غلبہ کہ انسان بس اس کی تسکین، بلکہ پرستش میں لگ جائے۔ انسانیت کی تذلیل ہے۔ جس کی موجودگی میں وہ بھی ترقی و ارتقار کی منازل طے نہیں کر سکتی۔

نیکی اور بھلائی کی راہ

آج کی دنیا کی یہ تصویر بہت تاریک ہے۔ مگر نجات کی راہ اب بھی باقی ہے۔ اور وہ ہے اسلام کی راہ جس طرح تیرہ صدی پہلے اس نے انسان کو حیوانی خواہشات کے تسلط سے آزادی عطا کی تھی اسی طرح آج بھی وہی انسانیت کی دست گیری کر سکتا ہے۔ اور اس کو خواہشات نفس کے غلبہ سے چھٹکارا دے کر اسکو اس قابل بنا سکتا ہے کہ وہ اپنی روحانی سطح کو بلند

سے بلند تر کرنے میں اپنے دل و دماغ کی تمام قوتیں کھپا دے۔ تاکہ زندگی کا دامن نیکیوں اور بھلائیوں سے بھر جائے۔ اور ہر طرف انہی کا چرچا ہو۔

ممکن ہے یہ باتیں سن کر بعض لوگ کہہ اٹھیں کہ اسلام کا احیاء اب ایک امر محال ہے اور دور جدید کے تازہ نداؤں سے گلو خلاصی کی کوششیں بے سود ہیں۔ مگر ان لوگوں کو معلوم ہونا چاہیئے کہ جس طرح ماضی میں اسلامی نظام کے عملی قیام سے ثابت ہو چکا ہے کہ نسل انسانی اس کی رہنمائی میں حیوانیت کو شکست دے سکتی ہے۔ اسی طرح اب بھی اس تاریخی حقیقت کا اعادہ ممکن ہے۔ کیونکہ فطرت انسانی میں بنیادی طور پر کوئی تبدیلی واقع نہیں ہوئی۔ یہ جیسی پہلے تھی۔ اب بھی جوں کی توں ہے۔ اسلام جب آیا تھا تو دنیا کی اخلاقی اور دینی حالت ویسی ہی پست تھی۔ جیسی کہ اب ہے۔ قدیم وجدید پستیوں میں سوائے مظاہر کے اور کوئی فرق نہیں ہے۔ قدیم اخلاقی بے راہ روی میں جدید لندن۔ پیرس اور امریکہ کے شہروں میں سے کسی طرح بھی پیچھے نہ تھا۔ اسی طرح قدیم ایران جنسی انارکی کا اسی طرح شکار تھا۔ جس طرح آجکل کے اشتراکی ممالک اس کا شکار ہیں۔ چنانچہ یہی وہ تاریخی پس منظر تھا جس میں اسلام دنیا میں آیا، اس نے آتے ہی اپنے زیر اثر دنیا کی اخلاقی حالت میں انقلاب پیدا کر دیا۔ اس کو قعر ذلت سے اٹھایا۔ زندگی کو ایک اعلیٰ نصب العین سے روشناس کیا۔ عمل و حرکت سے سرشار کیا۔ نیکی و صداقت کی راہ میں جہاد کا جذبہ بلند و بیدار کیا۔ اور انسانیت کو ترقی و خوشحالی سے ہمکنار کیا۔ اور ایک ایسی علمی اور روحانی تحریک کو جنم دیا، جو عرصہ دراز تک مشرق و مغرب پر چھائی رہی۔ اس کے نتیجے میں دنیا ایک عظیم فکری انقلاب سے روشناس ہوئی۔ اور دنیائے اسلام روشنی۔ ہدایت اور ترقی کا منبع بن گئی۔ جس سے ایک

طویل عرصہ تک انسانیت کسب نور و ہدایت کرتی رہی ۔ اپنی عظمت و برتری کے اس طویل دور میں دنیائے اسلام مادی ۔ علمی یا روحانی لحاظ سے کبھی دوسروں سے پیچھے نہیں رہی۔ کیونکہ اسلام اخلاقی بے راہ روی ۔ جنسی انتشار اور الحاد کی اجازت نہیں دیتا ، اور نہ انہیں ابھرنے کا موقع دیتا ہے ۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ اس عرصہ میں نیکی و شرافت اور انسانی جدو جہد کے تمام دوسرے دوائر میں مسلمانوں کو اقوام عالم کی رہنمائی کا منصب حاصل رہا اور ان کی زندگیاں دوسروں کے لئے نمونے کی زندگیاں بن گئیں ۔ یہ دَور آج بھی واپس آسکتا ہے ۔ بشرطیکہ ہم حقیقی خدا کے بتلائے ہوئے راستہ پر خلوص سے گامزن ہو جائیں ۔

ایک مکمل نظام حیات

یہ کہنا غلط ہے کہ اسلام محض ایک روحانی عقیدہ ہے یا صرف اخلاقیات کا نظام ہے ۔ یا زمین و آسمان کے بارے میں محض ایک علمی جستجو کا نام ہے ۔ نہیں ۔ بلکہ اسلام زندگی کا ایک عملی نظام ہے اور اس دنیا کے تمام گوشوں اور جملہ مسائل پر حاوی ہے ۔ اور اس کا کوئی پہلو اسکی گرفت سے آزاد نہیں ۔ وہ انسانی زندگی کے تمام تعلقات و روابط کو منضبط کرتا ہے ۔ خواہ یہ مسائل سیاسی ہوں ۔ اقتصادی ہوں یا معاشرتی ۔ اور ان کے لئے موزوں ضابطے اور قواعد مرتب کر کے انہیں عملاً نافذ کرتا ہے ۔ اسلام کے اس کارنامے کی نمایاں ترین خوبی یہ ہے کہ اس طرح سے فرد اور اجتماع ، عقل اور وجدان ، عمل اور عبادت ، زمین اور آسمان اور دنیا و آخرت کے درمیان منفرد نوعیت کی ہم آہنگی اور توازن پیدا ہو جاتا ہے ۔ اور زندگی کے یہ گوناگوں پہلو ، ایک ہی متناسب کُل کے اجزا بن جاتے ہیں۔

---

(۱۴)

مسلمان اور عصرِ حاضر کا چیلنج

(ڈاکٹر برہان احمد فاروقی)

چیلنج کا نعرہ عصر حاضر کے چیلنج کا نعرہ یہ ہے کہ:۔
"قرآن سے وہ رہنمائی میسر نہیں آتی جو اس زندگی میں ترقی کرنے کے لئے ضروری ہے۔ اس لئے جب تک مسلمان جدید مغربی تہذیب کی پیروی نہ کریں۔ ان کا مستقبل تاریک ہی رہے گا"۔

اس نعرے کی حقیقت یہ تو چیلنج کا صرف نعرہ ہے۔ اس نعرے کی حقیقت یہ ہے کہ جب سے پی اے سوروکن، آسولیڈ اسپنگلر ٹوائن بی اور برٹرینڈ رسل نے یہ کہا ہے کہ:۔
"مغربی تہذیب تباہی کو پہنچ چکی ہے اب اس کا بچنا ناممکن ہے"
جدید مغربی تہذیب کے ادنیٰ درجے کے محافظوں کا خیال یہ ہے کہ اگر مسلمانوں کا اعتماد اپنی تہذیب کے بارے میں متزلزل رہے تو یہ دم توڑتی ہوئی مغربی تہذیب کچھ دن اور باقی رہ سکتی ہے۔

اس لئے وہ مسلمانوں کو یہ باور کرائے رکھنا چاہتے ہیں کہ ان کا مستقبل اسلام سے نہیں مغربی تہذیب سے وابستہ ہے۔ مسلم معاشرے کی حالت یہ ہے کہ اس میں ایک شگاف پڑ گیا ہے۔ ایک طرف نام نہاد راسخ العقیدہ ذہن ہے۔ جس کی خصوصیات یہ ہیں کہ وہ یقین و اعتماد سے عاری ہے۔ قرآن مجید کو صحف ماسبق کی تمثیل پر قیاس کرتا ہے اور قرآن کو صرف قانون کا ماخذ سمجھتا ہے۔ مگر اقدار سے

محروم ہونے کے بعد سے یہ قانون سازی بے اثر ہوگئی ہے۔ پھر بھی قانون سازی ہی سے زندگی کی اصلاح کی توقع رکھتا ہے حالانکہ اصلاح کسی ولولہ انگیز نصب العین کے حوالے سے ہوتی ہے۔ جس کے حاصل ہونے کا یقین ضروری ہے کیونکہ بغیر یقین کے حصول نصب العین کے لیے جدوجہد نہیں ہوسکتی۔

دوسری طرف نام نہاد جدید ذہن ہے جو فکر جدید کے تقاضوں سے اسلام کو معذرت کوشی کے انداز میں سازگار بنا کر اسلام سے اپنی وابستگی کا جواز پیدا کرتا ہے اور زندگی کے تقاضے جدید مغربی تہذیب کی پیروی سے پورے کرنا چاہتا ہے اور اس چیلنج کی حقیقت کو سمجھ کر اس کا جواب دینے سے عاجز ہے۔ اس عجز کی اصل وجہ اسلام کی نتیجہ خیزی کے بارے میں اس کی بے یقینی ہے اور بے یقینی کی بنیاد شکست خوردگی ہے۔

یقین کیسے حاصل ہوتا ہے

دراصل یقین کی حیثیت تیراکی کے فن کی سی ہے جب کوئی شخص پانی میں کود کر ڈوبنے اور تیرنے کی کش مکش میں پڑ کر تیرنے میں کامیاب ہوتا ہے تو تیراک بنتا ہے اور حق و باطل کی کشمکش میں پڑ کر باطل پر غالب آتا ہے تو اس کا یہ اعتماد بحال ہوتا ہے کہ حق غالب ہی آنے کے لیے ہے مگر جب تک حق و باطل کی کش مکش غلبہ حق کی صورت میں اتمام کو نہ پہنچے نہ تو باطل کے وجود کا انکار ہوسکتا ہے نہ اس کے مؤثر ہونے کا۔

زوال سیرت اور قانون سازی

تاریخ اسلام میں جب پیغمبرانہ اخلاقی تعلیم کا اثر زائل ہونے لگا تو زوالِ سیرت کا علاج قانون سازی کے ذریعہ کرنے کی سعی کی گئی جو اسلامی ولولہ فتوحات کی بنیاد پر پیدا ہوتا رہا اور یقین نتیجہ خیزی کے مشاہدے سے پیدا ہوتا رہا۔ مگر جب ایک تاریخی حادثے کے طور پر یہ تقسیم کار وضع ہوئی کہ اسلام اور مسلمانوں کی حفاظت سلاطین کے ذمے، قانون سازی علمار کے ذمے اور سلاطین کی نوازشات کی بدولت علمار نے شریعت کے بجائے تشریع

یعنی لفظ قانون کی پیروی کا نقطہ نظر اختیار کیا تو وہ خلوص جو احکام شرع کی بجا آوری کے لیے ضروری تھا ضائع ہوگیا۔ قانون سازی رسم و رواج کی بنیاد پر کی گئی تو غلامی کو دوام و استمرار حاصل ہوگیا اور باندیوں سے جنسی تمتع کا جواز پیدا ہوگیا۔ اصحاب طریقت نے اتباعِ شریعت میں خلوص پیدا کرنے کے لیے جدوجہد کی تو صوفیا کے ذریعہ تزکیہ اور روحانی اصلاح ہوتی رہی مگر جب سلاطین اقتدار سے محروم ہوئے اور اسلامی قانون قوت نافذہ سے محروم ہوا تو علماء اور صوفیا دونوں بے بس ہوگئے۔

بے یقینی کا سبب

جب یہ مشاہدہ کیا گیا کہ عقائد اور عبادات کی حفاظت کے لیے جان کی بازی لگانے والے غلامی کے لیے مختص کر دیئے گئے اور تقوی شکن مستعمراتی نظام کو اقتدار دیدیا گیا تو مذہبی ذہن نے اپنی ناکامی کی صحیح توجیہہ نہ کرسکنے کی بنا پر اپنی ناکامی کا سبب اللہ تعالیٰ کی بے نیازی کو قرار دیا اور اس حقیقت کو نظر انداز کردیا کہ مذہبی ذہن بے جان عقائد، مردہ رسوم، فرقہ پرستانہ آرزوؤں اور مفاد پرستانہ گروہ بندیوں کو پیغمبرانہ راہِ حق پرستی سمجھتا رہا اور اب بھی یہی سمجھتا ہے۔ اسی لیے ناکام ہے اور دشمنوں کے مقابلے میں کامیاب نہیں ہوتا اور ناکامی کی بنا پر بے یقینی میں مبتلا رہتا ہے۔

دورِ حاضر کی خصوصیت

یہ دور کافرانہ یقین اور مومنانہ بے یقینی کی کش مکش کا دور ہے کیونکہ ایک اشتراکی اپنے طریق کار کے نتیجہ خیز ہونے کا یقین رکھتا ہے اور فرقہ پرست مسلمان اپنے طریق کار کی نتیجہ خیزی سے مایوس ہوچکے ہیں مگر اپنے طرزِ عمل کا جائزہ لینے کے لیے تیار نہیں۔ تمام مذہبی گروہ چند مابعد الطبعی عقائد چند اخلاقی اسباق چند معاشرتی اصولوں، چند تمدنی ضوابط چند عدالتی قوانین اور چند رسوم و ظواہر ہی کو دین کامل سمجھتے ہیں اور یہ جانتے ہوئے کہ دین کامل کا یہ تصور دلوں کو نہیں گرماتا۔ مذہبی ذہن یہ غور کرنا بھی پسند نہیں کرتا کہ عقائد

اور اخلاقی اسباق اور تمدنی ضوابط اور عدالتی قوانین اور معاشرتی اصول اور رسوم و ظواہر زندگی پر اثر انداز کیوں نہیں رہے۔ اس کا ردِ عمل سیکولر ذہن پر یہ ہے کہ نظام حیات سیکولرازم ہی رہے۔ تو فرقہ پرستیاں نجی انفرادی زندگی کا مسئلہ ہی رہیں گی اور مسائل زندگی سیکولرازم ہی سے حل ہوتے رہیں گے۔ حالانکہ سیکولرازم سے کوئی مسئلہ حل نہ ہوگا۔ امن کی آرزو کے تحت جنگ میں پہل نہ کی جاتے تو جو مسائل جنگ ہی سے حل ہوتے ہیں کبھی حل نہ ہوں گے۔ جنگ میں دفاعی نقطۂ نظر اختیار کر کے خودکشی ہی ہوتی رہے گی۔ جغرافیائی بنیاد پر عمرانی وحدت کے شعور سے بین الاقوامی سطح پر عناد ہی پرورش پاتا رہے گا۔ معیشت میں عدل اس لئے پیدا نہ ہو سکے گا۔ کہ معاشی تخلیق کی جدوجہد میں تعطل کو رفع کرنے کی ذمہ داری کسی پر متعین ہی نہ ہو سکے گی۔ سیاست میں سیاسی تناقص رفع نہ ہونے کی وجہ سے سیکولرازم کے تحت ہمیشہ مستبد نظام ہی بروئے کار آتا رہے گا اور نتیجہ یہ ہوگا کہ نہ حکومت قوم کی متصور ہو سکے گی۔ کیونکہ پارلیمانی جمہوریت کی رو سے وہ صرف حزب اقتدار کی حکومت ہوگی اور نہ قوم حکومت کی متصور ہو سکے گی اور مسلمانوں کے اس حال سے فائدہ اٹھا کر اسلام کے دشمن مسلمانوں کو بے یقینی میں مبتلا رکھ کر اسلام سے بدگمان کرتے رہیں گے۔

ایشیائی اسلامی کانفرنس کی اصل مسئلہ سے بے نیازی

کراچی میں جو آل ایشیا اسلامی کانفرنس منعقد ہوئی تھی اس کے خطبۂ استقبالیہ میں محترم جنرل ضیاء الحق صاحب نے تین سوال بیان کئے تھے جو دشمنان اسلام طنزاً مسلمانوں پر کرتے ہیں۔ سوالات یہ تھے۔

- اگر اسلام واقعی اتنا عظیم ضابطہ حیات ہے جو مسلمانوں کو اس دنیا میں اور اگلی دنیا میں سرخروئی مہیا کرتا ہے تو کیا وجہ ہے کہ مسلمان آج دنیا میں دوسروں کے محتاج اور ان کے زیر اثر ہیں۔

- اگر اسلام کے بتائے ہوئے اصول بہترین اصول ہیں تو خود مسلمان ان پر عمل کیوں نہیں کرتے ؟
- اگر بنی نوعِ انسانیت کی نجات اسلام اور اسلامی اصولوں پر قائم کئے ہوئے معاشرے میں ہے تو کیا وجہ ہے کہ مسلمان ممالک ایسا معاشرہ اپنے ہاں قائم نہیں کرتے ؟

محترم جنرل ضیا الحق صاحب کا مقصد ان سوالات کو خطبۂ استقبالیہ میں بیان کرنے سے یہ تھا کہ مندوبین کانفرنس ان سوالات کا جواب دیں گے مگر کسی مندوب کو ان سوالات کا جواب دینے کی ضرورت محسوس نہیں ہوئی ۔ اور ہمارے فرقہ پرستوں کے نمائندے بھی ان مسائل کی طرف اس لئے متوجہ نہ ہو سکے کہ ان کی فکری بنیادیں کھوکھلی ہو چکی ہیں اور ہمارے وہ افراد جنہیں کانفرنس میں مدعو کیا گیا تھا ۔ وہ خود اسلام کو ان اعتراضات کا ہدف سمجھتے ہیں ۔ اس لئے ان کی طرف سے ان سوالات کا جواب دینے کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا ۔

فکری بنیادوں کے کھوکھلے پن کا علاج

فکری بنیادوں کے کھوکھلے پن کو رفع کرنے اور اسلام کے باب میں اپنے اعتماد کو از سر نو بحال کرنے کی شرط یہ ہے کہ پہلے ہم اپنے دینی فکر کا جائزہ لیں کہ وہ کن مراحل سے گزر کر اس حال کو پہنچا ہے کہ بے نتیجہ ہو کر رہ گیا ہے ۔ پھر اپنے فکر کے بے نتیجہ ہو جانے سے مایوس ہو کر ہم جن غیر اسلامی افکار و نظریات سے اپنے مسائل حل کرنے کی طرف متوجہ ہوئے ان کا تنقیدی جائزہ لیں ۔

پھر علم بالوجی سے اپنے مسائل بغیر تعبیر کے بغیر تفسیر کے بغیر تاویل کے نصوص قرآنی سے حل کر کے علم بالوجی کی نتیجہ خیزی کی نسبت اپنا اعتماد جو متزلزل ہو چکا ہے ۔ اسے بحال کریں تب ہی اس چیلنج کا جواب دے سکیں گے جسے ہم نے اپنی بے یقینی کی بنیاد پر چیلنج سمجھ لیا ہے ۔ حالانکہ وہ چیلنج نہیں صرف ایک نعرہ ہے ۔

قرآن اور انسانی ذہن کے زائیدہ علوم کی حاجتمندی

قرآن مجید کے ان تمام دعاوٰں کے باوجود جو اس نے اپنے بارے میں کئے ہیں اور قرآنی وحی کے ایک ایک لفظ اور ایک ایک زیر زبر کے محفوظ ہونے کے باوجود اگر انسانی ذہن کے زائیدہ معلوم اور انسانی تجربات کی حاجتمندی ختم نہ ہو تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ قرآن سے ایسی کوئی رہنمائی میسر نہیں آتی جو انسانی استعداد کے زائیدہ علوم اور تجربات سے بے نیاز کردے۔ قرآن مجید کے باب میں اس بے یقینی کو ہم تسلیم کریں یا نہ کریں مگر واقعہ یہی ہے کہ ہم بے یقینی میں مبتلا ہیں۔

اس بے یقینی کی وجہ یہ ہے کہ قانون ساز مذہبی ذہن قرآن مجید کو صرف اصول مہیا کرنے والی کتاب سمجھ کر ہدایت اپنی تعبیر کو سمجھتا ہے۔ کیونکہ قانون سازی میں رہنمائی طلب کرنے کے علاوہ قرآن سے کوئی اور تمنا اس لئے نہیں کرسکا کہ اس نے قرآن کو خود اس کے اپنے دعوٰوں کی روشنی میں سمجھنے کی بجائے صحف ماسبق کی تمثیل پر قیاس کرکے اسے صرف قانون کا ماخذ اس انداز سے مانا ہے کہ قانون سازی میں قرآن کی کمی حدیث سے، حدیث کی کمی اجماع صحابہ سے، اجماع کی کمی قیاس سے اور قیاس کی کمی اجتہاد نو سے پوری کی جاتی ہے اور نتیجہ یہ ہے کہ انسانی ذہن کے زائیدہ علوم کی حاجت مندی ختم نہیں ہوتی۔

علم بیالوجی اور انسانی علم میں امتیاز

انسانی علم اس استعداد کی نشوونما کا نتیجہ ہے جس کے ودیعت کئے جانے کا اشارہ علم آدم الاسماء کلھا میں موجود ہے جو انسانی تجسس کا نتیجہ ہے۔ جس کی نشوونما اس لئے اتمام کو نہیں پہنچی کہ نشوونما "اقدام وخطا" سے ہوتی ہے اور قرآنی وحی کا علم، وہ علم ہے جس کی احتیاج انسانی استعداد کے زائیدہ

علم سے پوری نہیں ہوسکتی۔

انسانی علم اور علم بالوحی میں امتیاز یہ ہے کہ :-

- علم بالوحی کا موضوع نصب العین ہے اور انسانی علم کا موضوع حقیقت ہے۔
- علم بالوحی کا مسئلہ یہ ہے کہ نصب العین حاصل کیسے ہوگا اور انسانی علم کا مسئلہ یہ ہے کہ حقیقت کیا ہے؟
- علم بالوحی عمل کا علم ہے جس کا بنیادی تصور "اختیار" ہے اور انسانی علم حقیقت کا علم ہے جس کا بنیادی تصور "جبر" ہے۔
- علم بالوحی کے مضمرات یہ ہیں کہ نصب العین کے حصول کی جدوجہد میں مزاحمت کی مزاحمت سے نصب العین حاصل ہو۔ انسانی علم کے مضمرات یہ ہیں کہ ایک طرف ناظر ہو دوسری طرف منظور ہو۔ ناظر میں جاننے کی استعداد ہو اور منظور ایسا ہو جو ناظر کی استعداد سے جانا جا سکتا ہو۔
- عمل کی ابتدا جس کے لئے علم بالوحی درکار ہے۔ یقین سے ہوتی ہے انسانی علم کی ابتدا شک سے ہوتی ہے۔
- عمل میں جس کے لئے علم بالوحی نازل ہوا "ارادہ" اہم ہے اور انسانی علم میں فکر کو اہمیت حاصل ہے۔
- عمل کا وظیفہ جس کے لئے علم بالوحی نازل ہوا تخلیق ہے اور انسانی علم کا وظیفہ "توجیہہ" ہے۔
- عمل کا جائزہ حق و باطل کہہ کر لیا جاتا ہے۔ اور علم کا جائزہ صحیح اور غلط کہہ کر لیا جاتا ہے۔
- علم بالوحی احتمال خطا سے پاک ہے اور انسانی علم میں احتمالِ خطا موجود ہے۔

- علم بالوحی وہب خالص اور فضل محض ہے۔ انسانی علم میں کسب کو دخل ہے۔
- علم بالوحی سے معاشرہ وجود میں آتا ہے انسانی علم معاشرے میں پیدا ہوتا ہے۔
- علم بالوحی جس یقین کا مطالبہ کرتا ہے۔ اس کی اساس بھی مہیا کرتا ہے اور انسانی علم شک کی اساس فراہم کرتا ہے۔
- انسانی ذہن کے زائیدہ دینی فکر کی نشوونما جس مسلمہ پر مبنی ہے۔ وہ "تکمیل دین" کا خود ساختہ یہ تصور ہے کہ تکمیل دین دستور حیات یعنی فقہی نظام ہی کی تکمیل کا نام ہے اور یوں دین کی تکمیل فقہی دستور حیات تک محدود رہ جاتی ہے۔ یہ فقہا کا کارنامہ ہے۔

قرآن مجید میں حجۃ الوداع کے دن جس تکمیل کا دعویٰ،

(ترجمہ) "اب یہ کافر تمہارے دین کی طرف سے مایوس ہوگئے تو ان سے نہ ڈرو۔
اب میں نے تمہارے لئے تمہارے دین کو کامل کردیا اور تم پر اپنی نعمت
تمام کردی اور تمہارے لئے اسلام کو دین کی حیثیت سے پسند فرمایا۔"

(مائدہ: ۳)

میں کیا گیا ہے اس کا مفہوم تب واضح ہوگا جب یہ سمجھ میں آئے کہ کافر کس چیز سے مایوس ہوئے؟ کیسے مایوس ہوئے؟

حجۃ الوداع کے دن جب غلبہ دین حق مسلّم ہوگیا تو کافر اس بات سے مایوس ہوگئے کہ اسلام مغلوب ہوسکے گا اور کافر غالب آسکیں گے۔ ان کی مایوسی کی وجہ یہ ہے کہ ولوکرہ المشرکون کا چیلنج پورا ہوگیا اور قرآن مجید کی جس مخصوص رہنمائی میں ولوکرہ المشرکون کے چیلنج کے پورا ہونے کی ضمانت تھی۔ اسے مشرف فرمانا تکمیل دین ہے۔ اگر ہمیں یہ شعور ہو کہ کافروں کو ناپسند کرنے کے باوجود دین حق کا غلبہ کس ہدایت کا نتیجہ ہے تو کافروں کی مایوسی کے اعتبار سے حجۃ الوداع کے دن کی

طرح ہر یوم "الیوم" ہوگا اور دور مابعد رسالت میں بھی زوال کو عروج میں اور دین کی مغلوبیت کو غلبے میں بدلنے کی ضمانت ہوگی۔

مؤثرات زندگی اوران کے بدل جانے کا اثر

مگر مراسم پرستی کے زاویہ نگاہ کے تابع قانون سازی کے لئے قرآن سے رہنمائی طلب کرنے والا ذہن نتیجہ خیزی کا مطالبہ اس لئے نہیں کرتا کہ وہ اوامر ونواہی کی خلاف ورزی کی صورت میں اپنے آپ کو زوال ہی کا سزاوار سمجھتا ہے۔ حالانکہ اوامر ونواہی کی خلاف ورزی مؤثرات زندگی کے بدل جانے کی صورت میں اس لئے ہوئی ہے کہ تاریخی انقلاب نے مؤثرات زندگی کی نوعیت بدل دی ہے۔

مؤثرات زندگی میں مذہب، اخلاق، علم، معاشرت، معیشت، سیاست وغیرہ داخل ہیں، تاریخی انقلاب نے مؤثرات زندگی کی نوعیت بدل دی۔ اقتدار چھن جانے سے مذہب، نظام حیات کی بجائے انفرادی نجی زندگی کا مسئلہ بن گیا اور زندگی کے تقاضے لادینی نظام سے پورے ہونے لگے۔ اخلاق مصلحت کوشی بن گیا۔ علم تمام تر حواس کے تابع متصور ہونے لگا اور صرف محسوسات کے حقیقت ہونے پر اصرار باقی رہ گیا۔ معاشرتی زندگی میں عمرانی وحدت کے شعور کی بنیاد کلمہ طیبہ کے بجائے جغرافیائی وفاداری اور وطن پرستی بن گئی۔ جس کے دائروں کا مفاد پرستی کی بنیاد پر تنگ سے تنگ تر ہوتے جانا خلاف توقع نہیں۔ معاشی انقلاب کی قیادت چھن جانے سے مخالف اسلام نظام معیشت کی پیروی لازم آگئی اور سیاسی اقتدار کا راستہ اس جمہوریت میں متصور ہونے لگا جو برطانوی استعمار کا ترکہ ہے اور ہوس اقتدار کی تسکین کا ذریعہ ہے اور اسلامی ماحول سے بالکل مختلف ماحول میں ملوکیت کے مقابلے میں عوام کے مطالبہ حقوق کے لئے جمہوریت کا نعرہ بلند کیا جاتا ہے۔ جس کا موقف یہ ہے کہ اقتدار عوام کا حق ہے۔

زندگی اور نصب العین کا تعلق

زندگی میں کوئی صحت مند تبدیلی نصب العین کے حوالے کے بغیر نہیں لائی جاسکتی اور نصب العین کے حصول کی جدوجہد بغیر یقین کے نہیں ہوسکتی اور ہر یقین کی ایک سنجیدہ اساس ضروری ہے۔ اس حد تک کہ جو شخص قمار خانے کے قیام سے اپنی معیشت پیدا کرنا چاہتا ہے۔ اس کے لئے بھی کامیابی کا یقین ضروری ہے۔ اس کے یقین کی اساس یہ ہوگی کہ جس معاشرے میں معیشت غیر یقینی ہو جائے۔ اس کے افراد میں جوا کھیلنے کا نفسیاتی میلان پیدا ہوگا مگر ہمیں یہ ضرورت محسوس نہیں ہوتی کہ قرآن مجید کے دعوؤں کی صحت کے یقین کی اساس تلاش کی جائے۔

فقہی قانون اور قانون حیات

ہمیں قرآن مجید سے قانون حیات کی جستجو کرنی چاہیئے کیونکہ وہ فقہی قانون جس سے قانون ساز مذہبی مؤثرات زندگی کے بدل جانے سے پہلے مسائل کامیابی سے حل کر رہا تھا۔ مؤثرات زندگی کے بدل جانے کے بعد مطلوبہ نتائج پیدا نہیں کر رہا کیونکہ اس قانون سے زندگی کے تقاضے پورے نہیں ہو رہے اور مذہبی ذہن کی توجہ قانون کے تقاضے پورے کرانے پر مرکوز ہے۔ مثلاً یہ کہ قانون جس کی اجازت دے اس پر عمل ہو جس کی اجازت نہ دے اس پر عمل نہ ہو جیسے سود خوری حرام ہے تو حرام ہی رہے اور زندگی کا تقاضا یہ ہے کہ تخلیقی جدوجہد میں جو تعطل ہے۔ وہ بہر طور رفع ہونا چاہیئے اگر اس کی ذمہ داری متعین نہ ہو اور پوری نہ کرائی جائے تو قانون کے تقاضے کبھی پورے نہیں ہوں گے۔

زندگی کے تین پہلو اور ان کے مسائل

زندگی کے تین پہلو ہیں، انفرادی اجتماعی اور بین الاقوامی۔ انفرادی پہلو بالفعل شعور (جبلی داعیات، طبعی خواہشات اور نفسانی تقاضوں) اور بالقوہ

شعورِ فجور و تقویٰ کے امتیاز، ربوبیت کے اقرار اپنے نفس کی بصیرت امانت کی ذمہ داری کے احساس، کے درمیان تضادات پر مشتمل ہے اور اجتماعی زندگی اطاعت و انحراف کے تضاد پر مشتمل ہے اور بین الاقوامی زندگی عداوت و عناد اور اس کے جوابی عمل یعنی جنگ در جنگ کا مظہر ہے۔ اندریں صورت انسانی زندگی جن مسائل سے دوچار ہے۔ وہ یہ ہیں:-

- انفرادی زندگی میں ضبط و انقیاد کیسے پیدا ہو؟
- اخلاقی کمال کیسے حاصل ہو؟
- انسانی ماحول ایک اخلاقی نظام میں کیسے تبدیل ہو؟
- اس کے شعور مذہبی میں مضمر اجابت و دعا کی تمنا کیسے پوری ہو؟
- اسے خدا سے ہم کلامی کیسے میسر آئے؟
- اسے اللہ تعالیٰ کی حضوری کے شعور میں دوام و استمرار کیسے نصیب ہو؟
- افراد کے درمیان کشمکش سے نجات کیسے ملے؟
- فرد معاشرے کی مضرت سے اور معاشرہ فرد کی آزار رسانی سے کیونکر محفوظ رہے؟
- قوموں کی عداوت، ریاستوں کے عناد اور تہذیبوں کی معاندانہ کشمکش کا تدارک کیسے کیا جاسکے؟

قرآن اور مسائل حیات

ان مسائل کو حل کرنے میں رہنمائی دینے کے لیے قرآن کا دعویٰ ہے کہ اس کا مبداوحی ہے قرآنی وحی نظامِ تکوین میں مضمر غایات تک پہنچانے کی ہدایت پر مشتمل ہے۔ پیغمبرانہ وحی کسی انسانی استعداد کا نام نہیں بلکہ وہب مجرد، بذل صرف اور فضل محض کی حیثیت رکھتی ہے۔

"اور اللہ نے تم پر کتاب و حکمت نازل فرمائی اور تمہیں وہ چیز سکھائی جو

تم نہیں جانتے تھے اور اللہ کا تم پر بڑا فضل ہے۔" (النساء: ۱۱۳)

قرآن مجید زندگی کے انفرادی پہلو کی اصلاح رضائے الٰہی کو نصب العین بناکر اسے حاصل کرنے کی جدوجہد سے کرتا ہے اور اجتماعی زندگی کی اصلاح ایک ایسے معاشرے کو نصب العین قرار دے کر اس کے حصول کی جدوجہد سے کرتا ہے جو نوع انسانی کی وحدت کے تصور پر مبنی ہو۔ اخلاقی جدوجہد کرنے والے اور روحانی الذہن افراد پر مشتمل ہو جن کی جدوجہد کا رخ یہ ہو کہ فرد اور معاشرہ ہر قسم کے خوف اور غم سے محفوظ رہیں اور بین الاقوامی زندگی کی اصلاح دین حق کو بین الاقوامی سطح پر غالب کرنے کی جدوجہد سے کرنا چاہتا ہے۔

قرآنی وحی سے صرف زندگی کی ہر سطح کے نصب العین کا تعین ہی نہیں ہوتا بلکہ ایسا لائحہ عمل بھی میسر آتا ہے جس سے نصب العین حاصل ہو کر رہے۔

مراسم پرستی کے نتائج

قرآن مجید کو مراسم پرستی کے زاویہ نگاہ کے تابع تصور کرکے اس کا مطالعہ کیا جائے تو جو نتائج مرتب ہوتے ہیں وہ یہ ہیں کہ:

عبادات جن کی حیثیت ذریعہ کی تھی۔ مقصود بالذات بن گئیں اور معنی اور مقصود کبھی حاصل نہیں ہو سکتا۔ جیسے دولت آسائش کے حاصل ہونے کا ذریعہ ہے۔ مگر جب دولت مقصود بالذات بن جائے۔ جیسے بخیل کی زندگی پر اثرات مرتب نہیں ہوتے تو مایوسی غالب آجاتی ہے اور ہر کامیابی آخرت پر ملتوی کردی جاتی ہے۔ قانون ساز مذہبی ذہن یہ نہیں چاہتا کہ جو قانونی نظام مؤثرات زندگی میں تبدیلی آنے سے پہلے وضع کیا گیا تھا۔ وہ مؤثراتِ زندگی کے بدل جانے کی صورت میں بے نتیجہ ہو جاتا ہے۔ اس لئے اس پر عمل نہیں ہو سکتا اور قانون پر عمل پیرا نہ رہنے کی بنا پر مذہبی ذہن اپنے آپ کو خطا کاری کی بنیاد پر زوال میں مبتلا رہنے کا سزاوار سمجھتا ہے۔

تمام وہ ماورائی حقائق جن کا یقین تجربی توثیق و شہادت سے حاصل ہونا چاہیئے انہیں دلائل سے ثابت کرنے کی احتیاج پیدا ہوتی ہے۔ حالانکہ دلائل یقین مہیا نہیں کر سکتے لہٰذا مذاہب کی حیثیت مردہ مابعدالطبعیات اور مردہ رسوم پر مشتمل مذہب کے بالمقابل جب جدید تحریکات سے متاثر نوجوان اپنی جدوجہد میں اس لئے کامیاب ہوتے ہیں کہ حصول مقصد کی راہ میں مزاحمت کی، مزاحمت ان کے عمل کو کائناتی قانون نشوونما سے سازگار بنا دیتی ہے اور مذہبی ذہن جس مسابقت سے دوچار ہوتا ہے۔ وہ کافرانہ یقین اور مذہبی بے یقینی کے درمیان واقع ہوتی ہے تو مذہبی ذہن رواداری کی خاطر انتہائی متضاد موقف سے سازگاری پیدا کرکے ایک طرف کائناتی قانون سے انحراف کی راہ اختیار کرکے ناکامی سے دوچار ہوتا ہے۔ دوسری طرف اپنے اسلام دشمن حریفوں کو باور کراتا ہے کہ اس کے پاس اپنے مسائل کا حل ہوتا تو اپنے مخالفین سے ہم آہنگی پیدا کرکے اپنے موقف سے منحرف نہ ہوتا۔ یہ ہے وہ نفسیاتی کیفیت جس میں مبتلا ہو کر مذہبی ذہن جن مسائل کو اسلام کے خلاف واقعتاً چیلنج سمجھتا ہے ان کا جواب دینے سے قاصر رہتا ہے۔

یقین اور ایمان یقین وجود کے ہونے کا یقین ہے۔ جس کے تین مدارج ہیں۔ علم الیقین جیسے دھوئیں سے آگ کے وجود کا یقین عین الیقین جیسے آگ کو دیکھ کر اس کے وجود کا یقین۔

حق الیقین جیسے آگ سے جل کر اس کے وجود کا یقین ایمان ایک ایسا ہے جو مصالح عملی پر مبنی ہے۔ اس کی دو حیثیتیں ہیں۔

ایمان بالغیب اور ماورائی حقائق پر ایمان۔ ایمان بالغیب ان نتائج پر ایمان ہے جو ابھی غیب میں ہیں۔ یہ ایمان جدوجہد سے پہلے درکار ہے۔ اس کے بغیر کسی نصب العین کے لئے سر دھڑ کی بازی نہیں لگائی جا سکتی۔ اس کی اساس

مہیا ہوا اس میں رسوخ پیدا ہوتا ہے ... لا تھنوا ولا تحزنوا انتم الاعلون ان کنتم مومنین میں اسی ایمان کا مطالبہ ہے۔ ایمان بالغیب حق کے غالب اور باطل کے مغلوب ہو کر رہنے پر ایمان ہے۔ غایت تخلیق، غایت بعثت اور غایت نزول وحی قرآنی کا ایک ہی غایت ہونا اور کائناتی قوانین جو نظام تکوین میں مضمر ہیں۔ ایمان بالغیب کی اساس ہیں۔

ماورائی حقائق اختیار، حیات بعد الموت کائنات کا اپنی ساخت میں انسان کی کامیابی سے سازگار ہونا اور وجود باری کا مجمع صفات کمال ہونا ماورائی حقائق ہیں۔ یہ ایمان کے مصداق ہیں علم کے نہیں۔ ان کا علم ممکن نہیں کیونکہ علم یقینی کے شرائط (مضمرات) کہ ایک طرف ناظر ہو دوسری طرف منظور ہو، ناظر میں علم کی استعداد ہو۔ اور منظور ایسا ہو جسے ناظر کی استعداد سے جانا جا سکے۔ ماورائی حقائق کا علم جس وجہ سے ناممکن ہے۔ وہ یہ ہے کہ علم کی جو استعداد (حواس اور عقل) ناظر میں پائی جاتی ہے۔ اس کے ذریعے ماورائی حقائق جانے نہیں جا سکتے۔ اگر ماورائی حقیقت جانی نہ جا سکے تو اس کے وجود کا انکار لازم نہیں آتا۔ جن لوگوں نے مابعد الطبعی حقیقت کے علم کے انکار کو اس کے وجود کا انکار سمجھ کر اس کے علم پر اصرار کیا ہے اور "جاننے" اور "ماننے" میں امتیاز ملحوظ نہیں رکھا انہوں نے جاننے کی آرزو میں یہ غور کرنا بھی ضروری نہیں سمجھا کہ "ماننے" کی اساس کیا ہوگی۔

ماورائی حقائق کا جاننا اس لئے ضروری ہے کہ "اختیار" کے بغیر نیکی اور بدی کی ذمہ داری تصور نہیں ہوتی۔ پسندیدہ اور ناپسندیدہ میں امتیاز بے معنی ہو کر رہ جاتا ہے۔ حالانکہ انسان ذمہ داری کے احساس اور پسندیدہ اور ناپسندیدہ کے امتیاز سے دستبردار ہونے کو تیار نہیں۔

حیات بعد الموت کا انکار اس لئے نہیں ہو سکتا کہ ظالموں اور غاصبوں کے

علاوہ کوئی شخص اس پر راضی نہیں ہوسکتا کہ نیکی بغیر اجر کے، بدی بغیر مکافات عمل کے اور ظلم بغیر دادرسی کے برباد ہو جائے۔

اگر کائنات کے اپنی ساخت میں انسان کی کامیابی سے سازگار ہونے کا انکار کیا جائے تو اختیار اور حیات بعد الموت کو تسلیم کر کے بھی انسان کی روحانی تمنائیں پوری نہیں ہوسکتیں۔ علم بالوحی سے شعور انسانی کے ان مطالبات کی توثیق ہوتی ہے۔

ایمان باللہ کا مفہوم ایمان باللہ کا مطلب یہ ہے کہ اس کائنات میں اللہ کی ایک ذات، اس کی ایک طاقت، اس کا ایک نظام، اور اس کا ایک قانون ہی مؤثر ہے۔ مگر جب تک حق و باطل کی کشمکش غلبۂ حق کی صورت میں انجام کو نہ پہنچے۔ نہ تو باطل کے وجود کا انکار ہو سکتا ہے نہ اس کے مؤثر ہونے کا۔ ایمان باللہ کی اساس یہ ہے کہ جبلی داعیات پر ایمان باللہ کے غالب آجانے سے تجربی توثیق میسر ہو اور طبعی خواہشات پر یہ تاریخی تجربہ غالب آجائے کہ کامیابی ضبط و انقیاد سے حاصل ہوتی تھی اور نفسیاتی تقاضوں پر شعور کا یہ تقاضا غالب آجائے کہ ہر کامیابی کیلئے اخلاقی فضائل ضروری ہیں۔

ماورائی حقائق کو علم کا موضوع بنانے کا اثر اگر ماورائی حقائق کو علم کا موضوع بنانے کی سعی کی جائے گی تو ان کا اثبات عملی زندگی پر اثر انداز نہ رہ سکے گا۔ کیونکہ علم کی آرزو میں نتائج سے توجہ ہٹ جائے گی اور قضیۂ ایمانیہ کے عملی مصالح پر مبنی ہونے کی بنیاد باقی نہ رہے گی۔

ماورائی حقائق کا اثبات انسان کے لاشعور میں موجود ہے۔ جس کی طرف اس آیت پاک میں اشارہ ہے۔ وفی انفسکم افلا تبصرون۔

فجور و تقوے کا امتیاز جو انسان کے شعور میں ودیعت کیا گیا ہے الھمھا فجورھا

ونقواھا۔ اور ربوبیت کا اقرار الست بربکم قالوا بلیٰ اور اپنے نفس کی بصیرت ھل الانسان علیٰ نفسہ بصیرا اور امانت کی ذمہ داری کا احساس انا عرضنا الامانۃ الخ ایسی استعدادیں ہیں، جن پر انسان کی بالقوہ فطرت مشتمل ہے۔ لیکن ان کی نشوونما نہ ہوسکے۔ اور یہ ایک زندہ طاقت میں تبدیل ہو کر انسان کی بالفعل فطرت یعنی جبلی داعیات، طبعی خواہشات اور نفسانی تقاضوں کو منضبط اور منقاد نہ بنا سکے، تو اس کا وجود و عدم برابر رہتا ہے اور انبیاء کی بعثت کا مقصود یہی رہا ہے کہ بالفعل فطرت کو منضبط و منقاد بنایا جائے۔

اگر حق و باطل کی کشمکش کے غلبۂ حق کی صورت میں انجام کو پہنچنے سے پہلے اعصاب تھک جائیں اور تناؤ (TENSION) کو برداشت کرنے کی طاقت نہ رہے تو اس موقف میں پناہ لینا ضروری ہوجاتا ہے کہ "سب یار کا جلوہ ہے۔ کعبہ ہو کہ بت خانہ"، حالانکہ ایمان باللہ کی اساس کی جستجو کی جاتی تو حق و باطل میں سازگاری کی ضرورت نہیں رہتی۔

کائناتی قوانین

اگر ہم نے قرآنی وحی سے فقہی قانون سازی کے ساتھ ان کائناتی قوانین کی جستجو بھی کی ہوتی جن سے سازگار ہوئے بغیر کوئی نظام قانون مؤثر نہیں ہوسکتا تو قرآنی وحی میں کامیابی کی ضمانت کا اعتماد ہرگز مضمحل نہ ہوتا۔ وہ کائناتی قوانین جن کی ترجمانی اور خاصیت اور وظیفہ قرآن ہی سے معلوم ہونا چاہیئے تھا، یہ ہیں:۔

(۱) کائناتی قانون نشوونما جس کی نشاندہی اس آیت میں کی گئی ہے۔ جعلنا لکل نبی عدواً من المجرمین۔ یہ قانون مزاحمت اور مزاحمت کا قانون ہے۔ اس کا وظیفہ مقصد کے قریب تر کرتے جانا ہے۔

(۲) تاریخی قانون نے تضاد جس کی تشکیل یہ ہے کہ دو گروہ ہوں۔

حزب اللہ	حزب الشیطان	اصحاب یمین	اصحاب شمال
اہل الجنہ	اہل النار	اصحاب میمنہ	اصحاب مشئمہ
اصحاب حق	اصحاب باطل	خیر البریہ	شر البریہ

ان کی دو وفاداریاں ہوں :۔

ایمان اور کفر   اور   حق اور باطل کی ۔

ان کے دو اجتماعی منظم ارادے ہوں :۔

حق کی حمایت میں   اور   باطل کی حمایت میں ۔

ان دو منظم اجتماعی ارادوں کے درمیان تصادم ہو یعنی جماعت اسلام اور جماعت کفر کے درمیان ان کے پروگرام ہوں ۔

ایک نفع بخشی، فیض رسانی اور نشوونما دینے کا۔ دوسرا مفاد پرستی کی بنا پر نفع بخشی کو روکنے کا ۔ اس قانون کا وظیفہ احقاق حق اور ابطال باطل کے نتائج متعین کرنا ہے ۔ یہی قانون ایسے ماورائی قانون سعادت وشقاوت پر عمل کرنے کا محرک ہے جس کو کوئی شیطانی طاقت اور کوئی مفاد پرست جماعت کبھی شکست نہ دے سکتی ہو جس کی تشکیل یہ ہے :۔

"یقیناً وہ فلاح پاگیا جو حرص و لالچ سے پاک ہوا کیونکہ وہی نشوونما پاکر کامیاب ہوگا۔"

(یقیناً وہ تباہ ہوگیا جس نے اپنے نفس کو حرص اور لالچ میں مبتلا رکھا)

حرص اور لالچ میں مبتلا رہنے کا لازمی نتیجہ مزعومہ مفاد کی خاطر نشوونما فیض رسانی اور نفع بخشی کو روکنا ہے ۔ ان قوانین کی خاصیت ان الفاظ میں بیان ہوئی ہے :۔

"اور تم اللہ کی سنت میں کوئی تبدیلی نہ پاؤ گے"

"اور تم کبھی نہ دیکھو گے کہ اللہ کی سنت کو اس کے مقررہ راستے سے کوئی طاقت پھیر سکتی ہے۔"

اقتدار کیوں عطا کیا جاتا ہے اور کیوں واپس لیا جاتا ہے؟

"اور وہی ہے جس نے تمہیں زمین میں ایک دوسرے کا جانشین بنایا اور ایک کے درجے دوسرے پر بلند کئے تاکہ جو کچھ اس نے تمہیں بخشا ہے اس میں تم کو آزمائے۔ بے شک تیرا رب جلد پاداشِ عمل دینے والا بھی ہے اور وہ بخشنے والا۔ اور مہربان بھی ہے۔" (انعام آیت ۱۶۵)

"دیکھو! تم لوگوں کو دعوت دی جارہی ہے کہ اللہ کی راہ میں مال خرچ کرو۔ اس پر تم میں سے کچھ لوگ ہیں جو بخل کر رہے ہیں۔ حالانکہ جو بخل کرتا ہے وہ درحقیقت اپنے آپ ہی سے بخل کر رہا ہے۔ اللہ تو غنی ہے۔ تم ہی اس کے محتاج ہو۔ اگر تم منہ موڑو گے تو اللہ تمہاری جگہ کسی اور قوم کو لے آئیگا۔ اور وہ تم جیسے نہ ہوں گے۔"

نہ ماننے والے کامیاب کیوں، اور ماننے والوں کی ناکامی کیوں

اگر تاریخی کشمکش میں پیغمبرانہ تعلیم سے انحراف والوں کے طرزِ عمل میں نادانستہ بھی نفع بخشی کا پہلو ہمارے طرزِ عمل سے زیادہ ہو تو ان کا طرزِ عمل مثبت ہے ساز گار ہونے کی بنا پر ان کے حق میں نتائج پیدا کرتا ہے۔ ہم اپنی ناکامی کی صحیح توجیہہ نہ کر سکنے کی بنا پر بے یقینی میں مبتلا ہوتے ہیں۔ اقوامِ عالم کی کسی قوم کا عروج و زوال ایسا نہیں جسکی توجیہہ ان کائناتی قوانین کے حوالے سے نہ کی جاسکتی ہو۔ اگر ہم اپنا

جائزہ اس اصول کے تحت لیں کہ قانون سازی سے زندگی کے تقاضوں کی تکمیل نہ ہو رہی ہو تو ضروری ہوگا کہ زندگی کے تقاضوں کی تکمیل کی راہ قرآنی وحی سے طلب کی جائے مگر اس کی احتیاج قانون ساز مذہبی ذہن نے ابھی تک محسوس نہیں کی۔

خلافتِ ارضی اگر ہم نے خلافت ارضی کو قبل از مرگ زندگی میں سیاسی اور معاشی نشوونما دینے کی نیابت سمجھا ہوتا اور احساسِ شکست خوردگی کے تحت اللہ تعالیٰ کی کامیابی کو بھی آخرت پر بھی ملتوی نہ کر دیا ہوتا تو ہم کبھی ان معترضانہ سوالات سے مضمحل ہوکر اسلام کی تصویر جبری کے باب میں مایوسی کا شکار نہ ہوتے۔

مگر ہوا یہ کہ ہم نے غور و فکر سے اس مایوسی کی بنا پر کنارہ کشی اختیار کر لی کہ جب کچھ ہو نہیں سکتا تو سوچنے سے کیا فائدہ !!

اسلامک ریسرچ کی ضرورت ہمارے ملک میں مستشرقین کی ذریت کی بدولت ریسرچ (RESEARCH) گرگئی اور اشراق فروشی میں تبدیل ہوکر رہ گئی اور اسلام دشمنی کی بنا پر اسلامک ریسرچ کے اہل وہ سمجھے گئے جن کے نزدیک ہمارے زوال کا سب سے بڑا سبب یہ ہے کہ ہم نے محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو معیارِ کمال سمجھا ہے۔

ریسرچ کی اصلی جگہ یونیورسٹی ہے۔ جس کا وظیفہ ہی یہ ہے کہ وہ نئے دریافت شدہ علم کی تفویض کرے۔ جو ادارہ یہ وظیفہ انجام نہ دے رہا ہو اس پر یونیورسٹی کا اطلاق لفظ یونیورسٹی کی توہین ہے مگر پاکستان کی کسی یونیورسٹی میں نہ تو پاکستان کی اسلام کی بنیاد پر بقا اور ترقی کیلئے جس ریسرچ کی ضرورت ہے وہ ہو رہی ہے اور نہ اس مقصد کیلئے ریسرچ ہو رہی ہے کہ وہ دینی علوم جو اس دور میں عقیم ہوگئے ہیں ان کی تلافی کیلئے قرآنی وحی کے عطا کردہ علم سے رہنمائی طلب کی جائے جس کے بغیر ہم اس بے یقینی سے نہیں نکل سکتے جس نے ہمیں فکر جدید کی دریوزہ گری میں مبتلا کیا ہے۔۔